شمارہ: ۱۸-۱۹

دینی، علمی، تحقیقی، تاریخی اور سوانحاتی مجلہ

سہ ماہی

احوال و آثار

اپریل تا ستمبر ۲۰۰۸ء

مرتب

نور الحسن راشد کاندھلوی

حضرت مفتی الٰہی بخش اکیڈمی

مولویان کاندھلہ، ضلع مظفر نگر (یو۔پی) انڈیا ۲۴۷۷۷۵، فون۔ ۲۲۲۹۱۳-۰۱۳۹۲

مجلّہ

احوال و آثار

کاندھلہ

سلسلۂ جدید — جلد نمبر: ۱

شمارہ نمبر: ۱۸-۱۹

ربیع الثانی تا رمضان المبارک ۱۴۲۹ھ

اپریل، تا ستمبر ۲۰۰۸ء

مرتب

نورالحسن راشد کاندھلوی

زرِ تعاون

ہندوستان میں	فی شمارہ	سالانہ
افراد سے	پینتیس روپے	ایک سو تیس روپے
لائبریریوں سے	پینتالیس روپے	ایک سو اسی روپے
بیرونی ممالک کے لئے	سادہ ڈاک سے	تیس امریکی ڈالر

دفتر سہ ماہی احوال و آثار

حضرت مفتی الٰہی بخش اکیڈمی

مولویان کاندھلہ، ضلع مظفرنگر (یوپی) انڈیا ۲۴۷۷۷۵

QUARTERLY AHWAL-O-AASAR

Mufti Ilahi Bakhsh Academy, Maulviyan, KANDHLA

Distt. Muzaffar Nagar (U.P) INDIA

Pin.247775 PH. 01392-222913 Mb.09358667219

کمپوزنگ سلیمانیہ کمپیوٹرس: (شہاب الدین بستوی) عیدگاہ کاندھلہ

فہرست مضامین

پاکستان میں ہماری مطبوعات اور سہ ماہی احوال وآثار ملنے کا پتہ

جناب سجاد الٰہی صاحب

A/27 مال گودام روڈ۔ لوہا بازار۔ بادامی باغ۔ لاہور

M.0300-4682752

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اداریہ

نقار خانے میں اک صدا اور
مدرسوں کا قدیم نصاب تعلیم بے اثر کیوں؟
چند معروضات

نورالحسن راشد کاندھلوی

پچھلی دو تین دہائیوں سے، برصغیر ہند کے دینی اسلامی مدرسوں کے پرانے نصاب تعلیم میں اصلاح وترمیم کرنے، اس نظام تعلیم کو از سر نو مفید و با مقاصد بنانے اور اس کے ذریعہ سے سلف کے منہج ومزاج اور ان کی سی عمدہ صلاحیتوں، اعلیٰ دماغ اور اعلیٰ فکر اور خاص صلاحیتوں والے، تازہ فکر و بصیرت سے پر، اصحاب تیار کرنے اور ان کے ذریعہ سے علم و عمل کی اس کشتی کو، جو برسوں سے برابر منجدھار میں ہے، ہچکولے کھارہی ہے اور بار بار اس کے ڈوبنے ڈوبنے کا شور مچتا ہے، اس ابتلاء سے بچانے کے لئے، تحریر و تصنیف کی طویل قطار اور سیمیناروں کانفرنسوں کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ جاری ہے، اس موضوع پر شائع ہونے والی ہر اک نئی کتاب کے متعلق یہ تأثر ظاہر کیا جاتا ہے کہ، یہ اس موضوع کا ایک سنگ میل، تاریخی عہد ساز اقبال کے لفظوں میں:...... جہانے را دگرگوں کرد یک، مرد خدا گاہے کی عملی تفسیر ثابت ہوگی، مگر کچھ دنوں کے بعد یہ نئی تحریر و تصنیف بھی، کتابوں کی بھیڑ میں اسی طرح گم ہو جاتی ہے، جیسے بہتے دریا میں کنکر پھینکنے سے، ایک بلبلہ سا نمودار ہوتا ہے مگر چند لمحوں میں ہی، اس کے نشانات معدوم ہو جاتے ہیں، اسی طرح یہ کتاب بلکہ کتابیں بھی، نہ کوئی فکر بنا پاتی ہیں، نہ ان کے ذریعہ سے مدرسوں کے نصاب و معمول میں کوئی ترمیم و بہتری آتی ہے، نہ ہی ان کے دامن میں ایسے چشم کشا اوراق ہوتے ہیں کہ جن کا ہر اک ورق یا کم سے کم چند اوراق کاروانِ علم کی ایک نئی جہت اور نئی تصویر ثابت ہوں۔

اس کمزوری اور ہر کتاب، کانفرنس اور سیمیناروں کے بے اثر و غیر مفید ثابت ہونے کی، ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ نصاب تعلیم کوئی فلسفہ یا مابعد الطبعیات کے مسائل نہیں ہیں، کہ ان کے لئے عملی نتیجہ اور اثرات کی ضرورت نہ ہو۔ مدرسہ، تعلیم و تربیت اور نصاب تعلیم، خالصاً ایک عملی اور سو فیصد عملی چیز ہے، جس کے لئے ظاہری وجود، عملی ثبوت اور عالم اسباب میں اس کی عمدہ نمود ضروری ہے۔ جب تک کہ ان میں سے کسی ایک طریقہ کو، ذاتی یا اجتماعی طور پر، منتخب کر کے اپنی نگرانی و سرپرستی میں، کسی درسگاہ میں اس کے تمام پہلوؤں کے جائزہ و احاطہ اور ہر اک درجہ پر، اس کے اثرات اور کمزور گوشوں، رخنوں پر گہری نظر کے ساتھ، ان کی اصلاح اور ازالہ کی مؤثر تدبیریں نہیں کی جاتیں، اس وقت تک اس نصاب اور ترمیمات سے نہ کوئی فائدہ ہو سکتا ہے، نہ اس کا تذکرہ مفید ہے۔ فائدہ بھی ایسا مؤثر طاقتور اور دراز ہو کہ دور تک اس کے اثرات و ثمرات محسوس کئے جائیں، اور یہ نتائج و اثرات کم سے کم دس پندرہ سال تک، ان تھک متواتر تحریک، مسلسل جدوجہد اور صبر آزما استقلال کے بعد ہی محسوس کئے جا سکتے ہیں۔ مگر ہمارے یہاں کا تا اور لے دوڑی کا مزاج عام ہے کہ ابھی پودا لگایا ہے مگر تمنا یہ ہے کہ وہ ابھی پہلی بارش کے بعد پہلی فصل میں پوری پیداوار دینے لگے، اور اس سے پورا معاشی فائدہ اٹھایا جا سکے۔ چوں کہ یہ طریقہ اور خیال اصول فطرت کے خلاف ہے، اس لئے اس سے نفع کی امید بھی صحیح نہیں۔

نصاب تعلیم کے حوالہ سے، پہلی بات تو ان تجویزوں اور مشوروں کی فراوانی ہے، جس میں ترمیمات اور نئی نئی کتابیں شامل کرنے کی بات کی گئی ہے، ایسی کتابوں کی بجائے خود ایک لمبی فہرست بن گئی ہے، اس طرح یہ معاملہ: شد پریشاں خواب من از کثرت تعبیرہا، کی ایک تازہ مثال بن گیا ہے۔

ان تجاویز و ترامیم میں پہلی بنیادی کمزوری تو یہ ہے کہ، ان میں سے ہر اک تصنیف تحریر، تجویز اور کانفرنس میں بات اس طرح شروع کی جاتی ہے جیسے یہ گفتگو یہ بحث پہلی بار اٹھائی جا رہی ہے، اس سے پہلے جو کچھ لکھا یا کہا گیا تھا، ان تحریرات و مقالات میں ان سے بہت کم فائدہ اٹھایا جاتا ہے، ہر مرتبہ نئے سرے سے بات شروع ہوتی ہے، اور چند نئی تجویزوں مشوروں پر آ کر ختم ہو جاتی ہے۔ اب تک جو تجویزیں اور مشورے ہو چکے ہیں، ان سے بہت کم فائدہ اٹھایا جاتا ہے، ضرورت ہے کہ ان سب کو سامنے رکھ کر ان کا خلاصہ اور حاصل تیار کیا جائے، اور یہ خلاصہ اور حاصل بھی کاغذ تک محدود نہ رہ کر، فوراً عملی صورت میں لایا جائے مگر اس کے نتائج اثرات اس وقت تک سامنے نہیں آ سکتے، جب تک طلباء کی کم سے کم دو جماعتیں (Batch) اس نصاب کے مطابق تعلیم مکمل کر کے فارغ نہیں ہو جاتیں۔ اس کے بعد ہی اندازہ ہو سکے گا کہ ان تجویزوں اور تحریروں میں کس قدر وزن اور گہرائی ہے اور عملی تجرباتی کسوٹی پر ان کا رنگ کس قدر پختہ ہے۔

لیکن ہمارے یہاں نفسانفسی کا جو عالم ہے، اس میں امید نہیں کہ ایسے لمبے اور موہوم تجربہ کے لئے کوئی باصلاحیت عالم اپنی قوت اور دس پندرہ سال کا لمبا وقت خرچ کے لئے تیار ہوں، اگر تیار بھی ہو جائیں تو اس میں سب سے بڑی مشکل اور رکاوٹ جو پیش آتی ہے، وہ ایسے طالب علموں کے بڑے مرکزی مدرسوں میں داخلہ کی ہے، جو ہمارے بڑے مدرسوں میں، ہر جماعت، خصوصاً اعلیٰ درجات میں نئے طالب علم کو داخلہ کے وقت پیش آتی ہے۔ ہمارے اہل مدارس طالب علموں کی صلاحیت اور اعلیٰ کتابوں کی قرأت و تفہیم میں، ان کی لیاقت کو اصل نہیں سمجھتے، بلکہ کچھ اور کتابوں کو دوسری کتابوں کی تعلیم اور داخلہ کے لئے ضروری سمجھا جاتا ہے، اس لئے ان بڑے مدرسوں صرف ان ہی طلبا کا داخلہ ممکن ہے، جو فلاں فلاں کتاب پڑھ کر آئے ہوں۔ استعداد سے عموماً غرض ہی نہیں ہوتی، حالاں کہ اس کا بار بار مشاہدہ اور تجربہ ہوا ہے کہ وہ طالب علم جس نے ابتدائی اور اوسط مدرسوں میں، معمول و مروج نظام کے مطابق تعلیم حاصل نہیں کی، بلکہ کسی عالم سے یا نئے مدرسہ میں ان عالم یا مدرسہ کی نئی ترتیب و مزاج کے مطابق پڑھا ہے، ان کی علمی لیاقت اور قوت تفہیم پرانے مدرسوں کے اکثر طلباء سے بہتر ہوتی ہے، مگر اس تعلیم و لیاقت کے باوجود، جب کسی خاص کتاب کی وجہ سے ان کو بڑے ممتاز مدرسوں میں داخلہ نہیں ملتا، تو ان کی ہمت ٹوٹ جاتی ہے اور علمی امنگ سرد پڑ جاتی ہے۔

اگر ہمارے بڑے مدرسوں میں کتابوں یا کسی خاص نصاب تعلیم اور کتابوں کی پابندی کی جگہ، اعلیٰ کتابوں کے سمجھنے اور مطالب کے حل کرنے کو بنیاد بنالیا جائے، یا ہر اک بڑے مدرسہ میں ایسے طلبہ کے لئے کچھ نشستیں خاص (Reserve) کردی جائیں کہ جن کی تعلیم کسی عالم کے ذاتی کوشش سے، یا کسی اور سلسلہ تعلیم سے ہوئی ہے، تو امید ہے کہ ان شاء اللہ بہتر صلاحیتوں کے افراد کی تعلیم میں بہتر اضافہ جلد ہی محسوس کیا جائے گا، لیکن جب تک یہ پابندی برقرار رہے گی، اس وقت تک کسی نئے نصاب کا بنانا پڑھانا اور اس کا پنپ جانا، آسان معلوم نہیں ہوتا۔ کیوں کہ کسی بھی فاضل عالم کے لئے، بلکہ مالی وسائل سے بھرپور لوگوں کے لئے بھی، نہ تو یہ ممکن ہے کہ وہ بیک وقت، پہلی جماعت سے اعلیٰ درجوں تک کی، تمام جماعتوں کے لئے باصلاحیت، خاطر خواہ طالب علم تلاش کرلیں اور ان سب کو بیک وقت ایک نہج پر آراستہ کر کے، اپنے نظام کو چلا سکیں۔ تعلیمی نظام کا سلسلہ پرانا ہو یا نیا، اس کو ہمیشہ درجہ بہ درجہ قدم بہ قدم چلانا ہی مفید اور نتائج خیز ہوتا ہے، اور عموماً وہی طالب علم، جو اول دن سے کسی ایک اچھے مدرسہ میں، یا اچھے معلم سے تعلیم پا رہے ہوں، آگے چل کر، ذی استعداد اور مفید ثابت ہوتے ہیں۔

(۲) ایک اور نہایت اور اہم بنیادی بات جو تمام پرانے مدرسوں کے طلبہ کے لئے نہایت نقصان دینے والی ہے، اور اب ندوہ کے نصاب تعلیم پر مبنی مدارس کے طلبہ اور ان کی صلاحیتوں کو بھی برباد کررہی ہے۔ درسی کتابوں کے اردو ترجمے، ان کی شروحات کی کثرت اور ان کا سب مدرسین اور طلبہ کے ہاتھوں میں ہونا ہے، جس میں سے زیادہ تر ترجمے اور شرحیں، نہایت ناقص گمراہ کرنے والی، مترجمین ومؤلفین کے فقدان علمی، خصوصاً اس موضوع اور کتاب سے ناواقفیت کی سند ہوتی ہیں، جن کا وہ ترجمہ فرمارہے ہیں۔ بے چارے ناواقف اور علم کے جویا طلبہ جب ان کتابوں کو سامنے رکھ کر اپنے تعلیمی سفر کو آگے بڑھاتے ہیں، تو ان کے ہاتھ کچھ نہیں آتا، ان کو دیر میں اس کا احساس ہوتا ہے کہ جس کو وہ چشمہ حیات سمجھ رہے تھے، وہ تو صرف ایک سراب اور فریب تھا۔ مزید افسوس اور بدنصیبی یہ ہے کہ شرحیں اور ترجمے وہ حضرات لکھ اور کررہے ہیں، جو خود اس نصاب تعلیم کے ترجمان اور محافظ سمجھے جاتے ہیں، حالاں کہ یہ بات بہت صاف اور واضح ہے کہ جب تک بازاروں سے درسیات کے ان ترجموں اور شروحات کا چلن ختم نہیں ہوگا، اور شرح کے نام پر اردو میں غلط سلط کتابوں کا چھپنا بند نہیں ہوگا، اس وقت تک یہ امید کرنا کہ مدرسوں میں ان ترجموں وغیرہ کو، پڑھنے والے طلبہ میں کوئی لیاقت واستعداد پیدا ہوگی، اور وہ اچھے عالم یا مدرس بنیں گے، دیوانے کے خواب سے زیادہ نہیں، جس کی تعبیر کی تلاش بھی حماقت ہی ہے۔

ہونا یہ چاہئے کہ اس استاد کو جو کسی کتاب خصوصاً متوسطات تک کی درسیات پڑھانے کے لئے، ان کے اردو ترجمہ یا شرح کی مدد لیتا ہے، اس کو کم سے کم اس درجہ اور کتاب کے لائق نہ سمجھا جائے۔ بہتر تو یہ ہے کہ ان کو مدرسہ میں مدرس کے طور پر جگہ ہی نہ دی جائے، جب تک یہ نہیں ہوگا، باصلاحیت طلبہ اور اس سے بڑھ کر مدرسوں کے لئے ذی استعداد استادوں کی جستجو ناکام ہی رہے گی۔

(۳) ابتدائی درجوں کے مدرسین خوب جانچ تول کر رکھے جائیں، ایسے جو کتابوں کے مطالب حل کرنے سے بڑھ کر، ان کتابوں [درسیات] کے تمام مندرجات پر، اس طرح حاوی ہوں کہ اگر ضرورت ہو تو قدیم علماء اور پرانے جیّد استادوں کی طرح، اپنے شاگردوں کو وہ کتاب اس طرح پڑھادیں، کہ طلبہ کو محسوس نہ ہو اور متعلقہ کتاب سے بڑھ کر، وہ فن ان کے ذہن میں اتر جائے۔ لیکن مشاہدہ اور تجربہ یہ ہے کہ فن تو دور کی بات ہے، ہمارے اکثر مدرسین ان کتابوں کے باربار پڑھانے والوں کو بھی پتہ نہیں چلتا، کہ میں نے بچوں یا طلبہ کو یہ کتاب کیوں پڑھائی ہے، طلبہ نے اس سے کیا اخذ کیا، اور مجھے کیا فائدہ پہنچا۔ ابتدائی کتابیں بلاشبہ آخر تک کی تعلیم

وصلاحیت کی بنیاد ہوتی ہیں، جب یہی کتابیں ناقص اور کمزور بلکہ بے فائدہ رہیں تو یقیناً

تا ثریا می رود دیوار کج

کے علاوہ اور کیا سامنے آئے گا۔

لہٰذا جن صاحبان کو ابتدائی کتابوں پر پوری دسترس نہ ہو، بچوں کو ان کے حوالہ کرنا، سراسر زیادتی بلکہ ان کی پوری زندگی اور دینی تعلیم دونوں کے ساتھ ظلم عظیم ہے۔ اگر اسی ایک کمزوری پر قابو پالیا جائے، تو امید ہے کہ دینی تعلیم پر اٹھائے جانے والے بہت سے سوالات کا واضح جواب ملنے میں دیر نہ ہوگی۔

(۴) ہمارے مدرسوں میں خاص طرح کی اندرونی بندشیں اور بے عملی بھی تعلیم پر اثر انداز ہوتی ہے۔ اسی کا ایک اثر یہ ہے کہ وہ نوجوان اور ذی صلاحیت مدرسین بھی، جو بڑے جذبوں اور ولولوں سے مدرسوں میں پہنچتے ہیں، اول اول، درسیات کے گہرے جائزہ، ان کی تصحیح و تدوین جدید کے علاوہ، اعلیٰ عربی شروحات کو سامنے رکھ کر درس کی تیاری کے اہتمام، اور نایافت کی جستجو کے ساتھ سرگرم عمل ہوتے ہیں، لیکن حالات جلد ہی ان سے اشارہ کر دیتے ہیں کہ اس محنت اور کنج و کاوش کی ذرا بھی ضرورت نہیں، نہ اہل مدرسہ اس کے خواہاں، نہ طلبہ سے اس کا مطالبہ، اور نہ ہی اس محنت و دماغ سوزی کی کچھ قدر۔ جب یہ تجربہ سامنے آتا ہے (اور اکثر مدرسوں میں عموماً یہی ہوتا ہے) تو اس مدرس اور تازہ وارد عالم او راستاد کا، حوصلہ ٹوٹ جاتا ہے اور پھر اس کی اس کتاب سے بس اسی طرح کی انسیت اور وابستگی رہ جاتی ہے جیسے اور مدرسین کی، کہ اگر اپنی کتاب پڑھانے کے لئے اردو کی شرحیں نہ دیکھیں، تو کسی پرانے بڑے عالم کی درسی تقریر سامنے رکھ ررٹ لی، اسی کی بنیاد پر اس کتاب کے درس کی تکمیل ہو جاتی ہے۔ چوں کہ اس درس و افادہ کی بنیاد اپنی محنت و صلاحیت کی جگہ، مانگے کے اجالے (یعنی دوسروں کی تقریروں پر) ہوتی ہے، اس لئے ایسے درس سے طلبہ کی استعداد میں عموماً اضافہ نہیں ہوتا، اور اس میں برکت بھی نہیں ہوتی۔

(۵) اہل مدارس کے یہاں اس پر بھی زیادہ غور و فکر نہیں کیا جاتا کہ نحو و صرف کی بنیادی اور سب سے پہلی کتابوں کو، فارسی میں پڑھانے کا اب کیا تک ہے، یہ اس وقت تک بالکل درست اور برمحل تھا، جب مدرسہ میں داخل ہونے والے نوعمر بچے، اردو میں خاصی دسترس حاصل کر کے اور فارسی کی شناخت حاصل کر کے آتے تھے، جس کی وجہ سے فارسی کی ابتدائی کتابیں پڑھنا، ان کے لئے کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ وہ بہت کم وقت میں ایسی لیاقت حاصل کر لیتے تھے، جس کی مدد سے وہ نحو و صرف کی درسیات کو پوری طرح حل کر لیں، مگر اب وہ بچے مدرسوں میں

آتے ہیں، جو اردو سے بھی نا آشنا ہوتے ہیں، مدرسہ میں شروع سے ان کے ہاتھوں میں فارسی کی کتابیں دیدی جاتی ہیں، جو ان کے لئے کریلا اور نیم چڑھا ثابت ہوتی ہیں، اس وجہ سے یہ نہایت ضروری ہے کہ اگر ان ہی قدیم کتابوں کی تعلیم، کسی وجہ سے ضروری خیال کیا جائے، تو صرف ان مباحث کو اردو میں پڑھائیں، کم سن طالب علموں پر، دہرا بوجھ نہ ہو جس کی وجہ سے وہ زبان کے ساتھ ساتھ اصول وقواعد سے بھی محروم رہ جائیں۔

(۶) مدرسوں کے نصاب تعلیم کے لئے ایک بہت بڑا سوال، فارسی کی تعلیم وتدریس کا بھی ہے۔ اس حقیقت سے کون انکار کرسکتا ہے، کہ برصغیر ہند کے اہم علمی سرمایہ کا جو نو سو سال کی محنتوں کا نتیجہ ہے، بڑا حصہ فارسی میں ہے، مگر نئی نسل کا فارسی سے کچھ رشتہ ہی نہیں، بلکہ اکثر فارسی کو ایک اہم دینی ملی زبان کی حیثیت سے جانتے ہی نہیں، اور اہل مدرسہ بھی فارسی سے آہستہ آہستہ بے تعلق ہوتے جارہے ہیں، اس کا اس کے علاوہ کیا نتیجہ ہوگا اس قابل فخر اور گراں بہا سرمایہ، اور غیر معمولی وسیع اسلامی کتب خانہ سے محروم ہوجائے گی، ہندی ملت اسلامیہ اور کیا اس سے اس طرح بے تعلق اور دست بردار ہوجانا دانشمندی ہے۔ ہرگز نہیں! اس لئے مدرسوں میں فارسی کے مختصر جامع، مؤثر نصاب کے لئے کوشش اور مدرسوں کی تعلیم میں اس کے لئے گنجائش نکالنا بے حد ضروری ہے۔ اس نصاب کو اس طرح مرتب اور نافذ کیا جائے کہ مدرسہ کے اور تعلیمی نظام پر اس کا زیادہ وہ اثر نہ ہو، مگر طلبہ میں فارسی کی ایسی لیاقت استعداد پیدا ہوجائے، کہ وہ اپنے شوق سے، ضرورت کے مطابق، اس کو جہاں تک چاہے آگے بڑھالیں۔ فارسی کا معاملہ یہ ہے کہ اس سے ذرا بھی واقفیت اور دلچسپی ہوجائے تو اس زبان کی شیرینی اور اس کا ادب، پڑھنے والوں کو خود اپنی جانب متوجہ کرلیتا ہے، اور اگر ہم نے فارسی سے غفلت برتی تو ہماری عربی کے بعد، سب سے قیمتی، سب سے بڑی اور ہزاروں خوبیوں والا ایک بہت بڑا اور غیر معمولی علمی سرمایہ ہمارے لئے اجنبی ہوجائے گا۔ جو ایسا غیر معمولی المیہ اور نقصان ہوگا جس کا الفاظ میں اظہار ممکن نہیں۔

(۷) اچھے استاد اور محنتی مدرسین نہ ملنے کی ایک بڑی وجہ مدرسوں میں اچھی تنخواہوں کا نہ ہونا بھی ہے۔ مدرسوں میں عمارتوں کا، ان کی فضول زیب وزینت اور بے مقصد توسیع کا: نہ ختم ہونے والا تسلسل جاری ہے، جب مدرسین کی تنخواہوں کے لئے کہا جاتا ہے، تو اس کے لئے کم سے کم بجٹ بنایا جاتا ہے اور ایثار وتوکل کا سبق پڑھانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ حالانکہ یہ حضرات اچھی جانتے ہیں:

کہ مزدور خوش دل کند کار بیش

لہٰذا جو رقم عمارتوں پر برباد کی جارہی ہے، اگر اس کا چوتھائی حصہ بھی مدرسین کی تنخواہ اور اچھے افراد کی تلاش پر لگادیا جائے، تو مدرسہ کو اپنی تشہیر وتعارف کی ضرورت نہ رہے۔ یہ مدرسین کرام اور ان کے شاگرد، اپنی اپنی جگہ پر مدرسہ کا چلتا پھرتا دائمی اشتہار ثابت ہوں گے، لیکن عمارت میں نام ونمود زیادہ اور نقد حاصل ہوتا ہے، اس لئے اچھے استادوں، اچھی تعلیم، اچھے طلبہ اور دین کی اچھی دیرپا خدمت میں ایسی دلچسپی نہیں ہے۔ اسی بے توجہی اور معمول تنخواہوں کی وجہ سے، باصلاحیت فاضل، عرب ملکوں سفارت خانوں وغیرہ میں ملازم ہوجاتے ہیں، یا یونیورسٹیوں سے مختلف کورس پورے کرکے، خوش حالی اور تلاش معاش کے ایسے راستوں پر نکل جاتے ہیں، جہاں عموماً دین اور تعلیم ودرس سے کچھ رابطہ نہیں رہتا، کیا اپنی اس بے توجہی کی وجہ سے مدارس ہی اس کے ذمہ دار نہیں ہیں۔ اگر تعمیری اخراجات اور غیر ضروری تکلفات کم کرکے، یہ رقم اچھے ابتدائی او رمتوسط استادوں کی تنخواہوں، ان کے لئے گھر کی سہولت، دوسرے انتظامات، اوران کے متعلقات پر خرچ کردی جائے تو مدرسہ کی علمی اندرونی تعمیر، ظاہری تعمیرات سے بہت زیادہ مفید دلاویز اور دیرپا ثابت ہوگی۔

اللہ کرے اگر ان معروضات پر توجہ کی جائے، کان دھرا جائے اوران کو صدا بصحرا ہونے سے محفوظ رکھا جائے، تو انشاءاللہ تعالیٰ قدیم نصاب کی ویسی ہی توانائی اور مردم سازی کی قوت عالم آشکارا ہوگی، جو کبھی تھی اور اب جس پر مسلسل جمود اور ناکارہ پن سے ناواقفیت، بے عملی اور بے اثری کی تہمت گویا چپک کررہ گئی ہے۔

شاید کہ اتر جائے تیرے دل میں میری بات



اس مرتبہ بھی احوال وآثار بہت دیر سے چھپ رہا ہے، کیا کیا جائے، مقدرات اپنی قاہری منگوا کر رہتے ہیں، بہرحال حاضر ہے۔ یہ اشاعت دو شماروں: **۱۸-۱۹** پر مشتمل ہے۔ جو اس کے نظام اشاعت کو ایک حد تک، معمول پر لانے کی کوشش کا ایک حصہ ہے، اس کے بعد کی اشاعت بھی اسی طرح دو شماروں **۲۰-۲۱** پر مشتمل ہوگی، آنے والے مشترکہ شمارہ میں، مرتب احوال وآثار کی ایک ناتمام تالیف:

"تقویۃ الایمان اوراس کے خلاف برپا شورش...... تاریخ وحقیقت کے آئینہ میں"

کی ایک قسط وار طویل اشاعت یکجا پیش کی جارہی ہے۔ امید ہے کہ آئندہ شمارہ کے لئے انتظار کی زیادہ زحمت نہ ہوگی، یہ شمارہ جلدی ہی قارئین کے ہاتھوں میں ہوگا۔

مثنوی مولانائے روم کا سب سے پہلا اردو منظوم ترجمہ
منبع فیض العلوم

[مؤلفہ تقریباً ۱۲۰۰ھ/۸۶-۱۷۸۵ء]

تالیف حضرت مفتی الٰہی بخش نشاط کاندھلویؒ

ابتدائی چند صفحات اور اشعار

از: نورالحسن راشد کاندھلوی

اردو زبان وادب کی تاریخ کا ایک المیہ یہ بھی ہے کہ اس میں اردو زبان وادب کے متعدد بڑے محسنین اور اہل علم وفضل کا تذکرہ، ان کی حیثیت کے مطابق آیا ہی نہیں۔ ہمارے مورخین واہل ادب نہ ان کی نثری خدمات سے واقف ہیں، نہ شعر و نظم میں قدرت اور اس کے بڑے ذخیرہ سے آشنا! ایسے ہی بڑے اہل قلم اور اہل ادب میں حضرت مفتی الٰہی بخش کا نام بھی شامل ہے، مفتی صاحب نے عربی فارسی کی تصانیف اور مقبول عام کتابوں کے اردو میں منظوم ترجمے کیے، ان کے مطالب کو اردو میں پیش کیا اور اردو نثر کی علمی روایت کو آگے بڑھایا، اس پہلو سے مفتی صاحب کا، خاندان حضرت شاہ ولی اللہ کے بڑے اور غیر معمولی خادمان زبان وادب کے ساتھ نام آنا چاہیے، یعنی شاہ عبدالقادر کے ترجمہ موضح قرآن اور حضرت شاہ محمد اسماعیل کی تقویۃ الایمان وغیرہ کے ساتھ، مگر تعجب بلکہ افسوس ہے کہ مفتی صاحب کی تصانیف اور کتابوں کا اردو کے مؤرخین تذکرہ ہی نہیں کرتے، حالاں کہ گارساں دتاسی اور مولوی کریم الدین کی تحریروں سے واضح ہے کہ حضرت مفتی صاحب کی متعدد تالیفات اور اردو رسائل و منظومات، اس وقت عام طور سے پڑھے جاتے تھے اور مقبول عام تھے۔ ایسی ہی اہم اور ممتاز لسانی علمی ادب خدمات و منظومات میں، مفتی صاحب کا مثنوی مولانائے روم کا اردو منظوم ترجمہ بھی شامل ہے، جو اردو میں مثنوی مولانا روم کا پہلا اردو ترجمہ بھی ہے۔

یہاں اسی ترجمہ مثنوی کے ابتدائی چند صفحات یا اشعار کا ترجمہ شائع کیا جارہا ہے، جس سے مثنوی مولانا روم کے مطالب سے استفادہ کے علاوہ، یہ بھی علم ہوگا کہ حضرت مفتی صاحب کو زبان و بیان اور مختلف مضامین ومطالب کی ادائیگی پر کیسی قدرت تھی، اس زمانہ میں جب اردو زبان نظم ونثر دونوں، ابھی اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا سیکھ رہی تھیں، ایسا عمدہ شاندار رواں دواں ترجمہ حضرت مترجم نے کیا ہے کہ بہت سے موقعوں پر یہ محسوس ہی

نہیں ہوتا کہ یہ اٹھارہویں صدی عیسوی کی زبان اور دوسوتیس سال پرانی اردو ہے۔ مترجم نے ترجمہ کی اور خصوصیات کے علاوہ اس ترجمہ میں مثنوی مولانا روم کا پورا آہنگ جذب کرلیا ہے اور اس منظوم ترجمہ کے ذریعہ سے مولانائے روم کے پیام اور معنویت کی تفہیم وترسیل کس عمدہ معیار و پیمانہ پر کی گئی ہے، پڑھتے وقت قاری کو اس کا بھی پر کیف اور نشاط انگیز احساس ہوتا ہے۔

اس ترجمہ کے ساتھ برابر کے صفحہ پر، اصل مثنوی کے وہ تمام اشعار بھی اصل کی ترتیب کے مطابق، شامل کیے جارہے ہیں، جن کا یہ منظوم ترجمہ ہے۔ جس سے اہل ذوق واہل نظر کو اصل وترجمانی کی یکسانیت اور ترجمہ کی خوبی اور معیار کا اندازہ کرنے میں خاص مدد ملے گی۔ انشاء اللہ تعالیٰ!

اسلامی فارسی ادبیات اور اس تصانیف کے ادبی ثقافتی ورثہ میں، جو تین چار کتابیں غیر معمولی مقام ومرتبہ رکھتی ہیں، ان میں مثنوی مولانا جلال الدین محمد رومی کا نام بھی شامل ہے جو دینی روحانی حلقوں میں مثنوی معنوی کے نام سے ایک بڑا نام اور درجۂ اختصاص رکھتی تھی۔ مثنوی کو ایران وافغانستان کے علاوہ برصغیر کی علمی دینی روحانی دنیا، اکثر مشائخ خانقاہوں، سلسلوں میں [جس میں نقشبندیہ اور سہروردیہ بھی شامل ہیں] غیر معمولی پذیرائی اور مرتبہ حاصل رہا ہے۔ بڑے مشائخ وعلماء کے علاوہ، جلیل القدر محدثین تک کے یہاں اس کا متواتر درس ہوتا تھا، اور برصغیر ہند کے اندازاً پچاس علماء، اہل معرفت اور ارباب بصیرت ونظر نے، اس پر بڑے مبسوط ومختصر حاشیے لکھے، شروحات تصنیف کیں، خلاصے اور منتخبات تیار کئے اور مثنوی کے متن کا اور نسخوں سے مقابلہ کر کے صحیح متن تیار کرنے کی کوشش کی اور اپنی خانقاہوں اور متوسلین میں اس کی روایت کا چلن اور اس کے پیام کی تعلیم عام فرمائی۔

قدیم علماء، مشائخ اور محدثین سے حضرت شاہ ولی اللہ اور ان کے خانوادہ گرامی تک، اور خاندان ولی اللہی سے حضرت حاجی امداداللہ تھانوی مہاجر مکی، حضرت مولانا محمد قاسم اور ان معاصرین مکرم تک، ان کے بعد امہات المدارس والدراسات الاسلامیہ، دارالعلوم دیوبند ومظاہر علوم سہارنپور نیز ان سے وابستہ مدارس اسلامیہ اور علمائے کرام میں بھی، اس کا بہت اہتمام رہا۔ اس کا درس ہوتا تھا اور اس کے پیام کے مطابق افراد تیار کرنے کی کوششیں کی جاتی تھیں، اور اس کے علاوہ بھی مثنوی کی نقل، تحسین، تزئین اور اس کو بہتر سے بہتر صورت میں دوسروں تک پہنچانے کے لئے بہت کچھ ہوا، اللہ کو منظور ہوا تو اس کی تفصیلات آئندہ کسی موقعہ پر پیش کی جائیں گی۔

بہرحال مثنوی کی ان وقیع خدمات میں سے۔ جن میں برصغیر ہند کا ایک بہت خاص اور منفرد حصہ ہے حضرت مفتی الٰہی بخش کو بطور خاص، دو بڑے امتیازات حاصل ہیں، اول اس کے چھٹے آخری دفتر کے ناتمام حصہ کی تکمیل ہے، جس میں مولانائے روم کے ناتمام واقعہ یا سبق کو اسی انداز میں مکمل کیا گیا ہے، یہ سعادت حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کی ہدایت اور سرپرستی میں، حضرت مفتی الٰہی بخش کاندھلوی کو نصیب ہوئی اور مفتی

صاحب کے بعد مثنوی کی روایت وسماعت اور درس کے اکثر سلسلے بھی، حضرت مفتی صاحب کی نسبت اور سلسلہ سے جڑے ہوئے ہیں۔

ہندوستان میں، مثنوی کے اردو نظم میں کئی مکمل اور نا تمام ترجمے ہوئے ہیں، ان میں سب سے پہلا اور مثنوی کی تاثیر، جاذبیت اور کشش کا سب سے بہتر نمائندہ وترجمان، رواں ترجمہ، حضرت مفتی الٰہی بخش اور ان کے فرزند گرامی مولانا ابوالحسن حسن کاندھلوی کی علمی یادگار ہے۔

اس ترجمہ کا حضرت مفتی صاحب نے اپنے دور جوانی کے اختتام پر، چالیس سال کی عمر کے بعد، وفات (۱۲۴۵ھ/ ۱۸۲۹ء) سے چالیس سال پہلے، بہ ظاہر ۱۲۰۰ھ میں آغاز کیا تھا، ایک ہزار شعروں کا ترجمہ ہوا تھا مگر مفتی صاحب کی بعد میں، بے پناہ مصروفیات کی وجہ سے یہ ترجمہ نا مکمل رہ گیا تھا، مفتی صاحب کو اس پر توجہ کرنے اور اس کو مکمل کرنے کا وقت نہیں ملا۔ حضرت مفتی صاحب کی وفات کے بعد، ان کے فرزند، مولانا ابوالحسن حسن کاندھلوی نے جو اپنے عظیم والد کے صحیح خلف الرشید اور حقیقی نمائندے تھے اور علمی صلاحیت، درس وافتاء، تحریر وتصنیف خصوصاً اصلاح وتربیت میں ممتاز ومعروف بھی، انہوں نے اپنے احباب کے اصرار پر اس ناکام ترجمہ مفتی صاحب کے انداز واسلوب میں پورا کرنے کا ارادہ کیا اور مثنوی مولانا فارسی کے دفتر اول یا جلد اول کا ترجمہ کر کے دفتر اول یا پہلی جلد کو مکمل کر دیا۔

مفتی صاحب کے اختتام مثنوی مولانا روم کی طرح، اس ترجمہ کو بھی بڑی شہرت ومقبولیت حاصل ہوئی، تالیف وتکمیل کے بعد ہی سے کثرت سے اہل علم وذوق نے، اس کی نقلیں لیں، اس کو پڑھا، پڑھایا، اور دوسروں تک پہنچایا۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ اس کی تالیف وترجمہ پر پونے دوسو سال گذرنے کے باوجود، اس ترجمہ کے بیس سے زائد قلمی نسخے، ہند پاکستان اور یورپ کے کتب خانوں میں موجود ہیں۔ اسی پذیرائی اور مقبولیت کی وجہ سے ناشرین کو اس کے چھاپنے کا خیال ہوا، یہ ترجمہ "منبع فیض العلوم" کے نام سے سب سے پہلے کلکتہ سے چھپا تھا، یہ اشاعت راقم کی نظر سے نہیں گذری، ایک اور طباعت مطبع ہاشمی میرٹھ کی ہے، جو ریاست بڈھانسی (ضلع بلند شہر یوپی) کے رئیس نواب عبدالصمد خاں کی فرمائش پر، مطبع ہاشمی میرٹھ سے چھپی تھی۔ اس پر سنہ طباعت درج نہیں، بہ ظاہر ۱۲۸۰ھ کی طباعت ہے۔ اس اشاعت کی حیثیت بھی اب ایک نادر نسخہ بلکہ تبرک کی ہے، تاہم اس طباعت کے نسخہ مصنف سے مقابلہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں نسخہ مصنف سے کئی موقعوں پر انحراف ہو گیا ہے، اس لئے پیش نظر صفحات میں اگر چہ مطبوعہ نسخہ سے بھی استفادہ ہوا ہے مگر تصحیح مصنف کے نسخے سے کی گئی ہے۔ ملاحظہ ہو۔

منبع فیض العلوم

ترجمہ اردو منظوم

مثنوی مولانائے روم

از خاتم مثنوی مولانا روم حضرت مفتی الٰہی بخش (نشاط) کاندھلویؒ

مؤلفہ تقریباً ۱۲۰۰ھ

ابیات الحاقیہ وتمہید افتتاح ابیات مثنوی معنوی

اے خدا اے قبلۂ جان وجہاں	ڈھونڈھنے تجھ کو بتا جاؤں کہاں
اے خدا مطلوب جانِ عاشقاں	نور چشمِ بے دلان وجان جاں
ہے مرا دل آتشِ غم سے کباب	یا بلا مجھ کو اُدھر، یا آشتاب
دل ہے گو آئینۂ آہن بنا	پر تری صورت گئی اس میں سما
واسطے اپنے گذر فرما اِدھر	جلوہ گر ہو آئینہ میں کر نظر
گو دل اپنا آہن تکلیس ہے	پر جمالِ یار مقناطیس ہے
ہو رگ گردن سے تم میرے قریب	وائے محرومی نہیں ملتا نصیب
دل میں بستے ہو یہ ہے مہجور چشم	ساحتِ قربت سے کیوں ہے دور چشم
ایک دن وہ تھا کہ جز شاہِ وجود	غیر کو ہرگز نہ تھی بود ونمود
غرق تھی بحر ہوّیت میں یہ جاں	حرف غیریّت نہیں تھا درمیان
خون کیا دل قید نے ہستی کی آہ	چھپ گیا کیوں کر بزیر ابر ماہ
قید ماومن سے جی بیتاب ہے	نالہ وزاری میں ہے مانند نے

سنیو نے سے کیا حکایت کرتی ہے		کیوں جدائی سے شکایت کرتی ہے
جب سے کی ہے کاٹ کر بن سے جدا		جس کے منھ لگتی ہے روتی ہے سدا
پارہ پارہ کر یہ سینہ اے فراق		تا کہوں بے خود ہو دردِ اشتیاق
جس کو ہووے شوق اپنی اصل کا		کیوں نہ ڈھونڈے وہ زمانہ وصل کا
اپنے اپنے بوجھ کے سب یار ہیں		کب یہ میرے واقفِ اسرار ہیں
مجھ کو ہر مجلس میں ہے رونے سے کام		گو میرا دمساز ہووے شاد کام
راز دل نالہ سے میرے دور نہیں		پر تیرے کانوں تئیں وہ نور نہیں
جان وتن میں گو نہیں ظاہر دوئی		دیکھ کب سکتا ہے پر جی کو کوئی
آگ ہے آواز نے کی، نے کہ باد		جس میں یہ آتش نہیں، ہے نامراد
عشق کی آتش ہے جو کچھ نے میں ہے		عشق کی جوشش ہے جتنی مے میں ہے
نے رفیق اس کی جو ہے سب سے جدا		اس کی پردوں نے دیئے پردے اٹھا
نا ہی کوئی زہر یا تریاق ہے		یار کی دمساز اور مشتاق ہے
نے کہے ہے راہ پر خوں سے سخن		قصۂ مجنوں وعشق کوہ کن
یہاں وہ ہے ہوشیار جو بے ہوش ہے		عاشق حسنِ زبان اک گوش ہے؟
جو نہ ہوتا نالۂ نے میں اثر		نے سے کب ہوتا یہ عالم پر شکر
غم میں اپنا روز عمر آخر ہوا		سوز، میں یہ روز عذر آخر ہوا
دن کے جانے سے مجھے کیا باک ہے		عشق ہے دل میں کہ سب سے پاک ہے

غیر ماہی ہووے اس دریا سے سیر		بے نصیبوں کی ہوئی روزی میں دیر
حال عاشق کب سمجھتی ہیں یہ خام		پس سخن کوتاہ کیجیے والسلام
بندِ دنیا سے نکل آزاد ہو		فکر سیم زریں مت برباد ہو
کوزہ میں گر ڈالئے دریا تمام		کب سمائے اس میں غیر از یک دو جام
کوزۂ چشم حریصاں پُر نہ ہو		سیپ جو قانع نہ ہو پُر دُر نہ ہو
عشق حق سے جو گریباں چاک ہے		حرص دنیا سے وہ بالکل پاک ہے
واہ واہ اے عشق خود سودا مرے		تو ہے درماں درد باطن کا مرے
ہے علاج نخوت وناموس تو		ہے مرا بقراط وجالینوس تو
جسم خاکی تجھ سے پہونچا تا سما		طور تیرے فیض سے رقصاں ہوا
عشق جان طور ہے اے عاشقاں		خرِّ موسیٰ عشق کا ہی ہے نشان
اپنے ہم دمساز سے ملتے اگر		مثل نے سب بھید کہتے سربسر
ہو جو اپنے ہم زبانوں سے جدا		بے نوا ہے گرچہ بولے سونوا
موسم گل زار وگلشن جب گیا		پھر کہے کس ساتھ بلبل ماجرا
راز ہے آواز میں میری نہاں		گر کروں ظاہر تو ہو برہم جہاں
جو کہ نے کہتی ہے ان ابواب سے		کہہ نہیں سکتا ہوں میں آداب سے
ہے عیاں معشوق وعاشق بے حجاب		جان ہے معشوق وہم، جسمِ خراب
جو نہ ہووے یار کو پروائے دل		مرغ بے پر ہی کرے کیا وائے دل

کس طرح سمجھوں میں اپنا پیش و پس		گر نہ ہووے نور اس کا ہم نفس
نور اس کا راست چپ اور تحت و فوق		گردن اور سر پر میری جوں تاج و طوق
عشق چاہے ہے یہ قصہ فاش ہو		آئینہ کیوں کر نہ ہووے راست گو
آئینہ دل کا تیری گویا نہیں		زنگ سے دنیا کے تا دھو یا نہیں
منہ سے آئینہ کے ہو کر زنک حک		نورِ مہر حق کرے اس میں چمک
جا کے زنکار اس کے منہ سے پاک کر		بعد ازاں اس نور کو ادراک کر

حکایت اک بادشاہ کی کہ کنیزک پر عاشق ہوا اور بہت مال دیکر اس کو خرید کیا

سنیو یارو دل سے تم یہ داستاں		ہے حقیقت میں یہ حال اپنا بیاں
نقد حال اپنی کے پے لے جائیے		باغ سے دارین کے پھل کھائیے
سنیو اس قصہ کو تم باگوش دل		چھوٹ جا، تا تم سے قید آب و گل
ہوش یک سو کر کے اور جی کو لگا		شوقِ دل سے، قصہ کر اس راہ کا
اس سے آگے، کہتے ہیں اک شاہ تھا		دین و دنیا اس کے سب ہمراہ تھا
ناگہاں اک دن ہوا وہ شہ سوار		فوج لے صحرا کو باعزم شکار
کوہ و صحرا میں پھرے تھا بہر صید		ہوگیا دام بلا میں آپ قید
اک کنیزک دیکھی اس نے راہ پر		ہوگیا سلطان نذر اس ماہ پر
نیم بسمل مرغ دل، پل میں ہوا		زر بہت دیکر خرید اس کو کیا

اس پری کو لے ہوا، جب بہرہ ور	ہوگئی بیمار وہ رشکِ قمر
اسپ تھا جب پاس اپنے زیں نہ تھا	زین ہم پہونچا تو گھوڑا مرگیا
کوزہ تھا جب تک نہ تھا پانی کہیں	پانی پر پہونچے تو اب کوزہ نہیں
جمع کر شہ نے اطبا کو کہا	جان کی میری، کرو جلدی دوا
جان میری بلکہ جانِ جاں ہے یہ	دردمند عشق ہوں، درماں ہے یہ
جیسے ہو درماں میری اس جان کا	ہے وہی مالک دُرُومر جان کا
در جواب اس کے اطبا نے کہا	ہم کریں گے فہم سے، اس کی دوا
عیسوی دم ہیں ہم، اس عالم میں آج	ہے ہمارے پاس ہر غم کا علاج
بس کہ غرّہ سے، نہ استثنا کیا	عجز اُن کا حق نے ظاہر کردیا
ترک استثنا سے غفلت ہے غرض	بے زبانی گفتگو جو ہے عرض
گو زباں سے تو نہ استثنا کہے	جی تو وابستہ بحکم حق رہے
آخرش کی سب طبیبوں نے دوا	پر فزونی میں وہ رنج دل رہا
شربت و معجون و مطبوخ اور دوا	کر چکی سب کچھ نہ بخشا فائدہ
ہوگئی بیمار وہ رشکِ قمر	اشک ریزاں چشم شہ چوں ابر تر
جب قضا آوے تو ہو ناداں طبیب	طبع میں تریاق ہو، سَم کے قریب
شربت لیموں سے ہو صفرا افزوں	روغن بادام سے خشک اندروں
قبض ہوجاوے ہلیلہ سے شکم	آب دے، مانند باد آتش کو دم
تھا غرض ضعف اور نہ تھی کچھ خواب و خور	رنگ رو زرد و جگر سوزش سے پر

عاجز ہونا حکیموں کا علاج سے اور رجوع کرنا بادشاہ کا طرف اللہ کے

شاہ نے عجزِ اطباء دیکھ کر	ہو کے مضطر سوئے مسجد کی گذر
بادل پر درد، آ محراب میں	اشک سے سجدہ کیا خوناب میں
بیخودی سے جبکہ آیا ہوش میں	حق سے یوں کہنے لگا اُس جوش میں
اے خدا دانندۂ حالِ نہاں	کمترین بخشش تیری دونوں جہاں
عجز میرا اور طبیبوں کا یہ حال	تجھ پہ ظاہر ہے خدائے ذوالجلال
اے تو حاجت کا مری پشت و پناہ	دوسرے اب پھر ہوا گم مجھ سے راہ
یوں کہا ہے تو نے، گو میں ہوں علیم	کر تو ظاہر حال اپنا، اے سقیم
جب کیا شہ نے بجان دلخروش	بحرِ بخشایش وہیں آیا بجوش
لے گئی رونے میں نینداس کے تئیں	خواب میں آیا نظر، ایک شاہِ دیں
دی بشارت شاہ نے اس شاہ کو	کل مسافر آوے گا اس راہ کو
رحمت حق ہے، اسے حاذق سمجھ	جو کہے اس بات میں صادق سمجھ
سحر سے کمتر نہیں اس کا علاج	جلد ہوجا گا بحال اس کا مزاج
خواب سے چونکا، گئی وہ بیہوشی	بندۂ غم تھا ہوا شاہِ خوشی
آخرش تا صد ہزاراں انتظار	وہ خزاں کی شب ہوئی صبح بہار
منتظر آنے کا اس کی، ہوکے شاہ	بام پر بیٹھا ہوا، دیکھے تھا راہ

ناگہاں دیکھا کہ ایک عالی جناب
ابر میں پوشیدہ تاباں آفتاب

دور سے آتا ہے مانندِ ہلال
نیست تھا ہستی نما، مثلِ خیال

ہے خیالوں کو ترے ہر دم فنا
ان خیالوں پر ہے دنیا کی بنا

صلح و جنگ اہل دنیا ہے خیال
فخر و ننگ ان کا، خیال پُر و بال

جس تخیل میں ہیں سرمست اولیا
ہے وہ عکس مہرِ انوار خدا

خواب میں دیکھے تھے جو، شہ نے نشان
تھے وہ سب روئے مسافر میں عیاں

نورِ حق ہے اولیاء میں آشکار
باادب رہ ان کے آگے، بندہ وار

وہ ولی آیا نظر جب دور سے
سر سے پاؤں تلک پُر، نور سے

شاہ نے گھر سے نکل کر یک دوگام
باادب جا کر کیا اس کو سلام

لائے اس مہمان کو استقبال کر
ہوگئے آپس میں چوں شیر و شکر

ایک پیاسا تھا یہ پہنچا اس کو آب
ایک تھا مستِ خمار اور یہ شراب

مل گئے آپس میں دونوں جیسے موج
فرد تھے ظاہر میں، پر باطن میں زوج

تھا وہی معشوق شہ کا، نے کنیز
پر اٹھی ہے، بات سے بات اے عزیز

اے تو ہی مولا مرا، اور میں غلام
بندہ آسا، تیری خدمت میں مدام

حق تعالیٰ توفیق عطا کرنے والے سے، توفیق کی درخواست اور ہر حال میں ادب کی رعایت کی تمنا اور بے ادبی کی خرابی اور نقصانات کا بیان

ہم کو توفیق ادب دے یا خدا
بے ادب محروم رحمت سے رہا

بے ادب حق میں نہیں، اپنے ہے سَمّ	اس کی شامت سے ہے، سب کو رنج وغم
ہوتا تھا نازل آسمان سے مائدا	نفع کو پہنچی تھی سب خلق خدا
قوم سے عیسیٰ کی آخر چند کس	بے ادب بولے کہاں سیر و عدس
بندہ اس دن سے ہوا خوانِ فلک	رہ گیا رنج زراعت اب تلک
کی جو موسیٰ نے شفاعت پیش حق	آسماں سے پھر ہوا نازل طبق
بھیج یارب پھیر، ہم پر مائدہ	کہہ کے پھر اس سے اٹھایا فائدہ
کرکے گستاخوں نے پھر ترکِ ادب	رکھ لیا اس سے ذخیرہ بھر شب
گرچہ سو منّت سے عیسیٰ نے کہا	ہے یہ رزق دائمی بے انتہاء
بدگمانی کرنی اور حرص کمال	خوان پر شاہوں کے ہے کفر اور وبال
حرص و گستاخی پہ پھر پہونچی گزند	ہوگیا دروازہ اُس رحمت کا بند
منّ وسلویٰ آسماں سے تھم رہا	بُہرہ یاب اس سے نہ پھر، کوئی ہوا
بخل کی شامت سے ہے قحط اور بلا	ہوزنا سے ملک میں پیدا وبا
درد وغم تجھ پر ہیں جتنے پے بہ پے	تیری گستاخی کی یہ تنبیہ ہے
یہاں جو ہے گستاخ سو رُو زرد ہے	رہزن مرداں، وہی نامرد ہے
کجروی سی ہے خسوفِ آفتاب	جرأتِ بیجا سے ہے، شیطان خراب
ہے ادب کے نور سے روشن فلک	پاک ہیں فیضِ ادب سے سب ملک
قصہ شاہ و ولی کیجیے تمام	انتہا رکھتا نہیں ہے یہ کلام

ملاقات کرنی بادشاہ کی اس عارف اللہ سے کہ خواب میں بشارت ہوئی تھی

شاہ مہماں تک گیا باصد طرب		مثل درویشاں ہوا حاجت طلب
بے تکلف ہمکنار اُس سے ہوا		دل میں اپنی دی اسے چوں عشق جا
دست بوسی کر بہ تعظیم تمام		شہ نے پوچھا قصہٗ راہ ومقام
کہتے سنتے لے چلا مسند کے پاس		بولا پایا گنج بعد از صبر ویاس
ہے نہالِ صبر اگرچہ تلخ تر		آخرش لاتا ہے وہ شیریں ثمر
یوں کہا شہ نے کہ اے نوراللہ		صبر مفتاح الفراج کا تو گواہ
ہے تیری صورت جواب ہر سوال		تجھ سے مشکل حل ہوں بے قیل وقال
جو میرے دل میں، سو تیری برزباں		ذات تیری دستگیرِ بیکساں
آفریں اے شاہ مقبولِ الٰہ		بن ترے روے زمین تنگ اور تباہ
تکیہ گاہ اہلِ دیں دنیا میں تو		تجھ سے روگرداں جو ہوے زرد رو

تصحیح ونقل از نسخہ مکتوبہ بدست مصنف ثانی، مولانا ابوالحسن حسن کاندھلوی

۱۲۵۲ھ

نیز مطبوعہ، طبع دوم، مطبع ہاشمی، میرٹھ

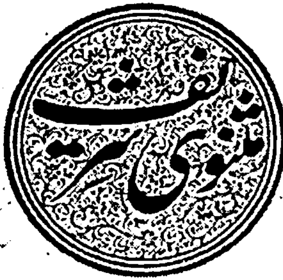
غالباً ۱۲۸۴ھ - ۱۸۶۷ء

ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ

به امداد الله



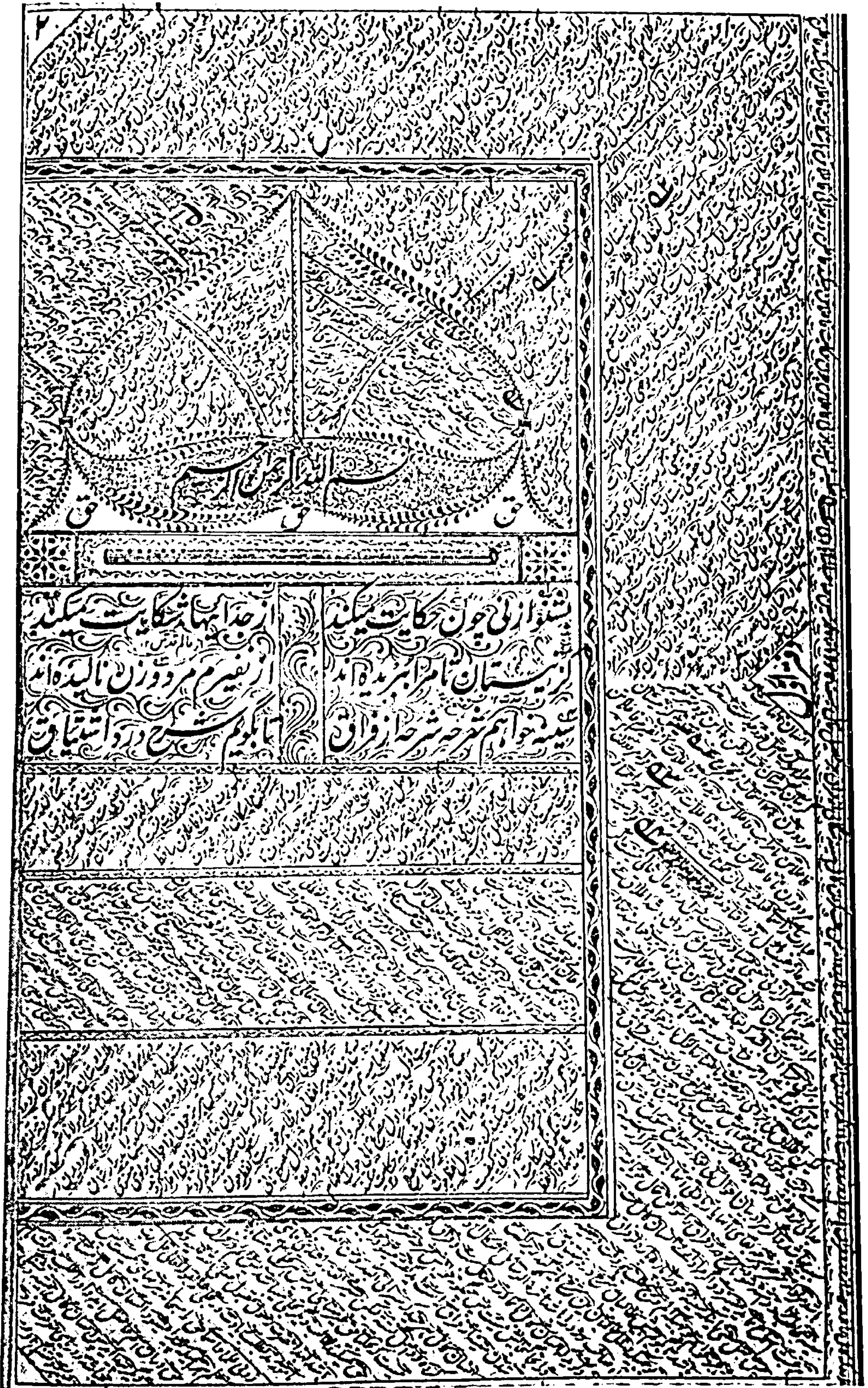






از رحمة الله

در مطبع نامی واقع کانپور مطبوع گردید



بسم الله الرحمن الرحيم

بشنو از نی چون حکایت میکند | از جداییها شکایت میکند

از نیستان تا مرا ببریده اند | از نفیرم مرد و زن نالیده اند

سینه خواهم شرحه شرحه از فراق | تا بگویم شرح درد اشتیاق

۳

هر کسی کو دور ماند از اصل خویش — باز جوید روزگار وصل خویش

من بهر جمعیتی نالان شدم — جفت بدحالان و خوشحالان شدم

هر کسی از ظن خود شد یار من — از درون من نجست اسرار من

سر من از نالهٔ من دور نیست — لیک چشم و گوش را آن نور نیست

تن ز جان و جان ز تن مستور نیست — لیک کس را دید جان دستور نیست

آتش است این بانگ نای و نیست باد — هر که این آتش ندارد نیست باد

آتش عشق است کاندر نی فتاد — جوشش عشق است کاندر می فتاد

نی حریف هر که از یاری برید — پرده‌هایش پرده‌های ما درید

[illegible]

همچو نی زهری و تریاقی که دید	همچو نی دمساز و مشتاقی که دید
نی حدیث راه پر خون می کند	قصه‌های عشق مجنون می کند
محرم این هوش جز بیهوش نیست	مر زبان را مشتری جز گوش نیست
گر نبودی ناله نی را ثمر	نی جهان را پر نکردی از شکر
در غم ما روزها بیگاه شد	روزها با سوزها همراه شد
روزها گر رفت گو رو باک نیست	تو بمان ای آنکه چون تو پاک نیست
هر که جز ماهی ز آبش سیر شد	وانکه بی روزیست روزش دیر شد
در نیابد حال پخته هیچ خام	پس سخن کوتاه باید والسلام
بند بگسل باش آزاد ای پسر	چند باشی بند سیم و بند زر
گر بریزی بحر را در کوزه‌ای	چند گنجد قسمت یک روزه‌ای

[illegible]

کاسۂ چشم حریصان پُر نشد　　تا صدف قانع نشد پُر دُر نشد

ہر کرا جامہ ز عشقے چاک شد　　او ز حرص و عیبِ کلی پاک شد

شاد باش ای عشق خوش سودای ما　　اے طبیبِ جملہ علتہائے ما

ای دوائے نخوت و ناموس ما　　ای تو افلاطون و جالینوس ما

جسم خاک از عشق بر افلاک شد　　کوہ در رقص آمد و چالاک شد

عشق جان طور آمد عاشقا　　طور مست و خر موسے صاعقا

بالب دمساز خود گر جفتمے　　ہمچو نے من گفتنیہا گفتمے

ہر کہ او از ہمزبانی شد جدا　　بینوا شد گرچہ دارد صد نوا

چونکہ گل رفت و گلستان در گذشت　　نشنوی زان پس ز بلبل سرگذشت

سرِ پنہان ست اندر زیر و بم　　فاش گر گویم جہان برہم زنم

آنچہ نے میگوید اندر این دو باب　　گر بگویم من جہان گردد خراب

جمله معشوق است و عاشق پرده‌ای — زنده معشوق است و عاشق مرده‌ای

چون نباشد عشق را پروای او — او چو مرغی ماند بی پر وای او

من چگونه هوش دارم پیش و پس — چون نباشد نور یارم همنفس

نور او از یمن و یسر و تحت و فوق — بر سر و بر گردنم چون تاج و طوق

عشق خواهد کاین سخن بیرون بود — آینه غماز نبود چون بود

آینه جانت چرا غماز نیست — زانکه زنگار از رخش ممتاز نیست

آینه کز زنگ و آلایش جداست — پر شعاع از نور خورشید خداست

رو تو زنگار از رخ او پاک کن — بعد از آن آن نور را ادراک کن

حکایت پادشاه و عاشق شدن بر کنیزک و خریدن پادشاه آن کنیزک را و رنجور شدن آن کنیزک و تدبیر معالجهٔ پادشاه بهر کنیزک

بشنوید ای دوستان این داستان — خود حقیقت نقد حال ماست آن

نقد حال خویش را گر پی بریم | هم ز دنیا هم ز عقبی برخوریم

این حقیقت را شنو از گوش دل | تا برون آیی بکلی زاب و گل

فهم گرد آرید و جان را ره دهید | بعد از آن از شوق پا در ره نهید

بود شاهی در زمانی پیش ازین | ملک دنیا بودش و هم ملک دین

اتفاقا شاه شد روزی سوار | با خواص خویش از بهر شکار

بهر صیدی می‌شد اندر کوه و دشت | ناگهان در دام عشق او صید گشت

یک کنیزک دید او بر شاه راه | شد غلام آن کنیزک جان شاه

مرغ جانش در قفس چون می‌طپید | داد مال و آن کنیزک را خرید

چون خرید او را و برخوردار شد | آن کنیزک از قضا بیمار شد

آن یکی خر داشت پالانش نبود | یافت پالان گرگ خر را در ربود

کوزه بودش آب می‌نامد بدست | آب را چون یافت خود کوزه شکست

شه طبیبان جمع کرد از چپ و راست | گفت جان هر دو در دست شماست

جان من سهل ست جان جانم اوست | دردمند و خسته‌ام درمانم اوست

هر که درمان کرد مر جان مرا | برد گنج و در و مرجان مرا

جمله گفتندش که جانبازی کنیم | فهم گرد آریم و انبازی کنیم

هر یکی از ما مسیح عالمی ست | هر الم را در کف ما مرهمی ست

گر خدا خواهد نگفتند از بطر | پس خدا بنمودشان عجز بشر

ترکِ استثنا مرادم قسوتی ست / نی همین گفتن که عارض حالتی ست

ای بسا ناورده استثنا بگفت / جانِ او با جانِ استثناست جفت

هرچه کردند از علاج و از دوا / گشت رنج افزون و حاجت ناروا

شربت و ادویه و اسباب او / از طبیبان برد یکسر آبرو

آن کنیزک از مرض چون موی شد / چشمِ شاه از اشکِ خون چون جوی شد

چون قضا آید طبیب ابله شود / آن دوا در نفع خود گمره شود

از قضا سرکنگبین صفرا فزود / روغنِ بادام خشکی می‌نمود

از هلیله قبض شد اطلاق رفت / آبِ آتش را مدد شد همچو نفت

سستیِ دل شد فزون و خواب کم / سوزشِ چشم و دلِ پردرد و غم

ظاهر شدن عجز حکیمان از معالجهٔ کنیزک بادشاه و بدرگاه حق تعالی رو آوردن بادشاه و در خواب دیدن بادشاه آن ولی را (که حل) مشکل او

شه چو عجز آن حکیمان را بدید / پا برهنه جانبِ مسجد دوید

رفت در مسجد سوی محراب شد / سجده گاه از اشکِ شه پر آب شد

چون بخویش آمد ز غرقابِ فنا / خوش زبان بگشاد در مدح و ثنا

۹

کای کمینه بخششت ملکِ جهان — من چه گویم چون تو میدانی نهان

حالِ ما واین طبیبان سر بسر — پیشِ لطفِ عامِ تو باشد هدر

ای همیشه حاجتِ ما را پناه — بار دیگر ما غلط کردیم راه

لیک گفتی گرچه میدانم سرت — زود هم پیدا کنش بر ظاهرت

چون برآورد از میانِ جان خروش — اندر آمد بحرِ بخشایش بجوش

در میانِ گریه خوابش در ربود — دید در خواب او که پیرے رو نمود

گفت ای شه مژده حاجاتت رواست — گر غریبی آیدت فردا ز ماست

چونکه او آید حکیمِ حاذق است — صادقش دان کو امین و صادق است

در علاجش سحرِ مطلق را ببین — در مزاجش قدرتِ حق را ببین

خفته بود این خواب دید آگاه شد — گشته مملوکِ کنیزک شاه شد

چون رسید آن وعده گاه و روز شد — آفتاب از شرق اختر سوز شد

بود اندر منظره شه منتظر — تا ببیند آنچه بنمودند سر

دید شخصے فاضلے پرمایهٔ — آفتابے در میانے سایهٔ

می‌رسید از دور مانند هلال ... نیست بود و هست بر شکل خیال

نیست وش باشد خیال اندر روان ... تو جهانی بر خیالی بین روان

بر خیالی صلحشان و جنگشان ... وز خیالی فخرشان و ننگشان

آن خیالاتی که دام اولیاست ... عکس مه‌رویان بستان خداست

آن خیالی را که شه در خواب دید ... در رخ مهمان همی آمد پدید

نور حق ظاهر بود اندر ولی ... نیک بین باشی اگر اهل دلی

آن ولی حق چو پیدا شد ز دور ... از سر و پایش همی میریخت نور

شه بجای حاجبان در پیش رفت ... پیش آن مهمان غیب خویش رفت

ضیف غیبی را چو استقبال کرد ... چون شکر گویی که پیوست او بورد

آن یکی لب تشنه وان دیگر چو آب ... آن یکی مخمور وان دیگر شراب

هر دو بحری آشنا آموخته ... هر دو جان بی دوختن بر دوخته

گفت معشوقم تو بودستی نه آن ... لیک کار از کار خیزد در جهان

ای مرا تو مصطفی من چون عمر ... از برای خدمتت بندم کمر

از خداوند ولی التوفیق درخواست توفیق و رعایت ادب

در همه حال و بیان کردن وخامت و ضررهای بی ادبی

از خدا جوییم توفیق ادب ❊ بی ادب محروم گشت از لطف رب

بی ادب تنها نه خود را داشت بد ❊ بلکه آتش در همه آفاق زد

مائده از آسمان در میرسید ❊ بی شری و بیع و بی گفت و شنید

در میان قوم موسی چند کس ❊ بی ادب گفتند کو سیر و عدس

منقطع شد خوان و نان از آسمان ❊ ماند رنج زرع و بیل و داسمان

باز عیسی چون شفاعت کرد حق ❊ خوان فرستاد و غنیمت بر طبق

مائده از آسمان شد عائده ❊ چونکه گفت انزل علینا مائده

باز گستاخان ادب بگذاشتند ❊ چون گدایان زلها برداشتند

کرد عیسی لابه ایشان را که این ❊ دائم ست و کم نگردد از زمین

بدگمانی کردن و حرص آوری ❊ کفر باشد پیش خوان مهتری

زان گدارویان نادیده ز آز ❊ آن در رحمت بر ایشان شد فراز

منّ و سلوی ز آسمان شد منقطع ❊ بعد از آن زان خوان نشد کس منتفع

ابر ناید از پی منع زکات ❊ وز زنا افتد وبا اندر جهات

هر چه بر تو آید از ظلمات و غم ❊ آن ز بیباکی و گستاخی ست هم

هر که بیباکی کند در راه دوست ❊ رهزن مردان شد و نامرد اوست

هر که گستاخی کند اندر طریق ❊ گردد اندر وادی حسرت غریق

از ادب پر نور گشتست این فلک — وز ادب معصوم و پاک آمد ملک

بد ز گستاخی کسوف آفتاب — شد عزازیلی ز جرأت رد باب

حال شاه و میهمان بر گو تمام — زانکه پایانی ندارد این کلام

ملاقات بادشاه با آن ولی که در خوابش نمودند

شه چو پیش میهمان خویش رفت — شاه بود و لیک بس درویش رفت

دست بگشاد و کنارانش گرفت — همچو عشق اندر دل و جانش گرفت

دست و پیشانیش بوسیدن گرفت — وز مقام و راه پرسیدن گرفت

پرس پرسان میکشیدش تا بصدر — گفت گنجی یافتم آخر بصبر

صبر تلخ آمد و لیکن عاقبت — میوهٔ شیرین دهد پر منفعت

گفت ای هدیهٔ حق و دفع حرج — معنی الصبر مفتاح الفرج

ای لقای تو جواب هر سؤال — مشکل از تو حل شود بی قیل و قال

ترجمانی هر چه ما را در دلست — دستگیری هر که پایش در گلست

مرحبا یا مجتبی یا مرتضی — ان تغب جاء القضا ضاق الفضا

انت مولی القوم من لا یشتهی — قد ردی کلا لئن لم ینته

بردن بادشاه آن طبیب را بر سر بیمار تا حال او ببیند

چون گذشت آن مجلس و خوان کرم — دست او بگرفت و برد اندر حرم

قصهٔ رنجور و رنجوری بخواند — بعد از آن در پیش رنجورش نشاند

رنگ رو و نبض و قاروره بدید — هم علاماتش هم اسبابش شنید

گفت هر داروکه ایشان کرده اند — آن عمارت نیست ویران کرده اند

بی خبر بودند از حال درون — أستعیذ الله مما یفترون

دید رنج و کشف شد بروی نهفت — لیک پنهان کرد با سلطان نگفت

رنجش از صفرا و از سودا نبود — بوی هر هیزم پدید آید ز دود

دید از زاریش کو زار دل ست — تن خوش ست و او گرفتار دل ست

عاشقی پیداست از زاری دل — نیست بیماری چو بیماری دل

علت عاشق ز علتها جداست — عشق اصطرلاب اسرار خداست

عاشقی گر زین سر و گر زان سر ست — عاقبت ما را بدان سر رهبر ست

هر چه گویم عشق را شرح و بیان — چون بعشق آیم خجل باشم ازان

گرچه تفسیر زبان روشنگر ست — لیک عشق بی زبان روشن تر ست

چون قلم اندر نوشتن می شتافت — چون بعشق آمد قلم بر خود شگافت

چون سخن در وصف اینحالت رسید — هم قلم بشکست و هم کاغذ درید

حضرت مولانا قاری عبدالرحمٰن محدث پانی پتیؒ
حالی کی نظر میں
مولانا الطاف حسین حالی کی ایک کم یاب تحریر

تمہید و تعارف اور حواشی نور الحسن راشد کاندھلوی

۱۸۵۷ء اور اس کے بعد کے دور میں برصغیر ہند کے علمی دینی افق پر، جو نام بہت نمایاں اور جگمگاتے ہوئے تھے اور جن میں سے بہت سے آج بھی ہماری توجہات کا مرکز اور علمی دنیا میں رہنما اور مشعل ہدایت بنے ہوئے ہیں ان میں سے ایک بڑا نام، حضرت مولانا قاری عبدالرحمٰن انصاری پانی پتی کا بھی ہے۔ مولانا قاری عبدالرحمٰن انصاری (ولادت ۱۲۲۷ء وفات ۱۳۱۴ھ/۱۸۹۶ء) اپنے عہد کے جلیل القدر محدث، سبعہ قرأت کے مایۂ ناز استاد و معلم، مفسر قرآن، مصلح، مرشد اور حضرت محمد اسحاق کے آخری دور کے بہت نامور شاگرد تھے۔

قاری صاحب شاہ محمد اسحاق سے مکہ مکرمہ میں درس حدیث مکمل کر کے ہندوستان آئے اور نواب باندہ کی خواہش پر ان کی ریاست میں ملازم ہو گئے، یہ ملازمت ۱۸۵۷ء تک مسلسل چلی، کچھ وقفہ کے بعد اس ملازمت کا ایک مختصر دور اور ہوا، غالباً ۱۲۷۵ھ/۱۸۶۰ء میں باندہ کی ملازمت ترک کر کے وطن پانی پت واپس آگئے تھے اور وفات تک وہیں درس حدیث، سبعہ عشرہ قرأت کی تعلیم و عملی تربیت، درس قرآن، فقہ و فتاویٰ ارشاد و تربیت اور تذکرہ و اصلاح میں، اس طرح مشغول رہے کہ پورے برصغیر ہند بلکہ اور ملکوں میں بھی اس کا آوازہ گونج گیا۔

درس حدیث میں قاری صاحب کو خاندان حضرت شاہ ولی اللہ کا قائم مقام اور ان دو تین اصحاب میں شمار کیا جاتا تھا، جن میں خاندان ولی اللہی کی خصوصیات و ترجمانی جھلکتی تھی۔ سبعہ قرأت کا درس بھی قاری صاحب کا بے نظیر عمل تھا، جس سے اس پورے خطہ میں قرآن مجید کی اعلیٰ درجہ کی تعلیم قرأت و تجوید کا مبارک علم اور ذوق پوری طرح زندہ ہو گیا۔ اور غالباً اس میں کچھ مبالغہ نہیں کہ شمالی ہندوستان میں قرأت کا فن جو باقی ہے، اس میں قاری صاحب کا خاص حصہ ہے۔

پانی پت میں قاری صاحب کی خدمت میں حاضر ہونے والے اصحاب میں قاری صاحب کے شاگرد اور عام اہل ضرورت ہی نہیں تھے، بلکہ پانی پت کے بڑے علماء، اصحاب فضل و دانش اور مشائخ و اصفیاء بھی قاری صاحب کو اپنا بزرگ و رہبر مانتے تھے ان کے یہاں حاضری کا معمول رکھتے تھے اور قاری صاحب سے کثرت سے فائدہ اٹھاتے تھے۔ پانی پت کے ایسے نمایاں و برگزیدہ اصحاب میں سے:

مولانا غوث علی پانی پتی　　(وفات: ۱۲۹۷ھ/۱۸۸۰ء)

مولانا گل حسن پانی پتی　　(مؤلف تذکرہ غوثیہ وغیرہ، وفات　　)

مولانا راغب اللہ پانی پتی　　(وفات ۱۳۱۴ھ ۹۷-۱۸۹۶ء)

کے علاوہ مولانا الطاف حسین حالی (۱۳۳۳ھ/۱۹۱۴ء) بھی شامل تھے۔ مولانا غوث علی روحانی علاج اور تصوف کے اسرار و رموز میں قاری صاحب سے استفادہ فرماتے، مولانا گل حسن صاحب نے قاری صاحب سے قرأت سبعہ متواترہ کی تعلیم حاصل کی، قرآن مجید میں اس کا اجراء کیا اور قاری صاحب سے اس کی سند پائی۔ یہاں یہ اطلاع مفید ہوگی کہ مولانا گل حسن نے، جس قرآن مجید میں مولانا قاری عبدالرحمٰن سے سبعہ قرأت کی تعلیم حاصل کی تھی اور جملہ قرأت مکمل تھیں اور اس نسخہ پر قاری صاحب نے مولانا گل حسن کے لئے اجازت بھی تحریر فرمائی تھی، ہمارے ذخیرہ میں محفوظ ہے(۱) اس میں حضرت قاری صاحب نے ومن یقنت کے پہلے رکوع کے اختتام پر یہ کلمات رقم فرمائے ہیں:

از اول فاتحہ تا قولہ تعالی لطیفا خبیرا. حضرت قرآن مجید رابقرأت سبعہ مکررہ متواترہ بقاعدہ جمع الجمع از مولوی گل حسن شنیدم۔ فقط　کتبہ العبد عبدالرحمٰن غفرلہ (۲)

---

(۱) یہ نادر قرآن مجید راقم سطور کو پانی پت کی ایک مسجد میں بڑے میاں سے ملا تھا اور ان کو کسی غیر مسلم نے دیا تھا۔

(۲) یہ قرآن مجید اس لحاظ سے بھی ایک یادگار اور تبرک ہے کہ، اس قرآن مجید پر مولانا گل حسن صاحب نے آخر تک سبعۂ قرأت متواترہ نقل اور درج کی ہیں، سورۂ ناس کے اختتام پر حاشیہ میں تحریر ہے:

بفضلہ تعالیٰ ترقیم سبعہ قرأت بروز جمعہ، بوقت ــــ اذان جمعہ بتاریخ ۱۶/ ماہ ربیع الثانی سنہ ۱۲۹۵ھ، در پانی پت، از درس گل حسن باتمام گرفت۔ بمنہ وکرمہ۔

وہفت پارہ درس سبعہ قرأت از مولانا مولوی قاری عبدالرحمان صاحب انصاری پانی پتی تا ایں ــــ مذہب در آمدہ۔ الٰہی بانجام رسائی۔

اس نسخہ کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ یہ قرآن مجید رجب ۱۳۲۳ھ (ستمبر: ۱۹۰۵ء) سے ذی الحجہ سنہ ۱۳۴۳ھ (جولائی: ۱۹۲۵ء) تک نامور خادم قرآن، قاری محمد اسماعیل پانی پتی (مؤلف عذار القرآن) کے پاس بھی رہا ہے ان کی تحریر اور دستخط بھی ثبت ہیں۔ یہ قرآن مجید مطبع مجتبائی میرٹھ سے سنہ ۱۲۸۳ھ (۱۸۶۶ء) میں چھپا تھا۔

مولانا الطاف حسین حالی بھی، مولانا گل حسن کے ساتھ قاری صاحب کی خدمت میں استفادہ کے لئے آیا کرتے تھے، قاری صاحب کی وفات کے بعد، حالی نے قاری صاحب پر ایک مختصر سا سوانحی تاثراتی مضمون لکھا تھا، جو ۱۸۹۶ء میں اخبار چودھویں صدی، راول پنڈی میں چھپا تھا۔ اس مضمون کو شیخ اسماعیل پانی پتی نے (جو بعد میں بہت کٹر قادیانی ہو گئے تھے) اپنے سہ ماہی رسالہ حیات نو پانی پت میں بھی چھاپ دیا تھا۔ یہ مضمون حالی کی ایک کم یاب تحریر اور یادگار ہے، حالی نے اس میں مولانا کے متعلق اپنے مشاہدات و معلومات یک جا کر دیئے ہیں اور یوں بھی اس کی اہمیت ہے کہ حالی نے کسی بڑے عالم اور خادم دین پر بہت کم کچھ لکھا ہے اور جہاں کہیں لکھا بھی ہے، اس میں بھی تحسین و عقیدت مندی کا پہلو نہ ہونے کے برابر ہے۔ حالی عموماً دینی طبقہ اور علماء کے سخت ناقد اور ان سے عملاً بیزار تھے، علماء اور مذہبی تعلیم کی نسبت نئے اداروں اور جدید تعلیم کے بڑے ہم نوا، اور اسی سے متوقع اور موہوم ترقی کے قائل تھے، اور چاہتے تھے کہ دوسرے اصحاب، یہاں تک کہ قاری عبدالرحمٰن جیسے نادر روزگار افراد بھی ان خیال کو سنیں اور تسلیم کریں اس کا حالی کی حضرت قاری عبدالرحمٰن صاحب سے ایک ملاقات میں اظہار بھی ہوا قاری صاحب کے معتمد سوانح نگار اور پوتے، قاری عبدالحلیم انصاری نے لکھا ہے کہ:

> ایک بہت ہی مشہور و معروف بزرگ، جو تعلیم جدید کے بے حد دلدادہ تھے اور حضرت سے ان کو بے حد عقیدت و محبت تھی، ایک روز تعلیم جدید کے فوائد بیان کرنے لگے، اپنی محرومی پر افسوس بھی ظاہر کیا۔ اس پر حضرت نے بلا رورعایت فرمایا:
>
> میں تمہیں کج رو تو سمجھتا تھا مگر نہ اتنا، جتنا آج تمہاری گفتگو نے ثابت کیا۔ تم اپنی محرومی کا افسوس کرتے ہو اور مجھے تمہارے اس افسوس کا افسوس ہے۔

مگر حالی نے نظریات کے اس اختلافات کے بعد بھی، حضرت قاری صاحب سے ویسا ہی تعلق رکھا اور حالی حضرت مولانا کی خدمت میں برابر حاضر ہوتے رہے۔

قاری صاحب کی زندگی اور سیرت و کردار میں ایسی معنویت، ایسی گہرائی، ایسا جذبۂ صادق اور خلوص تھا کہ حالی جیسا عقلیت پسند بھی (جو سرسید احمد اور مجھے معاف کیا جائے، شیعیت سے بھی بہت متاثر تھا)

تعریف کے لئے بغیر نہ رہ سکا۔ حالی نے قاری عبدالرحمٰن کی وفات کا ذکر کرتے ہوئے ایک غیر معمولی بات کہی ہے لکھتے ہیں:

''جس کا مثل آئندہ زمانہ میں پیدا ہونا محالات عادیہ میں سے معلوم ہوتا ہے''

حالی کی یہ تحریر اگر چہ بہت مختصر ہے مگر اس کی جامعیت وتہہ داری میں شک نہیں، اس کی خاصی مفصل شرح لکھی جاسکتی ہے۔ قاری صاحب کے سوانح نگار اگر چہ قاری صاحب کے حقیقی پوتے ہیں مگر انھوں نے بھی اپنی کتاب میں، حالی کی اس تحریر یا مضمون سے استفادہ کیا ہے، کئی موقعوں پر اس کا حوالہ دیا ہے اور اس کے اقتباسات بھی نقل کئے ہیں (۱) لیکن حالی کی جملہ اطلاعات تذکرہ رحمانیہ میں شامل نہیں، مثلاً حالی نے مولانا عبدالرحمٰن کے اساتذہ میں مولوی محمد قاسم دہلوی کا بھی ذکر کیا ہے، مگر مؤلف تذکرہ رحمانیہ اس کا قطعاً تذکرہ نہیں کرتے، اور مؤلف تذکرہ رحمانیہ نے قاری صاحب کے استادوں میں، ایک ممتاز نام جس کی کسی قدر تفصیل بھی ہے، مولانا محمد قلندر جلال آبادی کا لکھا ہے لیکن حالی کی تحریر اس سے خالی ہے۔

اس لئے حالی کے اس مضمون کی، مولانا قاری عبدالرحمٰن پانی پتی کے احوال وتذکرہ کی تکمیل کے لئے بھی ایک اہمیت ہے، اس پہلو سے اس کو کبھی بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا، لہٰذا قاری صاحب کے احوال کے لئے تذکرہ رحمانیہ اور اس مضمون کو ساتھ ساتھ پڑھنا چاہئے۔

یہ مضمون جیسا کہ ذکر ہوا سب سے پہلے اخبار بیسویں صدی ہجری میں چھپا تھا، دوسری اشاعت رسالہ حیات نو پانی پت کی ایک اشاعت میں ہوئی، تیسری جو اس وقت سامنے ہے سہ ماہی نقوش لاہور کی ہے۔ یہ مضمون مدیر نقوش (محمد طفیل مرحوم) کو شیخ اسماعیل پانی پتی کے ذخیرہ سے ملا تھا، پانی پتی اور حالی کے فرزند، سجاد حسین پانی پتی کی مختصر تمہید اور شیخ اسماعیل کی چند سطور کے ساتھ نقوش کی اشاعت فروری، مارچ ۱۹۵۳ء (پنج سالہ نمبر: شمارہ ۲۹-۳۰) میں چھپا تھا، مگر ان دونوں تمہیدات کی یہ اطلاعات صحیح نہیں کہ یہ مضمون تبرک اور اس اشاعت تک غیر مطبوعہ تھا۔ مولانا عبدالحلیم انصاری نے وضاحت کی ہے کہ یہ مضمون ۱۸۹۶ء میں چودہویں صدی میں، اس کے بعد سہ ماہی حیات نو پانی پت میں چھپ گیا تھا (۲)

(۱) ملاحظہ ہو: تذکرہ رحمانیہ ص: ۶۵/۲/۷۲/۹۶/۹۷/۹۸/۹۲/۲۸۵/۲۶۴ وغیرہ۔ عکس طبع اول (دارالاشاعت رحمانیہ پانی پت از لاہور۔ ۱۴۰۰ھ ۱۹۸۰ء/ ۱۳۵۷ھ ۱۹۳۸ء)

(۲) تذکرہ رحمانیہ ص: ۷۲۔

یہ مضمون یہاں نقوش سے نقل کیا جارہا ہے، یہ صفحات مکرمی شبیر احمد خانصاحب میواتی (لاہور: پاکستان) کی عنایت سے ملے تھے۔

راقم نے جن چند موقعوں پر وضاحت کی ضرورت محسوس کی وہاں مختصر حاشیہ لکھ دیا ہے۔ امید ہے کہ یہ تحریر دلچسپی سے پڑھی جائے گی۔

یہاں یہ اطلاع ضروری ہے کہ تذکرہ رحمانیہ میں قاری صاحب کی وفات کا مہینہ (غالباً سہو کتابت سے) ربیع الاول لکھا گیا ہے، جس کے الفاظ یہ ہیں:

قصہ مختصر ۵/ربیع الاول ۱۳۲۴ھ/ مطابق ۱۳/ستمبر بروز شنبہ عصر کے ذرا پہلے، یہ آفتاب علم وفضل اس عالم فانی سے ہمیشہ کے لئے غروب ہوگیا" (تذکرہ رحمانی ص:۲۶۱)

مگر یہ صحیح نہیں، جنتری کے مطابق ربیع الاول ۱۳۱۴ھ میں ۵/ربیع الاول کو دوشنبہ ہو، ممکن نہیں اور ۵/ربیع الاول کی ۱۳/ستمبر سے بھی مطابقت نہیں ہوسکتی۔ ربیع الاول میں پانچ تاریخ کوشنبہ یا یک شنبہ ہوسکتی تھی مگر اس کی مطابقت ستمبر سے نہیں، ۱۵/اگست سے ہوگی، لہٰذا یہ تاریخ صحیح نہیں، تذکرہ رحمانیہ کے اعتماد پر اور بھی کئی کتابوں میں یہی تاریخ وفات (۵/ربیع الاول) لکھی گئی ہے جو بے اصل ہے۔

تذکرہ قاریان ہند (تالیف کرنل مرزا بسم اللہ بیگ) میں ۵/ربیع الاول کی مطابقت ۳۱/دسمبر سے کی گئی ہے، جو کسی طرح صحیح نہیں ہوسکتی (۲)

حالی کی اطلاع درست اور صحیح تاریخ وفات ہے۔ ۶/ربیع الثانی ۱۳۱۴ھ یوم دوشنبہ (جو مطابق ہے ۱۴/ستمبر ۱۸۹۶ء کے) یہی تاریخ مولانا عبدالحی حسنی نے نزہۃ الخواطر میں درج کی ہے (۳)

حضرت قاری صاحب کو مولانا حالی اور تذکرہ رحمانیہ کی صراحت کے مطابق، مزار سید مودو، دلاری اور قبرستان انصار پانی پت کے قریب، بڑوالے کھیت میں دفن کیا گیا تھا۔ یہ کھیت قاری صاحب کی وفات کے دن قاری صاحب کے ورثاء نے خرید کر، قاری صاحب کی تدفین کے لئے وقف کردیا تھا، بعد میں قاری صاحب کے برابر میں چند علماء اور اصحاب بھی دفن کئے گئے، جس میں مولانا قاری راغب اللہ پانی پتی بھی تھے۔

---

(۱) ملاحظہ ہو: ۲۲۲۔ (میر محمد۔ کراچی۔ بلاسنہ)

(۲) نزہۃ الخواطر ص: ۴۴۶۔ ج: ۸ (حیدرآباد: ۱۴۰۲ھ۔ ۱۹۸۱ء) شاگردوں اور اولاد کی تفصیل کے لئے دیکھئے، تذکرہ رحمانیہ اور تذکرہ قاریان ہند ص: ۲۱۹ تا ۲۲۶ حصہ اول ص: ۴۹۔ حصہ دوم۔

اب بڑ والے کھیت سے کوئی واقف نہیں، بلکہ قاری عبدالرحمٰن صاحب کے مدفن کو صحیح جاننے والے بھی گنتی کے چند افراد ہوں گے۔ اس قبرستان اور مدفن پر سنہ ۱۹۴۷ء کے بعد کیا گزری، اب وہ کس حالت میں ہے، اس کا تذکرہ کئے بغیر یہ بات نامکمل رہے گی۔

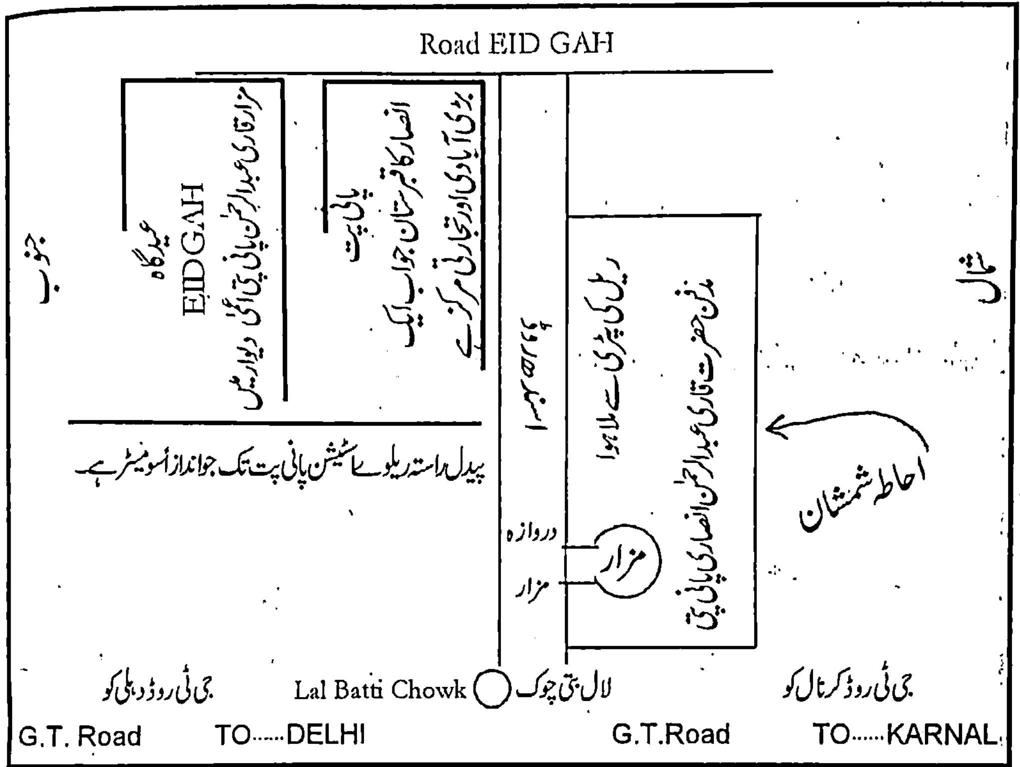
۱۹۴۷ء کے بعد قاری صاحب کے مدفن سے ملحق بڑے میدان پر، غیر مسلموں نے قبضہ کرلیا تھا، قبضہ کے خلاف آواز کون اٹھاتا، جدوجہد کون کرتا، اس لئے انہوں نے اس کو زمین کے برابر کر کے وہاں ایک بڑے مرگھٹ کی بنیاد رکھی، اس میں بڑے ہال تعمیر کئے اور بڑا شمشان بنایا۔ یہ شمشان دہلی سے کرنال جانے والی بڑی سڑک (GT-ROAD) میں سے کھلنی والی ایک اور سڑک پر، جس کو اسندھ روڈ کہتے ہیں ریل کے پل کے برابر میں ہے۔

اس شمشان کی بڑی چہار دیواری ہے، جب اس کے صدر دروازے سے اندر داخل ہوتے ہیں، تو سامنے ہی دائیں جانب ایک گنبد نما گھپا سی بنی ہوئی نظر آتی ہے جو نہ تو گنبد معلوم ہوتا ہے نہ مزار! اس میں داخلہ کا دروازہ بھی چھوٹا سا اور غیر نمایاں ہے، یہی حضرت قاری صاحب کا مزار ہے، قبر اور اس کا احاطہ پوری طرح محفوظ اور صاف ستھرا ہے۔

ایسے حالات اور ماحول میں جب ہریانہ و پنجاب کے ہزاروں قبرستان، مسجدیں مقبرے توڑ تاڑ کر بے نام ونشان کر دیئے گئے تھے، قاری عبدالرحمٰن صاحب کے مدفن کے قریب واقع پانی پت کا سب سے بڑا قبرستان انصار بھی بے نام ونشان ہوگیا اور خود قاری عبدالرحمٰن صاحب کے مزار سے ملی ہوئی قبریں بھی مسمار کر دی گئیں، اس مزار کی موجودگی عجیب کرشمۂ قدرت ہے۔

کہتے ہیں کہ جب مزدوروں نے اس قبر کو ختم کرنا اور توڑنا چاہا، پھاوڑے وغیرہ چلائے تو جو بھی مزدور اس کام کے لئے آگے بڑھتا، اس کی بینائی بالکل ختم ہو جاتی اور ہاتھ معطل ونا کارہ ہو جاتے تھے، ایک کے دوسرے کا پھر تیسرے کا بھی یہی حال ہوا، جب چار پانچ مزدور اور کام کرنے والے اپنی آنکھوں سے محروم اور ہاتھوں سے مستقل ناکارہ ہوگئے، تو مجبوراً قاری صاحب کی قبر کو اکھاڑنے کی کوشش چھوڑنی پڑی، بعد میں بھی ان لوگوں پر کچھ حالات پیش آئے، اس لئے ان ہی غیر مسلموں اور شمشان بنانے والوں نے، قاری صاحب کے مزار اور اس کے مختصر سے احاطہ کو اچھا صاف ستھرا بنا دیا تھا مگر پھر بھی کسی جاننے والے یا رہبر کے

بغیر مزار تک پہنچنا مشکل ہے، اس لئے اس جگہ کا پورا نقشہ پیش کیا جاتا ہے، شاید کسی کے کام آجائے۔



بہت سے اصحاب کو یہ غلط فہمی ہوجاتی ہے کہ عیدگاہ پانی پت کی دیوار میں جو مزار ہے وہ قاری عبدالرحمٰن صاحب انصاری پانی پتی کا ہے مگر یہ صحیح نہیں۔ عیدگاہ کی دیوار میں جو قبر ہے وہ قاری صاحب کے ایک مشہور شاگرد، قاری عبدالرحمٰن کھوکھر نابینا (اعمٰی، ضریر) کی ہے۔ قاری نابینا بھی درس قرأت کے ایک نامور استاد اور خادم تھے، قاری بسم اللہ بیگ کی اطلاع کے مطابق قاری عبدالرحمٰن اعمٰی کی سنہ ۱۲۳۴ھ کی انبالہ میں وفات ہوئی تھی (۱) لیکن ان کی تدفین پانی پت میں ہوئی۔

آخر میں مولانا حالی کے اس مضمون کے بعد، قاری صاحب کی چند اور باقیات بھی بطور تبرک شامل کی جارہی ہیں:

الف: آغاز میں حضرت قاری عبدالرحمٰنؒ کے مرتب کئے ہوئے اور شائع کرائے ہوئے ایک

(۱) تذکرہ قاریان ہند۔ ص: ۳۰۷ حصہ دوم (نور محمد۔ کراچی)

قرآن مجید کے صفحات کا عکس ہے۔ یہ قرآن مجید ۱۳۱۳ھ (۱۸۹۶ء) میں مطبع فیض عام مظفر نگر سے شائع قرآن مجید کی اس طباعت کا جس پر (برصغیر ہند میں) سب سے پہلے سبعہ قراءت چھپی تھی کرنل مرزا بسم اللہ بیگ نے بھی قاریان ہند میں تذکرہ کیا ہے (ص:۴۹ نیز ص:۲۹۸ ج:۲) مگر وہاں غلطی سے مظفر گڑھ پنجاب چھپ گیا ہے، جو صحیح نہیں۔ یہ قرآن مجید مظفر نگر (یوپی) سے شائع ہوا تھا۔

نیز اس قرآن مجید کے چند اور صفحات جس میں قاری صاحب کی اسانید تجوید اور ہر ایک مختصر رسالہ بھی ہے یہاں پیش کئے جاتے ہیں۔

ب: قاری صاحب کی تالیف تحفۂ نذریہ کے مطبوعہ نسخہ کا سرورق بھی شامل اشاعت ہے۔

ج: پانی پت میں سلسلہ قرأت کے بانی ومجدد مولانا قاری مصلح الدین پانی پتی کے حالات گویا معدوم ہیں، قاری قادر بخش پانی پتیؒ کی تالیف میں ان کا بہت مختصر سا تذکرہ ہے۔ یہ عبارت بھی برکت کے لئے یہاں شائع کی جارہی ہے۔

ہم نے آگ جلانی سیکھی!

ہم نے آگ جلانی سیکھی اور اس سے چند فوائد حاصل ہوئے۔ آگ میں جلنے والی چیزیں تین قسم کی ہوتی ہیں۔ ایک جیسے پھونس کہ جلے جلد اور بڑا شعلہ اٹھے اور پھر چھائی (راکھ) ہو کر کچھ نہ رہے۔ دوسری پتلی لکڑی کہ پھونس کی نسبت کسی قدر دیر میں آگ کے اثر کو لے۔ مگر پھونس کی طرح جلدی بجھتی نہیں۔ اس کی آگ دیر تک قائم رہتی ہے۔ تیسرے موٹی لکڑی۔ آگ بھی دیر میں قبول کرے اور آگ اس کی دیرپا ہو

حضرت شیخ عبدالقدوس رحمۃ اللہ علیہ نے بجواب حضرت شیخ جلالؒ کہ انہوں نے لکھا تھا کہ مجھے دیر میں اثر ہوا تحریر فرمایا ہے: 'آرے! آرے! دیگ مرداں، دردیر پختہ می شود (ہاں! ہاں! بیشک مردوں کی دیگ دیر میں تیار ہوتی ہے) یعنی اثر دیر میں قبول کیا۔ پھر اس کی آگ دیکھو آج تک بھڑک رہی ہے اور کتنوں کے گھروں میں جل رہی ہے۔

(مکتوبات مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

تذکرۂ رحمانیہ

تحریر: الطاف حسین حالی　　　حواشی نور الحسن راشد کاندھلوی

وَمَامِنْ رَزِیَّاتٍ اَکْبَرُ عَلیٰ الاسْلامِ مِنْ مَوْتِ اَھْلِ اللّٰہِ وَعُلَمَاءِ الدِّیْنِ (۱)

(یعنی) اسلام پر کوئی مصیبت اہل اللہ اور علماء دین کی موت سے زیادہ بڑی نہیں

افسوس! ہزار افسوس!!! اور صد ہزار افسوس!!! کہ قدوۃ العلماء، بقیۃ السلف الصالحین، جناب حاجی قاری مولوی عبدالرحمٰن صاحب انصاری (۲) رئیس پانی پت نے، تاریخ ۶ ربیع الثانی ۱۳۱۴ھ یوم دوشنبہ شام کے تین بجے، بعارضہ تپ و پیچش آٹھ سات دن بیمار رہ کر کچھ کم نوے (۳) برس کی عمر میں دنیا سے رحلت فرمائی اور رات کے دس بجے امیر مودود دلاری قدس سرہٗ (۴) کے مزار کے قریب بڑوالے کھیت میں دفن کئے گئے۔ باوجودیکہ رات کا وقت تھا اور تجہیز و تکفین میں نہایت عجلت کی گئی تھی، جس کی وجہ سے دیہات میں خبر نہ پہنچ سکی، پھر بھی قریب پانچ ہزار آدمی جنازہ کی نماز میں موجود تھا اور سیکڑوں مرد اور عورتیں دھاڑیں مار مار کر روتے تھے، چاروں طرف کے رئیس، اہل حرفہ، کاشتکار اور سوداگر جنازہ کی مشایعت میں شریک تھے۔

---

(۱)

(۲) ۶ ربیع الثانی ۱۳۱۴ھ (مطابق ۱۳ ستمبر ۱۸۹۶ء) تذکرہ رحمانیہ وغیرہ میں درج ماہ ربیع الاول درست نہیں۔

(۳) مولانا حالی اور مولانا عبدالحلیم انصاری (تذکرہ رحمانیہ ص:) دونوں نے امیر مودود دلاری کا اہتمام سے ذکر کیا ہے مگر افسوس کہ اب وہ معروف مزار بھی گم نام ہے، قبرستان انصار بھی گویا معدوم ہے، اب وہاں بڑے بڑے گودام، بازار اور عمارتیں بن گئی ہیں، اس کے قریب میں ایک بڑا گنبد ہے ممکن ہے وہی امیر مودود دلاری کا مزار ہو۔ مگر کون بتائے۔ مٹے نامیوں کے نشاں کیسے کیسے؟

(۴) صحیح تقریباً ستاسی، ولادت ۱۲۲۷ھ (۱۲-۱۸۱۱ء)

مولانا مغفور قاری محمدی (۵) صاحب کے خلف الصدق اور قاری قادر بخش (۶) صاحب اور قاری احمدی

(۵) قاری محمد خلف خدا بخش بن غلام بو علی۔۔ مولانا حالی کی تحریر میں محمدی یا احمدی لکھا ہے جو صحیح نہیں، مفصل شجرہ نسب کے لئے دیکھئے: تذکرہ رحمانیہ ص:۱۳-۱۲۔

بارہویں صدی ہجری کے آخر میں پیدا ہوئے، خاندان کے بڑوں سے تعلیم حاصل کی، دہلی میں حضرت شاہ عبدالعزیز اوران کے بھائیوں (شاہ رفیع الدین، شاہ عبدالقادر) سے تعلیم واستفادہ کے لئے دہلی گئے، حضرت شاہ محمد اسماعیل شہید کے اخذ کمال کیا، قاری شاہ عبدالمجید اور قاری مجیب اللہ سے قرأت سبعہ پڑھی، شاہ عبدالعزیز سے بیعت ہوئے، چالیس سال کی عمر میں ۱۲۴۰ھ (۲۵-۱۸۲۴ء) میں دہلی میں وفات ہوئی، وہیں دفن کئے گئے۔

مولانا عبدالحلیم انصاری نے نقل کیا ہے کہ، مولانا محمد نے فقہ پر اردو میں ایک رسالہ اتالیق الصبیان کے نام سے لکھا تھا، جس کی شاہ محمد اسحاق نے توثیق فرمائی تھی (رحمانیہ ص:۲۶)

ڈاکٹر ایوب قادری نے اتالیق الصبیان کا سنہ تالیف بلا کسی حوالہ سنہ کے ۱۲۴۹ھ (۱۸۳۳×۳۴ء) لکھا ہے، جو یقیناً غلط ہے۔اول تو اس وجہ سے کہ اسی گھرانہ کے علمی فرد، قاری عبدالحلیم پانی پتی کی صراحت کے مطابق قاری محمد صاحب کی سنہ ۱۲۴۰ھ (۱۸۲۵ء) میں وفات ہوگئی تھی، (ص ۲۶) دوسرے مولانا امتیاز علی عرشی نے رضا لائبریری کے اردو مخطوطات کی فہرست میں، اتالیق الصبیان کا مفصل تعارف کرایا ہے اور اس کے متعدد اقتباسات بھی نقل کئے ہیں، مگر ان میں کہیں بھی سنہ تالیف موجود نہیں (ص:۳۵-۱۳۳) اگر ہوتا تو مولانا عرشی اس کی ضرور صراحت کرتے، اس لئے قاری صاحب کی یہ اطلاع بلاشبہ غلط ہے۔

اتالیق الصبیان کا ایک قلمی نسخہ رضا لائبریری، رام پور میں موجود ہے، مکتوبہ ۴ر شعبان سنہ ۱۲۵۹ھ/ستمبر ۱۸۴۳ء۔ فہرست مخطوطات اردو رضا لائبریری، مرتبہ مولانا امتیاز علی عرشی۔ص:۱۳۳ ص:۱۳۵ (رام پور: ۱۹۶۷ء)

ڈاکٹر ایوب قادری نے اردو نثر کے ارتقاء میں علماء کا حصہ میں (شاہ محمد اسحاق کے رفقاء وتلامذہ) کے تحت مولانا محمد مؤلف اتالیق الصبیان کا ذکر کیا ہے، جس میں مصنف اتالیق الصبیان کا نام سید محمد دہلوی لکھا ہے ص:۲۶۹ (لاہور: ۱۹۸۰ء) مگر نام کے ساتھ دونوں لاحقے درست نہیں، مؤلف اتالیق الصبیان سید نہیں قدیم انصاری تھے، مفصل نسب نامہ تذکرہ رحمانیہ میں موجود ہے (ص:۱۵-۱۲) دوسرے وہ دہلی کے باشندے نہیں پانی پتی تھے۔ میرا خیال ہے کہ قادری صاحب کو میر سید محمدی بیدار سے التباس ہوا، وہ سید بھی تھے اور دہلوی بھی، مگر انہوں نے آگرہ میں وفات پائی۔ پھر یہ غلط فہمی کیوں ہوئی کہ ان کے حالات نہ مل سکے، حالات پانی پتی اور دہلوی دونوں کے دریافت ودستیاب ہیں۔

(۶) قاری قادر بخش اوران کے بھائی قاری محمد، حضرت شاہ عبدالعزیز کی صحبتوں اور تلمذ سے مالا مال تھے۔ قادر بخش تجوید میں قاری مصلح الدین کے شاگرد تھے، پانی پت میں قرأت اور روایت سبعہ عشرہ کا سلسلہ چرچا ان ہی کی ذات گرامی سے ہوا، قاری قادر بخش صاحب نے قرأت پر اپنے استاد کے گرامی سے جو کچھ سنا اس کا عمدہ خلاصہ، اپنی ایک نہایت عمدہ تالیف، مختصر التجوید میں جمع فرمادیا۔ قاری قادر بخش صاحب نے لکھا ہے:

بقیہ حاشیہ آئندہ صفحہ پر

صاحب کے (جو قلعہ دہلی میں اکثر سلاطین اور خاص کر بادشاہ کی اولاد کے استاد تھے) حقیقی بھتیجے تھے۔ ان کے والد اور دونوں چچاؤں نے جناب قاری مصلح الدین صاحب پانی پتی سے، جن کے صاحبزادے قاری لالہ (۸) صاحب تمام ہندوستان میں مشہور تھے، تجوید اور قرأت سیکھی تھی اور انہیں کے خاندان کی بدولت پانی پت، دہلی اور مضافات دہلی میں فن تجوید شائع ہوا۔ حفاظ وقرأ کی تعداد ہزاروں سے گزر کر لاکھوں تک پہنچ گئی۔ خصوصاً مولانا مرحوم نے جس قدر قرآن مجید کی خدمت دس برس کی عمر سے اخیر عمر تک کی وہ شاید ہی کسی کو نصیب ہوئی ہوگی۔

مولانا نے قرآن اور کسی قدر صرف ونحو اور قرأت دلی میں اپنے والد ماجد سے (جب کہ وہ بخشی محمود خان کے ہاں سے متعلق تھے) پڑھی تھی، اور وہ اپنے والد کے ساتھ شاہ عبدالعزیز صاحب (۹) کے وعظ میں

بقیہ حاشیہ گذشتہ صفحہ کا

یہ ناچیز بندہ پروردگار کا، قادر بخش پانی پتی، بدترین ان عواموں کا ہے کہ جن کو ضعیف ہمت بیان کیا ہے اور اس گنہگار نے وقت خورد سالی کے، قرآن مجید اپنے استاد، قاری مصلح الدین صاحب پانی پتی سے، روشن کرے اللہ تعالیٰ نور معرفت کی سے خواب گاہ ان کی اور بلند کرے درجے ان کے۔

جناب مؤلف نے اس کتاب کو سنہ ۱۲۴۲ھ (۲۷-۱۸۲۶ء) میں تالیف کیا تھا تحریر ہے:

''سو الحمد للہ کہ سن بارہ سو بیالیس میں، یہ رسالہ اس فقیر کے ہاتھ سے لکھا گیا، اور اس کا نام مختصر التجوید مقرر ہوا۔

مختصر التجوید کا زیر نظر نسخہ جو ۱۶ر صفر ۱۲۵۳ھ (۲۲ر مئی ۱۸۳۷ء) کو قاری محمد سعادت صاحب کے لئے، امیر الدین، ساکن کیرانہ (ضلع مظفر نگر) نے بھوپال میں صاحبزادی (نواب) قدسیہ بیگم کی حویلی میں نقل کیا تھا، انتالیس (۳۹) اوراق پر مشتمل ہے۔

قاری قادر بخش کا سلسلہ قرأت واجازت ان کے نواسہ، قاری نجیب الدین صاحب (خلف شیخ سعد اللہ عثمانی پانی پتی) کے ذریعہ جاری ہے۔ قاری نجیب کے شاگرد، قاری محمد اسماعیل تھے، (مؤلف عذار القرآن) اس کا سلسلہ اور مدرسہ بحمد اللہ اب تک جاری ہے، (نیز ملاحظہ ہو: قاریان ہند ص: ۲۲۶)

(۸) قاری عبید اللہ صاحب عرف قاری لالہ، برصغیر میں قرأت کے مجدد اور مایہ ناز عالم تھے۔ پانی پت، دہلی اور بھوپال میں قیام رہا، دہلی میں حضرت شاہ عبدالعزیز کی خدمت میں حاضر رہتے اور حضرت شاہ صاحب کی محفل میں قرآن مجید پڑھنے کی سعادت حاصل کرتے۔ سنہ ۱۲۴۲ھ (۲۷-۱۸۲۶ء) تک پانی پت میں تھے سنہ ۱۲۵۷ھ (۱۸۴۱ء) میں وفات ہوئی، مفتی صاحب بھوپالی کی ایک یادداشت کے مطابق، بھوپال کی جیل کے نیچے قبرستان میں مزار ہے۔ نیز ملاحظہ ہو: تذکرہ قاریان ہند ص: ۲۷۵۔ فقرہ ۹۴۰۔ حصہ دوم

(۹) حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی، برصغیر ہند کا کون پڑھا لکھا ایسا ہے جو شاہ صاحب کو نہ جانتا ہو۔ ولادت ۱۱۵۹ھ/ وفات سنہ ۱۲۳۹ھ

جایا کرتے تھے، جب والد کا انتقال دلی میں ہوگیا (۱۰) تو مولوی سید محمد صاحب (۱۱) حاجی قاسم صاحب (۱۲) مولوی رشید الدین خاں صاحب (۱۳) سے کسی قدر کتب درسیہ زیادہ تر مولانا مملوک علی صاحب (۱۴) سے

(۱۰) تذکرہ رحمانیہ ص: ۳۰ کے حوالہ سے صراحت گذر گئی ہے کہ مولانا قاری محمد صاحب کی ۱۲۴۰ھ میں وفات ہوگئی تھی۔

(۱۱-۱۲-۱۳) مولانا حالی نے مولانا قاری عبدالرحمٰن کے استادوں میں یہ پہلے تین نام ذکر کئے ہیں، مولانا سید محمد، حاجی قاسم، مولانا رشید الدین خاں، ان تینوں کا قاری عبدالرحمٰن صاحب کے استاد کی حیثیت سے مصنف تذکرہ رحمانیہ نے ضمناً بھی تذکرہ نہیں کیا، حالاں کہ مولانا، قاری صاحب کے حقیقی پوتے ہیں اور تذکرہ رحمانیہ کی ترتیب کے وقت حالی کا یہ مضمون ان کے سامنے رہا ہے، وہ اس کے بار بار استفادہ کرتے ہیں، جس کا حاصل یہی ہے کہ ان تینوں سے قاری عبدالرحمٰن صاحب کو تلمذ نہیں۔ کم سے کم حاجی قاسم اور مولانا رشید الدین خاں سے قاری صاحب کا تلمذ قرین قیاس نہیں، حاجی قاسم سے اس لئے کہ وہ کوئی بڑے عالم اور نامور مدرس و معلم نہیں تھے اور ذہنی فکری طور پر خانوادہ ولی اللہی کے سخت مخالف تھے، قاری قاسم خاندان ولی اللہی سے مخالفت بلکہ مخاصمت معروف تھی، اس سلسلہ میں ان کی متعدد فتویٰ نما تحریریں بھی چھپی تھیں، اس لئے بہ ظاہر توقع نہیں کہ قاری عبدالرحمٰن کے اہل خاندان نے ان کو قاری قاسم کے پاس بھیج دیا ہو اور مولانا رشید الدین خاں کی محرم ۱۲۴۲ھ (۱۸۲۶ء) میں وفات ہوگئی تھی، مولانا عبدالرحمان اسی سال دہلی گئے تھے، جو مولانا رشید الدین خاں کا مرض وفات کا وقت تھا، مولانا سید محمد دہلوی سے تلمذ ممکن و متوقع ہے، کیوں کہ وہ دہلی کالج میں نائب صدر مدرس تھے اور عمدہ اساتذہ میں شمار کیے جاتے تھے۔

یہاں یہ بات قابل توجہ ہے کہ حالی نے قاری عبدالرحمٰن کے اساتذہ میں مولانا سید محمد قلندر جلال آبادی (جلال آباد ضلع مظفر نگر) (شاگرد حضرت مفتی الٰہی بخش کاندھلوی) وفات ۱۲۶۰ھ۔۱۸۴۴ء کا ذکر نہیں کیا، حالاں کہ وہ قاری صاحب کے اہم قابل ذکر استاد ہیں، قاری صاحب نے ان سے حدیث شریف، خصوصاً ایک تہائی بخاری شریف پڑھی تھی (ملاحظہ ہو: تذکرہ رحمانیہ ص: ۳۵)۔

(۱۴) حضرت مولانا مملوک علی بن مولانا احمد علی بن غلام شرف صدیقی نانوتوی۔ ۱۲۰۴ھ (۱۷۷۹ء) میں تولد ہوئے، حضرت مفتی الٰہی بخش، مولانا محمد قلندر جلال آبادی وغیرہ سے تعلیم حاصل کی اعلی درجات کی تکمیل کے لئے دہلی گئے، دہلی میں ایک سبق حضرت شاہ عبدالعزیز سے پڑھا، اکثر تعلیم اور کتابیں مولانا رشید الدین خاں کی خدمت میں مکمل کیں۔

مولانا کو تعلیم سے فارغ ہوئے زیادہ وقت نہ گزرا تھا کہ سنہ ۱۸۲۵ء/شوال ۱۲۴۰ھ میں دہلی کالج کا آغاز ہوگیا، کالج کے صدر مدرس کے لئے مولانا رشید الدین خاں کو منتخب کیا گیا تھا، مولانا مملوک العلی جو مولانا رشید الدین کے عزیز شاگرد تھے، مولانا نے ان کو اپنا نائب تجویز کیا، یوں مولانا مملوک العلی نائب صدر مدرس کی حیثیت سے اول دن سے دہلی کالج میں استاد مقرر ہوگئے تھے، مولانا رشید الدین اس ملازمت کے بعد دیر تک حیات نہ رہے، صرف دو سال بعد ان کی وفات ہوگئی تھی۔ ان کی وفات کے بعد مولانا کی جگہ نائب مدرس مولانا مملوک العلی کو ملی، جو بعد میں صدر مدرس ہوگئے تھے، مولانا مملوک العلی نے چھبیس سال دہلی کالج میں بسر فرمائے اور اس کو بام عروج کو پہنچا دیا۔ مولانا کے شاگرد ہندوستان کے ایسے فرزند ہیں، جس کی بعد کے دور اور تاریخ میں کوئی مثال موجود نہیں۔

مولانا مملوک العلی کی ۱۱رذی الحجہ ۱۲۶۷ھ (۱۸۵۱ء) کو دہلی میں وفات ہوئی وہیں مہندیان میں دفن ہیں۔ مفصل معلومات کے لئے راقم کی تالیف 'استاد الکل حضرت مولانا مملوک العلی نانوتوی' ملاحظہ ہو۔

پڑھیں اور صحاح ستہ کی سند جناب مولانا شاہ محمد اسحاق صاحب (۱۵) سے من اولہ الی آخرہ حاصل کی اوران کے ہاتھ پر بیعت طریقت کی اور امروہہ میں جاکر مولوی قاری امام الدین صاحب (۱۶) سے علم قرأت اور علم تصوف کا اکتساب کیا (۱۷)

طالب علمی کے زمانہ میں جو انہماک اور استغراق ان کو تحصیل علم میں رہتا تھا، اس کا اندازہ اس بات سے ہوسکتا ہے کہ ان کے عزیز اور ہم عمر دوست جو اس زمانہ میں دلی ان سے ملنے جاتے تھے، وہ ان سے سلام علیکم

---

(۱۵) حضرت شاہ محمد اسحاق خلف [حضرت شاہ عبدالعزیز کے حقیقی نواسے، اور دہلی میں خاندان ولی اللّٰہی کے آخری آفتاب تھے۔ رحمہ اللہ ورضی عنہ] ولادت .... حضرت شاہ عبدالعزیز اوران کے بھائیوں سے تعلیم حاصل کی، شاہ صاحب کی حیات میں درس حدیث کی وجہ سے شہرۂ آفاق تھے۔ شاہ عبدالعزیز نے علوم حدیث وقرآن مجید کی تدریس درس گاہ ولی اللّٰہی کی مسند نشینی اور اپنی نیابت خاص کے لئے شاہ محمد اسحاق کا انتخاب فرمایا۔ حلقۂ درس کی شہرت برصغیر کی حدود سے گزر کر عالم اسلام کے گوشہ گوشہ میں پہنچی۔ مسند ولی اللّٰہی کو تقریباً چالیس برس نوازنے کے بعد، ذی قعدہ ۱۲۵۸ھ (دسمبر ۱۸۴۲ء) میں دارالحرب سے دارالاسلام مکہ معظمہ کے لئے ہجرت کی، پانچ سال مکہ معظمہ میں حدیث شریف اور علوم اسلامیہ کا درس دیا۔ سنہ میں مکہ معظمہ میں وفات ہوئی، حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کے مزار مبارک کے بیرونی دروازہ سے متصل دفن کئے گئے۔

(۱۶) مولانا قاری امام الدین امروہوی، والد کا نام علی احمد اداد کا زین الدین محسنی تھا، شیعہ گھرانہ میں پیدا ہوئے۔ بچپن سے ایک سنی عالم، مولانا ضیف اللہ امروہوی کی صحبت میں رہے، ان ہی سے ابتدائی درسیات پڑھنے کا موقع ملا اور انہیں کے فیض صحبت سے شیعیت ترک کر کے مسلمان ہوئے۔

درسیات کی اعلیٰ تعلیم کے لئے دہلی پہنچے مفسر قرآن حضرت شاہ عبدالقادر محدث کی خدمت میں جملہ درسیات مکمل کیں، حضرت شاہ غلام مجددی سے سلوک وطریقت میں کثیر استفادہ کیا، عرصۂ دراز تک خدمت میں رہے، اجازت وخلافت حاصل کی، امروہہ واپس آئے سلسلہ رشد وہدایت شروع کیا جس سے مخلوق کو بہت فائدہ ہوا۔

مولانا عبدالحی حسنی نے مولانا کی چند مؤلفات کا ذکر کیا ہے اور نخبۃ التواریخ کے حوالہ سے لکھا ہے کہ مولانا امام الدین کی ۶/ ذی قعدہ ۱۲۵۶ھ (۳۱/ دسمبر ۱۸۴۰ء) کو وفات ہوئی (نزہۃ الخواطر ص: ۱۶۰ ج: ۷)

یہ بات قابل ذکر ہے کہ حضرت شاہ عبدالغنی مجددی دہلوی نے شاہ غلام علی کے احوال پر اپنی کتاب، 'ھو الغنی' میں شاہ غلام علی کے خلفاء کا تعارف کرایا ہے مگر اس فہرست میں مولانا امام الدین کا نام اور تعارف شامل نہیں۔ ملاحظہ ہو: ہوالغنی تکملہ مقامات مظہری (طبع اول، مطبع احمدی، دہلی۔ ۱۲۶۹ھ) مگر یہ خلفائے شاہ غلام علی کی فہرست کا پہلا نام نہیں ہے جس کا ہوالغنی میں اندراج نہیں، شاہ غلام علی کے اور بھی متعدد خلفاء ایسے ہیں، جن کا اور تذکروں اور مآخذ میں ذکر ہے مگر ہوالغنی میں ان کا تذکرہ شامل نہیں۔

(۱۷) قاری عبدالرحمٰن صاحب کو اگرچہ قاری صاحب سے طویل تلمذ اور استفادہ ہے لیکن سلوک میں رہنمائی کی اطلاع نئی ہے۔

یا سرسری مزاج پرسی کے بعد، صاف کہہ دیتے تھے کہ اس سے زیادہ فرصت ملنے یا بات چیت کرنے کی نہیں ہے، جب خدا بامراد ملائے گا اس وقت ملیں گے۔ طالب علمی کے زمانہ میں جو سختیاں اور محن دمشاق (۱۸) انہوں نے اٹھائی ہیں، ان پر اس زمانہ میں یقین آنا مشکل ہے۔

سنہ ۱۲۵۸ھ میں جب حضرت شاہ محمد اسحاق صاحب، ہجرت کے ارادہ سے حرمین شریفین کو جانے لگے، (۱۹) اس وقت مولانا مرحوم بھی ان کے ہمراہ تھے، چونکہ مرحوم ذوالفقار بہادر نواب باندہ نے شاہ صاحب سے درخواست کی تھی کہ حرمین کو اس طرف سے تشریف لے جائیں، اس لئے شاہ صاحب اول باندہ تشریف لے گئے اور مولانا مرحوم کو نواب ذوالفقار بہادر کے پاس باندہ چھوڑ گئے تھے، تقریباً سولہ برس مولانا صاحب باندہ میں رہے، اور اس عرصہ میں تمام علوم عقلیہ ونقلیہ کی درس وتدریس کرتے رہے، شاہ صاحب کے تشریف لے جانے کے دو سال بعد حج کو جانے کا اتفاق ہوا (۲۰) وہاں جا کر بعد حج کے کچھ کم ایک سال رہے، پھر شاہ صاحب کی خدمت میں حاضر رہے، اور صحاح کی سند دوبارہ حرم محترم خاص حطیم میں بیٹھ کر حاصل کی۔

جب شاہ صاحب حرمین کو روانہ ہوئے تو قرآن مجید کا درس جو وہ ہر جمع کو فرمایا کرتے تھے، اس میں تقریباً نصف قرآن شریف کا درس باقی رہ گیا تھا، مولانا مرحوم نے باجازت شاہ صاحب باندہ میں باقی سیپاروں کا درس ختم کیا۔ اور اس کے بعد ابتداء سے قرآن کا درس دینا شروع کیا، اور تقریباً پچاس برس برابر ہر جمعہ کو ان کا درس ہوتا رہا، خاص خاص حالتوں کے سوا کبھی کوئی جمعہ ناغہ نہیں ہوا، یہ قرآن بھی عنقریب ختم ہونے والا تھا صرف کسی قدر تیسواں پارہ رہ گیا تھا کہ مولانا کے کوچ کا وقت آن پہنچا۔

---

(۱۸) مِحَن محنتوں کی جمع ہے۔ مشاق مشقتوں کی جمع ہے۔

(۱۹) نواب قطب الدین دہلوی کی سنہ ہجرت کی صحیح وضاحت کے بعد (مندرجہ احکام عیدین ص: ۴-۳۔ نول کشور لکھنؤ ۱۲۹۳ھ/۱۸۸۳ء) کے بعد حالی پہلے شخص ہیں جنہوں نے شاہ محمد اسحاق کا صحیح سنہ ہجرت نقل کیا ہے، شاہ صاحب کے سنہ ہجرت کی اس کے علاوہ جو اطلاعات ہیں، وہ صحیح نہیں۔

(۲۰) اگرچہ نواب باندہ کے خاندان ولی اللّٰہی سے قریبی روابط تھے، مگر سفر ہجرت سے پہلے قاری عبدالرحمٰن صاحب دہلی میں موجود تھے اور شاہ اسحٰق کی دہلی سے روانگی کے بعد جلد ہی، چند مہینوں کے بعد قاری عبدالرحمٰن صاحب بھی مکہ معظمہ چلے گئے تھے، اس لئے حالی کی یہ اطلاع درست نہیں کہ: شاہ صاحب کے تشریف لے جانے کے دو سال بعد حج کو جانے کا اتفاق ہوا۔

چند سال سے مولانا مرحوم کی دونوں آنکھوں میں پانی اتر آیا تھا، انہوں نے زیادہ تو اسی خیال سے کہ قرآن مجید کا درس ختم نہ ہو جائے مظفر نگر (۲۱) ایک آنکھ بنوائی، مگر اس سے اچھی طرح کارروائی نہ ہوئی، اس لئے ارادہ تھا کہ دوسری آنکھ بھی بنوائیں مگر چونکہ اجل مسمیٰ کا وقت ٹلنے والا نہ تھا، یہ آرزو پوری نہ ہوئی۔

مولانا ممدوح کے فضائل وکمالات اور اعلیٰ اخلاق اور پختہ خصائل بیان کرنے کے لئے ایک جدا کتاب درکار ہے۔ مختصر یہ کہ جو خصوصیات علمی وعملی مولانا مرحوم میں پائی جاتی تھیں، ان کے لحاظ سے ان کا نظیر دور دور نظر نہیں آتا۔ ان کی تمام عمر کتب درسیہ کی تدریس میں گزری تھی، ایک ایک کتاب کو بیس بیس، تیس تیس دفعہ اول سے آخر تک پڑھایا تھا، اس سبب سے تمام کتابیں ایسی منجھ گئی تھیں کہ مشکل سے مشکل کتاب بلا تردد اور بغیر مطالعہ کے نہایت عمدگی سے پڑھاتے تھے، صحاح ستہ کو جس محدثانہ احتیاط اور ادب وتعظیم کے ساتھ وہ پڑھاتے تھے، اس کی نظیر کہیں نہیں دیکھی گئی۔

علم قرأت جس میں قرأ سبعہ اور ان کے راویوں کے اختلافات، اور نیز قرأت غیر متواترہ وشاذہ کا بیان ہے، اس میں مولانا مرحوم تمام ہندوستان میں اپنا جواب نہ رکھتے تھے، اور چونکہ اس فن کو ان سے بہت کم ہی لوگوں نے حاصل کیا تھا، اس لئے اخیر عمر میں ان کی دلی خواہش یہ تھی کہ لوگ ان سے اس فن کو حاصل کریں، اور لوگوں کی اس طرف بے توجہی دیکھ کر خوف کیا کرتے تھے کہ مبادا یہ علم اس ملک سے ناپید ہو جائے۔

ان کی تمام عمر کتب درسیہ اور صحاح ستہ کے درس وتدریس میں گزری تھی، مگر اب ان کو کوئی کام اور کوئی مشغلہ قرآن مجید کی تلاوت اور قرآن علم قرأت اور علم تجوید کی تعلیم سے زیادہ عزیز اور مرغوب نہ تھا، باوجودیکہ کئی برس سے قویٰ میں نہایت اضمحلال پیدا ہو گیا تھا، سماعت بہت کم ہو گئی تھی اور بینائی بالکل نہ رہی تھی، مگر ہمیشہ بیس پچیس سبق قرآن مجید کے مردوں اور قوم کی عورتوں کو پڑھاتے تھے۔ سخت سے سخت مرض اور تکلیف میں بھی رمضان شریف کے روزے اور ایک قرآن تراویح میں سنانا کبھی ترک نہیں ہوا، حتیٰ کہ گزشتہ رمضان شریف میں باوجود کمال ضعف وناتوانی کے سارا قرآن شریف تراویح میں سنایا، اور رمضان شریف کے روزے رکھے۔

(۲۱) آنکھوں کا علاج یا آپریشن مظفر نگر میں سنہ ۱۳۱۳ھ (۱۸۹۵ء) میں ہوا تھا جو اس وقت کے مشہور معالج ڈاکٹر عبدالرحمٰن (مہاجر مدنی۔ وفات سنہ ۱۳۲۵ھ خلیفہ حضرت مولانا گنگوہی) نے کیا تھا۔

نماز سے جس کی نسبت رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے قرۃ عینی فی الصلوٰۃ فرمایا ہے،(۲۲) انھوں نے عجیب طرح کا تعلق پیدا کیا تھا، کہ نماز کا وقت ہوتے ہی وہ بے چین ہو جاتے تھے اور جب تک نماز اول وقت ادا نہ کر لیتے تھے دنیا و مافیہا سے کچھ سروکار نہ رکھتے تھے۔

قرآن مجید جس کی تلاوت اور خدمت اور تعلیم میں تقریباً اسی برس گزرے تھے گویا ان کی رگ و پے میں سرایت کر گیا تھا۔ اس میں سرمو مبالغہ نہیں اگر بالفرض وہ تمام قرآن سوتے سوتے ختم کر دیتے تو ان کو ایک جگہ بھی متشابہ نہ لگتا، اور ایک حرف بھی قواعد تجوید ترتیل کے خلاف ان کے منہ سے نہ نکلتا۔

وہ قرآن کے الفاظ و حروف بہ قصد و ردیت مخارج سے نہیں نکالتے تھے، بلکہ تمام حروف کو اپنے مخارج سے ادا کرنا ان کا سلیقہ اور طبیعت بن گیا تھا، وہ فرماتے تھے کہ مکہ معظّمہ کی اقامت کے زمانہ میں جب اور ضروری کاموں سے فرصت ہوتی تھی تو میں جہاں کہیں عربوں کے چھوٹے چھوٹے بچوں کو کھیلتے دیکھتا وہاں جا کر کھڑا ہوتا، اور ان کے لب و لہجہ پر غور کرتا، اور جہاں تک ہو سکتا تھا اسی طرح حروف الفاظ کے ادا کرنے میں کوشش کرتا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز کی نسبت جو حدیث میں "اخف و اتم" (۲۲ب) کا لفظ وارد ہوا ہے، اس کے معنی مولانا مرحوم کی نماز اور تلاوت قرآن کا ڈھنگ دیکھ کر بالکل ذہن نشین ہو جاتے تھے۔ وہ قرآن مجید بہت جلد پڑھتے تھے مگر کیا امکان ہے کہ تجوید و ترتیل کے خلاف ایک حرف زبان سے نکلے۔

---

(۲۲) یہ ایک مختصر روایت میں شامل کلمات ہیں۔ حضرت انس فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے، دنیا کی چیزوں میں سے خوشبو اور عورتوں کو پسند کرتا ہوں اور میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں رکھ دی گئی ہے۔ اس روایت کو امام احمد اور نسائی نے نقل کیا ہے۔

عن انس قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم احبب الی الطیب والنساء وجعلت قرۃ عینی فی الصلوٰۃ . رواہ احمد والنسائی ص: ۴۴۹ مشکوٰۃ باب فضل الفقراء

(۲۲ب) عن انس قال ماصلیت وراء امام قط اخف الصلوٰۃ ولااتم صلوٰۃ من النبی صلی اللہ علیہ وسلم ...وان کان یسمع بکاء الصبی فیخفف مخافۃ ان تفتن امہ . متفق علیہ . مشکوٰۃ باب ماعلی الامام . ص: ۱۰۱

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے کسی بھی امام کے پیچھے اس قدر مختصر اور کامل ترین نماز نہیں پڑھی جیسی کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی امامت میں پڑھی۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اگر نماز کے بیچ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے کانوں میں کسی بچہ کے رونے کی آواز آجاتی تھی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز میں اس خیال سے تخفیف فرمادیتے تھے کہ اس بچہ کے رونے سے اس بچہ کی ماں فکر مند ہوگی۔

انہوں نے تمام قرأتوں میں سے امام نافع کی وہ روایت جوان کے شاگرد امام قالون کے توسط سے پہنچی ہے، اختیار کرلی تھی، آخر دم تک اسی روایت کے مطابق قرآن مجید پڑھایا۔ چونکہ اس روایت میں مدوشد بہت کم ہے اور مولانا مرحوم کی مشق ومہارت منتہائے کمال کو پہنچ گئی تھی اس لئے باوجود نہایت جلد پڑھنے کے تجوید وترتیل میں سر مو فرق نہ آتا تھا۔

ان کے وعظ کہنے کا طریقہ تمام واعظین کے طریقہ کے بالکل خلاف تھا۔ ان کا وعظ درحقیقت درس ہوتا تھا، جس میں لغو داستانیں اور فضول قصے کہانیاں بالکل نہ ہوتی تھیں، اور کوئی بات خارج از آہنگ معرض بیان میں نہ آتی تھی، اول قرآن کی آیت کے صاف اور سیدھے معنی بیان کرتے تھے، پھر اس کی ترکیب کا حال اور نہایت ضروری تفسیر اور مسائل فقہیہ جو ائمہ مجتہدین نے اس سے استنباط کئے ہوں، یا کوئی ضروری اور مفید بحث جو فی الواقع قرآن کے معانی والفاظ سے تعلق رکھتی ہو، بیان کرتے تھے، اس لئے ان کے وعظ سے سامعین کو بے انتہاء فائدہ ہوتا تھا، اور نہایت مفید کام کی باتیں اور مسائل لوگوں کو معلوم ہوتے تھے۔

مذکورہ بالا اوصاف کے علاوہ مولانا مرحوم میں وہ اعلیٰ درجہ کی صفات بھی تھیں جو بڑے بڑے مقدس علماء ومشائخ میں بھی نہیں دیکھی جاتیں۔ وہ ان لوگوں سے تھے جن کی نسبت ارشاد ہوا ہے کہ "یجاھدون فی سبیل اللہ ولا یخافون لومۃ لائم" (۲۳) جو کچھ ان کے دل میں تھا وہی زبان پر تھا، جس بات میں خدا اور رسول کی مرضی دیکھی گو سارا زمانہ اس کے برخلاف ہو، ان کو اس بات کے کرنے میں کچھ باک نہ تھا، اور جس امر کو حکم الٰہی کے خلاف سمجھا، گو کہ ساری برادری اور کنبہ اس کو اچھا جانے، وہ ہمیشہ اس کے مخالف رہے، اور جہاں تک ممکن ہوا اس کے مٹانے میں کوشش کی۔

انہوں نے شادی وغمی کی تمام بیہودہ رسمیں، یک قلم اپنے ہاں موقوف کردیں، بلکہ بعض لغویات تمام برادری اور کنبے سے موقوف کرادیں، مگر جیسا کہ حدیث میں آیا ہے: بدأ الاسلام غریبا وسیعود غریباً فطوبی للغرباء" (۲۴) ان کی ہدایتوں اور نصیحتوں پر زیادہ تر عمل کرنے والے ان کا حکم بجالانے والے

(۲۳) سورۂ مائدہ پارہ:۶ آیت:۵۴

(۲۴) حضرت ابو ہریرۃؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد نقل کرتے ہیں کہ اسلام کا آغاز کسمپرسی کی عالم میں ہوا تھا اور پھر اس کا ایسا ہی حال ہوجائے گا۔ لہذا کس مپرسوں کو مبارک ہو۔

بدأ الاسلام غریبا وسیعود کما بدأ فطوبی للغرباء ..... رواہ مسلم عن ابی ہریرۃ. مشکوٰۃ ص: ۲۹ باب الاعتصام بالکتاب والسنہ.

غریب، اہل حرفہ، کاشتکار اور دکاندار لوگ تھے جو ہمیشہ ان کی خدمت میں حاضر رہتے، آٹھویں روز ان کی مجلس وعظ میں شریک ہوتے اور برسویں دن تراویح میں ان کا قرآن سنتے تھے، ان لوگوں نے صدہا رسوم وبدعات صرف مولانا مرحوم کی ہدایت سے ہمیشہ کے لئے ترک کر دیں۔

وہ صرف زبانی نصیحتوں پر ہی اکتفاء نہ کرتے تھے بلکہ ہمیشہ ترک، رسوم وبدعات اور احیائے سنن میں خود نمونہ بن کر لوگوں کو اس کی طرف مائل کرتے تھے۔

مولانا مرحوم تشخص، تعلّی اور نمود کی باتوں سے نہایت نفرت کرتے تھے، معاملات میں ایسے صاف اور کھرے آدمی دنیا میں بہت کم ہوتے ہیں۔ السیٹ اور لیت ولعل ان کے مزاج میں مطلق نہ تھی، نہ اپنا حق کسی کے پاس چھوڑتے تھے اور نہ دوسروں کے حق میں دست اندازی کرنا چاہتے تھے، آج کا حساب کل پر اور کل کا حساب پرسوں پر کبھی نہ رکھتے تھے۔ انتظام، تدبیر منزل، اوقات کی پابندی، کاموں کی ترتیب، مستعدی واستقلال ان کی خاص صفتیں تھیں، ان کی جزرسی اور کفایت شعاری بالکل مثنوی معنوی کے اس شعر کی مصداق تھی۔

اے بسا امساک کز انفاق بہ

مال حق راجز براہِ حق مدہ (۲۵)

اگرچہ وہ فرائض وواجبات وسنن کے سوا نوافل واوراد وظائف کے زیادہ پابند نہ تھے، مگر جس قدر نوافل یا اذکار کا انہوں نے التزام کرلیا تھا، ان میں بمصداق: احب الاعمال ادومہا کبھی فرق نہ آتا تھا۔

قصبہ پانی پت میں جو اولاد حضرت ابوایوب انصاری صاحب الرحل اور ثانیاً شیخ الاسلام خواجہ عبداللہ پیر ہرات کی چھ سو برس سے آباد ہے (۲۶) مولانا بھی اسی قوم کے ایک رکن تھے (۲۷) اس قوم میں سنی اور شیعہ دونوں مذہب کے آدمی شامل ہیں۔ مولانا مرحوم کو اپنی قوم کے بچوں، جوانوں اور بوڑھوں سے ایسی

---

(۲۵) ملاحظہ ہو: مرأۃ المثنوی قاضی تلمذ حسین ص: ۵۸۱ (طبع اول۔ حیدرآباد۔ دکن)

(۲۶) مختصر معلومات بلکہ اشارات ضروری کے لئے ملاحظہ ہو: تذکرہ رحمانیہ ص: ۲۰-۱۶

(۲۷) مولانا عبدالحلیم انصاری کی اطلاع کے مطابق، یہ خاندان سنہ ۶۷۵ھ (۱۲۷۶ء) میں غیاث الدین تغلق کے دور حکومت میں پانی پت وارد ہوا تھا۔ ص: ۱۱/۱۸

محبت تھی کہ ان کو دیکھ کر باغ باغ ہوجاتے تھے، باوجودیکہ ان کے قوم کے آدمی بہ نسبت اور قوموں کے ان کے فیض صحبت سے بہت کم مستفیض ہوتے تھے، اوران کی خدمت میں کم حاضر ہوتے تھے، بایں ہمہ جب کوئی شخص اپنی قوم کا مل جاتا تھا تو اس سے نہایت مہربانی اور عنایت اور محبت کیساتھ ملتے تھے، اور ہمیشہ دل سے اپنی قوم کی خیرخواہی کا خیال رکھتے تھے۔

محلّہ کی مسجد(ا) جس میں مولانا مرحوم نماز پڑھا کرتے تھے، اس کی مرمت کے لئے روپیہ کی ضرورت تھی، جو انصاریوں کے سوا کسی سے انہوں نے طلب نہیں کیا، البتہ اگر کسی نے غیر قوم کے لوگوں میں سے اپنی خوشی سے کچھ دیا تو اس سے انکار بھی نہیں کیا، اور جو کچھ کمی رہی وہ اپنے پاس سے پوری کی۔ غیر قوم کے لوگوں سے انہوں نے صرف اس خیال سے نہں طلب کیا کہ محلہ کی مسجد کو خود نہ بنانے اور غیر قوموں سے مدد لینے میں ان کی اپنی قوم کو دھبہ لگے گا۔ مسجد کے برابر ایک مکان نواب امان اللہ خاں مرحوم انصاری کا تھا، اس کو ان سے مانگ کر مسجد میں شامل کرلیا اور اس طرح مسجد کو خالص انصاریوں کی مدد سے تیار کرایا۔ یہ بظاہر ایک ادنیٰ بات معلوم ہوتی ہے مگر یہی وہ چیز ہے جس کے نہ ہونے سے روز بروز مسلمانوں کی تمام جماعتیں پراگندہ اور کمزور وضعیف ہوتی جاتی ہیں۔

مولانا مرحوم کی سیدھی سادی اور بے تکلف وضع کو دیکھ کر، ایک اجنبی آدمی ان کو احد من الناس سمجھتا تھا، مگر ہندوستان کے تمام اطراف وجوانب میں ان کے معتقدین ومسترشدین گنتی اور شمار سے خارج تھے۔ ملک کے ہر حصے سے صدہا استفتاء ان کے پاس آتا تھا اور سینکڑوں آدمی بیعت کے لئے ان کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے۔ وہ بظاہر مولویت کے لباس میں تھے مگر درحقیقت بہت بڑے شیخ تھے اور وہ جو کسی بزرگ کا قول ہے کہ:

> "قطب وقت کو پہاڑوں، جنگلوں اور ویرانوں کی تنہائی اور عزت میں ڈھونڈو، بلکہ بازاروں میں، بال بچوں میں، خرید وفروخت میں اور تمام دنیا داری کے تعلقات میں تلاش کرو۔"

سو یہ قول مولانا مرحوم کی شان میں پورا پورا صادق آتا تھا۔ ان کے نزدیک ترک وتجرید کا نام فقر و درویشی نہ تھا، بلکہ دنیا کو مزرعۂ آخرت سمجھنا اور تمام دنیا کے معاملات حکم خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم

(ا) یہ مسجد "بڑوالی مسجد" کے نام سے مشہور تھی۔

کے مطابق طے کرنا اور بے ہمہ و باہمہ رہنا اسی کو درویشی کہتے تھے۔ ان کا حال اس شعر کا مصداق تھا۔

پاک ہیں آلائشوں میں بندشوں میں بے لگاؤ
رہتے ہیں دنیا میں سب کے درمیان سب سے الگ

اگرچہ اخیر عمر میں بسبب ضعف و ناتوانی کے اوقات نماز کے سوا اور وقتوں میں بہت کم باہر نکلتے تھے اور گھر میں ایک علیحدہ بالا خانہ میں رہتے تھے مگر اپنی طاقت اور قوت کے موافق اپنے تمام کام خود ہی سرانجام کرتے تھے۔

مولانا مرحوم دین کے معاملات میں اپنی رائے اور اپنے قیاس کو کبھی دخل نہ دیتے تھے، بلکہ جو کچھ شیوخ اور اساتذہ سے سنا تھا، یا جس طریقہ پر ان کو چلتے دیکھا تھا، یا جس طرح کتابوں میں پڑھا تھا اس سے سرمو تجاوز نہ کرتے تھے۔ تنہائی میں یا مجمع میں اگر کوئی ان سے کچھ مسئلہ پوچھتا تھا اور ان کو اس کا جواب سر دست معلوم نہ ہوتا تھا تو باوجود مرجع خلائق ہونے کے وہ صاف کہہ دیتے تھے کہ اس وقت مجھے معلوم نہیں، جب تک ان کو اپنے جواب پر نہایت اطمینان اور وثوق نہ ہوتا تھا، کبھی زبان سے نہ نکالتے تھے۔

۱۸۵۷ء کے غدر میں وہ باندہ میں تھے، جہاں کے لوگ ان کے نہایت معتقد اور ان کے حکم بردار تھے، تیس چالیس انگریز اور ان کے بچے اور میمیں باغیوں کے خوف سے ان کی پناہ میں آ گئیں، انہوں نے سب کو پناہ دی اور اپنے معتقدین کو حکم دے دیا کہ جہاں تک ہو سکے ان کی حفاظت کرو، اور برابر ان کے کھانے پینے کی خبر لو اور جنہوں نے جان کے خوف سے مسلمان ہونے کا ارادہ ظاہر کیا، ان کو قاعدہ کے موافق مسلمان کرلیا، چنانچہ وہ سب پناہ گیر مولانا مرحوم کے مدرسہ میں امن کے زمانہ تک رہے اور جب غدر رفع ہو گیا تو وہ بخیریت تمام اپنے اپنے ٹھکانے پر چلے گئے۔

ایک روز ان میں سے ایک شخص جو بہت بڑا افسر تھا اپنے اصلی لباس میں مولوی صاحب سے ملنے آیا، انہوں نے اسے مطلق نہ پہچانا، چونکہ وہ شخص بھی مولانا مرحوم کے ہاتھ پر مسلمان ہو چکا تھا اور انہوں نے اس کا نام بھی مسلمانوں سا ہی رکھ دیا تھا، اس نے اپنا وہی نام لیا کہ میں وہ شخص ہوں، اس وقت مولانا نے پہچانا۔ اس یورپین افسر نے کہا کہ آپ اپنے متعلقین کی طرف سے ایک درخواست لکھوا کر مجھ کو دیجئے کہ اتنے یورپین مردوں اور عورتوں اور بچوں نے ہمارے یہاں پناہ لی تھی اور آخر تک مولوی صاحب نے ان

کو ہر ایک آفت اور حملہ سے بچایا، اس کے صلہ میں ہم کو سرکار سے جاگیر یا انعام ملنا چاہئے، مولانا یہ سن کر مسکرائے اور فرمایا کہ میں نے اپنے مذہب کے موافق اس وقت تمہاری حفاظت اور حمایت کرنی ضروری سمجھی تھی، سو اس کے موافق عمل درآمد کرنا میرا فرض تھا، میں یا میری اولاد ہرگز اس کا عوض تم سے یا سرکار سے نہیں چاہتی، تم اس کا خیال نہ کرو۔ یہ سن کر افسر نہایت ادب اور تعظیم سے مولوی صاحب کو سلام کر کے رخصت ہو گیا، اور مولوی صاحب چندروز کے بعد پانی پت چلے آئے۔

مولانا مرحوم کے شاگردوں اور مسترشدوں کی تعداد دائرہ حصر واحصار سے باہر ہے، یہاں تک کہ ان کے بعض جلیل القدر شاگرد عرب میں بھی موجود ہیں (۲۸) ازاں جملہ مولوی حبیب الرحمٰن سندھی بنگالی (ا) نزیل مدینہ جو ایک مدت سے مدینہ طیبہ میں رہتے ہیں اور جن کا تمام مدینہ کے مشائخ وعلماء ادب کرتے ہیں، مولانا مرحوم کے ارشد تلامذہ میں سے ہیں اور ان کا شیخ ہونے کی وجہ سے وہاں کے علماء باوجود عدم ملاقات کے مولانا مرحوم کا نہایت ادب اور تعظیم کرتے ہیں۔

نہایت افسوس ہے کہ پانی پت ایک ایسے بزرگ سے خالی ہو گیا جو نہ صرف اہل پانی پت کے لئے بلکہ تمام مسلمانوں کے لئے باعث فخر تھا، اور جس کا مثل آئندہ زمانہ میں پیدا ہونا محالات عادیہ میں سے معلوم ہوتا ہے۔

فما كان قيس هلكه هلك واحد
ولكنه بنيان قوم تهدما (۲۹)

---

(۲۸) مولانا حبیب الرحمٰن سندھی بنگالی کا تذکرہ مجھے نہیں ملا۔ اس دور کے ایک ممتاز عالم اور درس حدیث میں معروف مولانا حبیب الرحمٰن ردولوی مہاجر مدنی ہیں مگر ان کے قاری عبدالرحمٰن سے تلمذ کا مورخین نے ذکر نہیں کی۔ مثلاً ملاحظہ ہو: الفیض الملک الوهاب المتعالی لمولانا عبدالستار دهلوی مکی۔

(ا) مولانا حبیب الرحمٰن ردولوی مہاجر مدینہ منورہ ص: ۳۹۱/ا الفیض الملک المتعالی

(۲۹) فما كان قيس هلكه هلك واحد
ولكنه بنيان قوم تهدما

یہ حضرت قیس بن عاصم بن سنان رضی اللہ عنہ کے مرثیہ کا شعر ہے، جو عبدہ بن الطیب نے لکھا تھا اس کے متعدد اشعار مختلف مورخین واہل ادب نے نقل کئے ہیں۔ منجملہ ان کے ایک شعر یہ ہے:

عليك سلام الله قيس بن عاصم
ورحمة ماشاء ان يترحما

بقیہ حاشیہ آئندہ صفحہ پر

یعنی قیس کا مرنا ایک آدمی کا مرنا نہ سمجھو بلکہ وہ قوم کی بنیاد تھی جو گرگئی۔

یہ ایک بات عجیب ہے کہ مولانا مرحوم نے انتقال سے تین چار ہفتے پہلے جامع مسجد میں جو درس فرمایا تھا، اس میں زیادہ تر موت کے مسائل یعنی تجہیز و تکفین اور غسل میت وغیرہ تشریح کے ساتھ بیان فرمائے تھے، یہ گویا آخری وعظ تھا، اس کے بعد پھر نوبت وعظ کی نہیں آئی۔

مولانا مرحوم کی ایک مستمرہ عادت یہ بھی تھی کہ اپنا درس ہمیشہ اس کلمہ پر ختم کرتے تھے "باقی بیان ان شاء اللہ تعالیٰ آئندہ ہوگا" مگر اس آخری وعظ میں بجائے اس کے یہ فرمایا کہ: "باقی بشرط زندگی آخری"

عزیزی حافظ اخلاق حسین سلمہٗ اللہ تعالیٰ برادرزادہ راقم نے جو کہ مولانا مرحوم کے شاگردوں اور معتقدوں میں سے ہیں، مولانا مرحوم کی تاریخ وفات قرآن مجید کے اس جملہ سے کہ: لکم اجر عظیم نکالی ہے جس کو الہام کہنا چاہئے، ہمارے نزدیک یہ جملہ متبرکہ ضرور بالضرور مولانا مرحوم کی قبر پر کندہ کرانا چاہئے۔

بقیہ حاشیہ گذشتہ صفحہ کا۔

حضرت قیس بن عاصم تیمی، بنو تیم کے وفد میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اسلام قبول کیا تھا۔

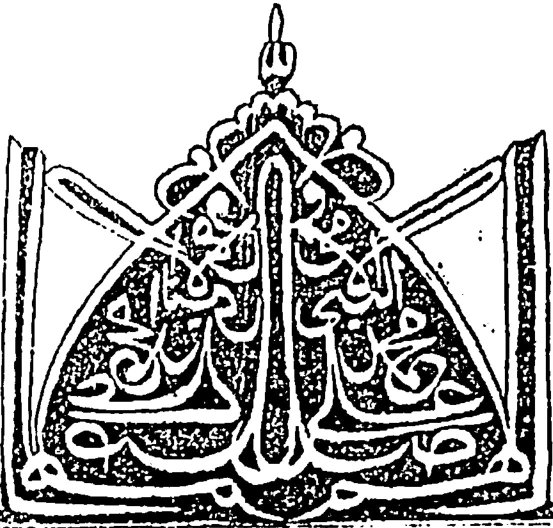
ملاحظہ الاصابہ حافظ ابن حجر ص: ۲۵۲/۳ (مطبعۃ السعادہ۔ مصر۔ ۱۳۸۲ھ) وفیات الاعیان لابن خلکان ص: ۱۰۰ ج: ادار النفاس

(۳۰) مولانا حالی نے اس فقرہ تاریخ کو پسند کیا ہے یہاں تک کہ اس کو الہامی قرار دیا ہے مگر اس سے مولانا قاری عبدالرحمٰن کا سنہ وفات ۱۳۱۴ھ کس پہلو سے کس حساب سے نکلتا ہے۔ میری گرفت میں نہیں آیا۔ واللہ اعلم

قرآن مجید

مع

سبعہ قراءت



سُورَةُ الفَاتِحَةِ مَكِّيَّةٌ وَهِيَ سَبْعُ آيَاتٍ

بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ○ الرَّحْمٰنِ
الرَّحِيْمِ ○ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ○
اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ○ اِهْدِ
نَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ○ صِرَاطَ
الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ۵
غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ
وَلَا الضَّآلِّيْنَ ○

سورة البقرة مدنية وهي مائتان وست وثمانون آية

بسم الله الرحمن الرحيم ۝

الٓمّٓ ۝ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ ۛ فِيْهِ ۛ
هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ۝ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ
وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ
يُنْفِقُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ
أُنْزِلَ إِلَيْكَ وَمَآ أُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ
وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ ۝ أُولٰٓئِكَ
عَلٰى هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم - تمام تعریفین اوسیکو لائق ہین کہ اپنے بندون کو بلا احسان ومنت کس کس طرح کی
کی نعمتون سے مشرف فرماتا ہی چنانچہ یہہ نعمت بے بہا بھی صرف اپنے ہی فضل واحسان سے ذریعہ اسباب مہیا فرماکر بدست اینجانب حقیر
عبدالعلیم ابن قاری عبدالرحمن صاحب پانی پتی مد ظلہ انجام کو پہنچائی - جاننا چاہئے کہ یہہ کلام اللہ پہلی بڑی تقطیع پر جلی قلم سے طبع
کرانا شروع کرایا گیا تھا اور اوس مین ترجمہ شاہ رفیع الدین صاحب کا علاوہ قراۃ کے بہی بمشورہ بعض احباب داخل کر دیا گیا تھا مگر حضرت قبلہ
والد اس ترجمہ کو ناپسند کرتے تھے اور فرماتے ہین کہ یہہ کلام اللہ سبعہ ہے اسمین ترجمہ کی ضرورت نہین ہے ترجمہ کے کلام مجید بیسیون طبع ہو چکے
ہین اور ہوتے ہین بلکہ مقصود اس سے اظہار سبعہ قراۃ ہے جو کہ اسوقت بالکل متروک اور قریب معدوم ہے چنانچہ وہ کلام اللہ بڑی
تقطیع والا بسبب چند وجوہ کے طبع ہونا موقوف رہا اس اثنا مین شہرہ اس کلام مجید کا ہو ہی چکا تھا اور تمام جوانب سے شایقان اس
کلام اللہ کی تاکید کرتے تھے اور دن رات ہر طرف سے یہی صدا آتی تھی کہ جسطرح ہو سکے اس کلام مجید سبعہ کو طبع کرا کر جاری کرو کیونکہ اکثر شایقان فن قراۃ کو اور بعض کو کلام مجید کی سخت دشواری ہوتی ہے اور تعلم مین بہت دقت پیش آتی ہے اسوقت مین ایسے کلام مجید کا چھپوانا فرض
سمجہنا چاہئے - پس بضرورت یہہ کلام مجید چہوٹی تقطیع پر چھپوایا گیا کہ اکثر شایقان اسکو بسہولت اور کمی قیمت سے خرید کر سکین اسکے علاوہ
اوائل مین چند مسائل ضروری جو کہ اس کلام اللہ کو لابد تھے طبع کرا کر لگا دئے گئے ان مسائل کو بغور دیکھنے اور پڑہنے سے کلام مجید بہت سہل ہو جاویگا
الغرض ضروریات اسکی اسکے ساتھ طبع کرا دی گئی ہین مگر البتہ ترتیب سبعہ جو کہ بڑے کلام مجید پر رکھی گئی تھی وہ نہین ہے اگر اوس ترتیب کی کسی صاحب کو
خواہش ہو تو وہ دو سپارے بڑی تقطیع والے ہمراہ اس کلام مجید کے منگا لین انمین پورا پورا قاعدہ مع الحجج تحریر ہے وہ تمام کلام مجید مین امداد
دے سکتی ہے اس کلام اللہ کا طریق خواندگی نصف سیپارہ پڑہنے سے آسکتا ہے اور پہر استعداد اسکے پڑہنے کی ہو جاتی ہے - اس زمانہ
مین اگرچہ اکثر کلام اللہ طرح طرح کے چھاپہ خانے مین منقش بھی ہوتے ہین مترجم بھی ہوتے ہین مگر اس فن کی طرف ابتک کسی صاحب نے
ہمت اپنے دل مین نہ لائی اور نہ جانا کہ یہہ فن کسقدر خدمت طلب ہے - چنانچہ اب یہہ کلام اللہ بفضل الٰہی طبع ہوکر شائع ہوا ہے شاید اب
اس فن کی طرف توجہ ہو اس سے معلوم ہو جاویگا کہ یہہ فن کسقدر خدمت طلب ہے چنانچہ اب یہہ کلام اللہ بفضل الٰہی اگر عنایت الٰہی شامل حال
رہی اور خدا نے بہی چاہا تو وقتاً فوقتاً یہہ عاجز بہی اسکی خدمت سے بہرہ یاب ہوتا رہیگا - اس زمانہ مین اکثر بسبب آزادی کے اسقدر میدان
جرأت کا وسیع ہو گیا ہے کہ بیان مشکل ہے چنانچہ بعض نامعان وہ ہیں اس زمانہ کے اس کلام اللہ مین جو کہ آنحضرت سے ابتک مسلسل چلا آتا ہے
اور جسکی حفاظت کا خود خدا تعالی بقول انا نحن نزلنا الذکر وانا لہ لحافظون کے وعدہ فرمایا ہے بسبب حرص کے تحریف اور تنقیح شروع کر دی اور
اپنے آپ کو ملقب ساتھ تنقیح کلام اللہ کے بنا دیا - کیا ہوتا ہے حق باطل ہمیشہ ظاہر ہو جاتا ہے شاید اوس منقح نے کہین نام سبعہ قراۃ
کا سن پایا ہوگا اسی خیال سے چند اختلافات مثل فرش الحروف کے قرآن روایت حفص کے حاشیہ پر لکھ دئے اور اپنے نزدیک اونکو

قرآن سبعہ قرار دیکر یوح کلام مجید پر لفظ سبعہ کا ثبت کرادیا جس سے تمام مسلمان گمراہ ہونگے - اس شخص کے نزدیک سبعہ قراءۃ معلوم ہوتا ہے کچھ واقعہ اور اصلیت نہیں رکھتی از ابتری زمانہ - آہ - آہ نعوذ باللہ من شرور انفسنا - جاننا چاہئے کہ یہ کلام اللہ سبعہ ابھی تک کہیں چھاپا نہیں گیا اور نہ کسی صاحب (ادہر توجہ فرمائی اگر رمضان کے چھپنے ہونیکے علاوہ کوئی کلام اللہ سبعہ کا کسی صاحب کی نظر سے گذرے اوسکو اوسکے مقابل کرکے دیکھ لینا چاہئے اگر اسکے مطابق ہو اور تمام روایات میں پورا ہے تو صحیح سمجھنا چاہئے ورنہ اسکو کلام مجید سبعہ نہ سمجھنا چاہئے - اس کلام اللہ کا پڑھنا پڑھانا حاصل کرنا بہ نسبت ایک روایت کے گونہ ہا اجر و ثواب رکھتا ہے کیونکہ یہ کلام چودہ روایت متواترہ پر شامل ہے اور عام کلام مجید صرف ایک روایت حفص پر شامل ہوتے ہیں تو اس کلام اللہ کا حاصل کرنا اور خدمت کرنا چہار دہ گونہ ثواب رکھتا ہے تکمیل کلام اللہ کی انہیں ہفت قراءۃ سے ہی بغیر انکے کلام اللہ جامع اور شامل نہیں ہوتا یہ بھی افسوس کہ اس کلام اللہ کو عاجز بسبب چند موانعات کے ان خوبیوں سے مزین نہ کر سکا کہ جنکا ارادہ دل میں بھرا ہوا تھا اور وقت اسکو سمجھا اگر مشیت ایزدی شامل حال رہی تو کیا عجب ہے کہ انشاء اللہ دوسرے کلام مجید میں بر آئے شائقین منتظر رہیں - بر رسولان بلاغ باشد و بس

تنبیہ

بدانکہ از احادیث صحیح ثابت شدہ است کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم بوقت ختم قرآن چوں بر سورۃ والضحیٰ میرسید در آخر ہر سورۃ تا آخر قرآن تکبیر گفت و صیغہ آن اللہ اکبر و نزد بعضے لا الہ الا اللہ و اللہ اکبر ست و نزد صاحب تیسیر و شاطبی و دیگر اہل کتب قراءۃ مثل صاحب ہدایہ و کافی و عنوان و مکی و غیرہم از آخر والضحیٰ و بقول بعضے از آخر واللیل باید گفت و شہرت ثبوت آن بروایت بزی از بزی شاگرد امام ابن کثیر ست و بعضے از قنبل نیز روایت کردہ اند و در شذوذ از سوسی نیز مرویست و از باقی قراء وجہ نیست در بین باب نیست اما اہل ادا برائے ہمہ قراء آنجا با تکبیر خوانند اگرچہ سنیت آن بروایت بزی فقط شہرت یافتہ است و گوید فقیر کہ چون عمل رسول صلی اللہ علیہ وسلم ثابت شد لازم ست کہ بہمہ مسلمین سنت باشد و لہذا فقیر برائے ہمہ قراء ذکر میکند و باید دانستہ کہ بحسب وصل و وقف بر آخر سورۃ و تکبیر ہشت وجہ حاصل میشود ہفت ازان معتبر و یکے متروک ست وان وصل آخر سورۃ بتکبیر و وصل تکبیر بہ بسملہ و وقف بر آخر بسملہ ست و ہفت وجہ مقررہ در ہر سورۃ ذکر کنیم و در صورۃ وصل آخر سورۃ بتکبیر اگر آخر سورۃ ساکن مثل فحدث یا تنوین مثل توابا و لخبیر و یا کول مثل ان ساکن و تنوین را کسرہ دادہ باید خواند و مفتوح الآخر مثل الحاکمین و مضموم الآخر مثل ط، ابتر و مکسور مثل النعیم در الوصل فتح و کسرہ و ضم باللہ باید خواند و ہمچنین اگر در آخر سورہ ہائے ضمیر مثل یرہ باشد اضمہ ہا را باللہ وصل کنند و در صورۃ قراءۃ متصل با تکبیر ساکن الآخر را و متحرک الآخر نیز ہا او ہا ضمیر را ایجاد خود مدارند

احتیاط کنند در وصل سورتین بے بسملہ نخوانند و سبب ورود تکبیر آن بود کہ چون مشرکان از پیغمبر علیہ السلام
از حقیقت روح و قصہ اصحاب کہف و ذوالقرنین سوال کردند فرمود کہ فردا گویم و انشاء اللہ نگفت چند روز وحی
نیامد مشرکان گفتند خدا ایستاے محمد را رہا کرد و دشمن گرفت آنحضرت ازین سخن غمناک شد و بعد چند روز جبرئیل با سورۂ [illegible]
مژدہ آمد آنحضرت خوش شد و بعد قراءۃ والضحیٰ تکبیر گفت و شکرانہ و فقیر از آخر ہمین سورہ ہمہ وجوہ می گوید تا ہیچ کسی اختلاف باقی نماند

بسم اللہ الرحمن الرحیم

سند قرآن مجید سبعہ قراۃ این احقر کہ مسمی است بسلسلۃ الذہب

الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علی رسولہ محمد وآلہ وصحابہ اجمعین اما بعد میگوید عاجز فقیر الی رحمت ربہ الکریم عاصی
عبد العلیم کہ خواندہ ام قرآن مجید و فرقان حمید از ابتداء از فاتحہ تا انتہاء سورۂ ناس بالقراۃ سبعہ کہ ہمہ متواترہ لبقاعدۃ جمیع الجمع
از حضرت قبلہ صوری و کعبہ معنوی جناب الماجد قاری مولوی حافظ محمد عبد الرحمن صاحب پانی پتی سلمہ اللہ تعالیٰ اللہم احفظہ عن فتن
الدنیا و اصطفاہ عن نسلہ وجودہ الی جوارک یا ارحم الراحمین در سنہ ۱۳۰۹ یکہزار و سہ صد و نہ من ہجرۃ صلی اللہ علیہ وسلم و این حضرت زاد
فرمودند بالقراۃ سبعہ کہ برہ از حضرت مولوی قاری حافظ امام الدین صاحب امروہوی قدس سرہ در سنہ ۱۲۴۸ یکہزار و دو صد و چہل و ہشت
ہجری و ایشان بالقراۃ سبعہ خواندند از حضرت مولوی محمد عرف مولوی کرم اللہ دہلوی در سنہ ۱۲۱۲ یکہزار و دو صد و [illegible] ہجری
قدس سرہ ایشان بالقراۃ سبعہ خواندند بر حضرت شاہ حاجی عبد المجید صاحب قادری المصطفوی و او خواندند بر حاجی الحرمین الشریفین
الشیخ الکامل قاری غلام مصطفی صاحب ابن محمد اکبر تھانیسری و او خواندند بالقراۃ سبعہ بر غلام محمد گجراتی و او خواندند بالقراۃ سبعہ بر حافظ
عبد الغفور قاری مشہور در دہلی و او خواندند بالقراۃ سبعہ از خدمت شیخ القراء شیخ عبد الخالق منوفی و او خواندند بالقراۃ سبعہ بر شیخ
البقری و او بر شیخ عبد الرحمن یمنی و او بر والد خود شیخ شحادہ یمنی و بر شہاب احمد عبد الحق سنباطی و شیخ شحادہ خواندند بر شیخ ابی النصر طبلاوی
و او بر شیخ الاسلام زکریا و او بر برہان قلقیلی و بر رضوان ابو النعیم عقبی و این ہر دو خواندند بر امام القراء و المحدثین محرر الروایات
و الطرق ابو الخیر محمد ابن محمد بن علی بن یوسف الجزری الشافعی صاحب کتاب النشر فی قراۃ العشر و لہ طرق کثیرۃ جدا ذکرہا فی النشر
و منہا مسلسل تحفۃ مسلسل بالتلاوات و غیرہا من صفحات التیسیر فلنقتصر ہہنا علی تلک السلسلۃ پس گفتہ است جزری کہ خواندم تیسیر
و قرآن بر حسب آن از اول قراۃ تا آخر آن بر امام عالم صالح قاضی المسلمین ابو العباس احمد بن شیخ الامام ابی عبد اللہ الحسین ابن سلیمان
ابن فزارۃ الحنفی در مدرسہ دمشق و او گفت کہ خواندہ ام تیسیر و قرآن بحسب آن بر والد خود و گفت والد من کہ خواندم تیسیر و قرآن را
بر حسب آن بر شیخ امام ابی محمد القاسم ابن احمد بن موفق اللورقی و او گفت کہ خواند تیسیر و قرآن بر حسب آن بر ابی العباس
احمد بن علی بن یحیی بن عون اللہ الحصار و او بر ابی عبد اللہ محمد بن سعید بن محمد المرادی و او بر ابی عبد اللہ محمد بن ایوب ابن [illegible]

ما شاء اللہ لا قوۃ الا باللہ

بفضل مفضال کبریائی از افادات جناب مولوی قاری عبدالرحمن صاحب پانی پتی در قواعد تجوید تصنیف



حسب فرمائش جناب مولوی حافظ عبدالسلام صاحب خلف الصدق جناب مصنف علیہ الرحمۃ

[illegible]

امام القراء و شیخ المعلمین، حضرت قاری مصلح الدین پانی پتیؒ

اقتباس، مختصر التجوید تالیف مولانا قاری قادر بخش پانی پتیؒ

مؤلفہ ۱۲۴۲ھ ــــ مکتوبہ ۱۲۵۳ھ

اور یہ ناچیز بندہ پروردگار کا، قادر بخش پانی پتی، بدترین ان عواموں کا ہے کہ جن کو ضعیف ہمت بیان کیا ہے، اور اس گنہ گار نے وقت خورد سالگی کے قرآن مجید پڑھا تھا، اپنے استاد قاری مصلح الدین صاحب پانی پتیؒ سے، روشن کرے اللہ تعالیٰ نور معرفت سے خواب گاہ ان کی، اور بلند کرے درجے ان کے، اور قائم رکھے اولاد ان کی ـــــــ آمین!

اور انہوں نے بسبب خدمت کاملوں کی اور دیکھنے کتابوں کے، علم تجوید میں اس قدر کمال حاصل کیا تھا کہ گویا ذات محامد الصفات ان کی، خود علم تجوید بن گئی تھی۔

اور یہ ناچیز بندہ جو اوصاف کمال ان کے بیان کرے تو ایک اور سلسلہ تیار ہووے، بلکہ حقیقت تو یوں ہے کہ اس فقیر کے حوصلہ سے باہر ہے کہ کتابت میں لاوے، یا زبان سے بیان کرے۔ چنانچہ اکثر اوقات زبان فیض بیان اپنی سے فرمایا کرتے تھے کہ ستر برس شبانہ روز خدمتِ قرآن مجید کے، میں حاضر رہا ہوں، تو اس قدر مایہ حاصل کیا ہے اور وقت تعلیم کلام اللہ کے ہر شاگرد اپنے سے، بلکہ ہر قرآن خواں سے، اکثر یہی ارشاد فرمایا کرتے تھے کہ: "وَرَتِّلِ الْقُرآنَ تَرتِيلا"

فرمایا حضرت مرتضیٰ علی کرم اللہ وجہہ نے معنی ترتیل کے یہ ہیں کہ تجوید حروف کی اور پہچاننا

وقفوں کا، چنانچہ وقت نزع کے بھی یہی حالت پیش آئی، کہ فرزند ارجمند نامی اپنے سے، یعنی قاری عبید اللہ سلمہٗ (ا) سے ارشاد فرمایا کہ کسی جگہ سے قرآن مجید پڑھو، چنانچہ انہوں نے موافق ارشاد عالی اس ذات برگزیدہ صفات کے، "**سورة الملک**" اور ایک دو سورہ اور بھی پڑھی، ان سورتوں کا متن بکمال حضوری دل کے سنا اور نہایت لذت یاب ہو کے فرمایا کہ: "**وَرَتِّلِ القُرآن تَرتِيلًا**" اور بعد اس کے کہ وقت انتقال روح مبارک ان کی کا نزدیک تھا فرمایا، کہ ستر برس محنت آج کے دن کے واسطے، بلکہ مخصوص اس دم کے واسطے کی تھی میں نے، سو اللہ تعالیٰ نے اس وقت اپنے فضل وکرم سے اس کا ثمرہ عطا فرمایا، یعنی کلام اللہ بصورت زیبا ہمراہ میرے موجود ہے، اور یہ آیت پڑھی:

"**ذَالِکَ فَضلُ اللّٰهِ يُوتِيهِ مَن يَّشَاءُ وَاللّٰهُ ذُوالفَضلِ العَظِيم**"

بعد اس کے کلمۂ شہادت زبان مبارک پر جاری ہوا، اور مرغ روح مبارک ان کی نے، قفص عنصری سے جانب علیّین کے پرواز فرمائی۔

مختصر التجوید ــــــ قلمی مکتوبہ ۱۲۵۳ھ
بقلم: محمد امیر الدین ساکن کیرانہ مظفر نگر، در بھوپال
ورق: ۱۲ الف، ب۔ ورق: ۱۳ الف

(ا) قاری عبید اللہ عرف قاری لالہ پانی پتی، رحمہ اللہ رحمۃ الابرار الصالحین ہندوستان کی متأخر تاریخ کے مایہ ناز قاری اور مجدد تجوید و تصحیح قرآن مجید، شمالی ہند کے اکثر حصہ میں گذشتہ دو سو برس میں تجوید کے احیاء اور خدمت و فروغ تعلیم قرآن مجید میں قاری صاحب کا غیر معمولی حصہ ہے۔ فرحمہ اللّٰہ ورضی عنہ　　　　وفات: ۱۲۸۳ھ

حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ کے

حالات اور علمی کمالات، اجمالی تعارف

(شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ کی ایک کمیاب اور نادر تحریر)

تمہید اور حواشی: نور الحسن راشد کاندھلوی

شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن دیوبندی (ولادت: ١٢٦٨ھ/١٨٥١ء) وفات ١٨ربیع الاول ١٣٣٩ھ/ مطابق ٣٠نومبر١٩٢٠ء، سہ شنبہ کی جلالتِ ان ، وفورعلم، دینی علمی سیاسی خدمات، دارالعلوم کی مسند صدارت اور دوسرے کمالات روز روشن کی طرح عیاں ہیں محتاج بیان نہیں۔ حضرت موصوف پر کئی کتابیں اور پچیس تیس اچھے مضامین لکھے گئے ہیں اور یونیورسٹیوں میں تحقیق بھی ہوئی ہے اور مختلف پہلوؤں سے حضرت مولانا کی شخصیت اور کمالات کا تعارف کرایا گیا ہے، لیکن حضرت موصوف کے متعلق چند اہم اور قابل قدر تحریریں ایسی بھی ہیں جواب تک عموماً متعارف نہیں، حضرت شیخ الہند پر لکھے گئے مضامین اور تحریروں کی فہرست میں ان کا ذکر نہیں آتا، حالاں کہ یہ غیر متعارف تحریریں اور مضامین کئی طرح سے اہم اور لائق توجہ ہیں:

(١) ان میں حضرت موصوف کے کچھ ایسے حالات وکمالات کا ذکر ہے جس کا دوسری تحریروں میں بالکل ذکر نہیں آیا، یا مجمل تذکرہ ہے۔

(٢) ان کے لکھنے والے اپنی الگ الگ حیثیتون کے باوجود ایسے بلند مقام اور معتبر اصحاب ہیں کہ ان کی تحریریں اور اطلاعات (حضرت شیخ الہند کے حوالہ سے) دستاویز اور سند کی حیثیت رکھتی ہیں۔

(٣) ان لکھنے والوں نے حضرت کو کچھ ایسے زاویوں سے دیکھا ہے جن کا بعد والوں اور دور سے دیکھنے والوں کو ہرگز علم اور اندازہ نہیں ہوسکتات۔

منجملہ ایسی نادر تحریرون کے ایک اہم مضمون شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کا ہے۔

حضرت مولانا کی متعدد تحریروں میں حضرت شیخ الہند کا تذکرہ ہے اور سب ہی جانتے ہیں کہ حضرت مدنی کی زندگی شیخ الہند کی زندگی کا ایک پرتو اور تصویر تھی اور حضرت مولانا کی منجملہ اور خدمات کے ایک بڑا کام تذکار شیخ الہند کو تازہ رکھنا اور ان کی ہمہ وقت یاددہانی تھی، مگر حضرت شیخ الہند پر لکھی گئی حضرت مولانا مدنی کی تحریروں میں سے ایک تحریر ایسی بھی ہے، جو عموماً غیر متعارف اور حضرت شیخ الہند پر لکھے گئے مضامین کے مجموعوں میں شامل نہیں اور متعلقہ تحریرات و مضامین میں اس کا حوالہ بھی بہت کم ہے، حالانکہ یہ تحریر حضرت شیخ الہند پر لکھے گئے مضامین و تحریرات میں بعض پہلوؤں سے منفرد اور ایک یادگار تحریر ہے۔

الف: اس میں حضرت مدنی نے شیخ الہند کی سیاسی زندگی اور خدمات کے متعلق ایک حرف بھی نہیں لکھا، جب کہ حضرت مدنی یہ تحریر لکھنے سے پانچ سال پہلے سفر نامہ اسیر مالٹا لکھ چکے تھے (۱) (جو سفر مالٹا کی تفصیلی روداد، شیخ الہند کی سیاسی تحریک پر اہم دستاویز اور مستند مآخذ ہے) بلکہ حضرت کی مالٹا کی اسیری اور قیام کی وجہ اور بڑا مقصد شیخ الہند کے اوقات کو ترجمہ قرآن شریف کے لئے فارغ کرانا قرار دیا ہے اور لکھا ہے کہ:

> ''ہندوستان میں عرصہ دراز تک (یہ) کام کرتے رہے مگر ہجوم خلائق اور کثرت واردین واشغال نے جب کہ تکمیل نہ ہونے دی، تو قدرت نے مالٹا میں غالباً اسی کام کے لئے ڈال دیا، جہاں بالکل فرصت ہی فرصت تھی''

ب: شیخ الہند کے تعلیمی سفر، ذوق عبادت و تلاوت کا خاص انداز میں ذکر کیا گیا ہے، جس میں بعض معلومات ایسی ہیں جو اور تحریروں میں شامل نہیں۔

ج: شعر و ادب سے دلچسپی کا بھی خاصے اہتمام سے ذکر کیا گیا ہے۔

مقطع میں آپڑی ہے سخن گسترانہ بات

آج کل ہمارے بعض حلقوں میں اردو شعر و ادب سے رابطہ ناپسندیدہ سمجھا جاتا ہے، اور اس کے ذوق کی حوصلہ شکنی کی جاتی ہے، حالاں کہ یہ خیال بالکل غلط، دین کی تحریری خدمات کے راستہ میں ایک بڑی رکاوٹ اور اکابر علماء کے معمول کے خلاف ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ

---

(۱) سفر نامہ اسیر مالٹا کی تالیف یکم ربیع الاول ۱۳۴۰ھ (۳ نومبر ۱۹۲۱ء) کو مکمل ہوئی اور اسی وقت (نومبر ۱۹۲۱ء میں) پہلی مرتبہ سوراج پرنٹنگ پریس دہلی سے محمد مہدی عثمانی ناظم خلافت عثمانیہ دارالاشاعت والتجارت دیوبند نے شائع کرائی۔ اس کے بعد دو طباعتیں دارالعلوم دیوبند کے افغانی طالب علموں کی کوشش سے چھپیں۔ یہ تینوں طباعتیں ہمارے ذخیرہ میں موجود ہیں۔

شعروسخن کا وسیع گہرا رچا ہوا ذوق، اسلامی علمی زبانوں کے ادبی سرمایہ پر عالمانہ نظر، ان کے اسالیب نثر اور لغت وقواعد سے بھرپور واقفیت، قدیم علماء کا خاص وصف اور طرۂ امتیاز رہا ہے، ہمارے متعدد بڑے علماء اور اکابر جس طرح عربی فارسی زبانوں پر عالمانہ فنی نظر رکھتے تھے اور ان کی لسانی فنی خصوصیات سے باخبر تھے، اسی طرح اردو زبان کے قواعد اور شعر وادب کے مطالعہ میں بھی ممتاز تھے اور اس کے لئے بھی ویسا ہی اہتمام کرتے تھے جس طرح اور موضوعات اور علوم وفنون کے جاننے اور سیکھنے کے لئے ہوتا تھا، یہاں تک کہ متعدد محدثین اور اکابر علماء اردو زبان ومحاورات میں سند سمجھے جاتے تھے (۱) اور ان کی رائے اہل نظر کے اختلافات میں فیصل اور حکم ہوتی تھی، منجملہ اور علماء کے شیخ الہندؒ کو بھی اس ذوق سے خاص حصہ ملا تھا۔

حضرت مدنی نے لکھا ہے کہ شیخ الہند کو اردو کے ممتاز شعراء اور اساتذہ کا اکثر کلام یاد تھا اور کبھی کبھی مجلس جمتی تو گھنٹوں شعر وسخن کا سلسلہ رہتا تھا، یہی نہیں بلکہ شیخ الہند ممتاز شعراء اور سخنور اصحاب سے ملنے جلنے کا بھی اہتمام کرتے تھے، شعروسخن اور زبان کے فنی نکات جاننے اور ادبی موضوعات سے بہتر واقفیت اور معلومات کا شوق ان صاحبان کے پاس لے جاتا تھا، اس میں ہندو مسلمان کا بھی کچھ امتیاز نہیں تھا بلکہ جس ذوق وشوق سے اردو کے مسلمان اساتذہ اور شاعروں سے استفادہ کرتے، اسی دلچسپی کا اظہار غیر مسلم اہل کمال سے ملاقات میں بھی ہوتا تھا۔

یہ واقعہ اہم اور قابل ذکر ہے کہ: ایک مرتبہ غالب کے عزیز ترین شاگرد اور خاص مکتوب الیہ (مرزا) ہرگوپال تفتہ (مرزا کا خطاب غالب نے دیا تھا) ایک غیر مسلم گھرانے کی ایک تقریب میں دیوبند آئے تھے، جب شیخ الہند کو ان کے دیوبند آنے کی اطلاع ملی تو اپنی جلالت شان اور علمی رفعت ومقام کے باوجود چند اہل ذوق کو ساتھ لیکر تفتہ سے ملنے کے لئے ان کی قیام گاہ پر گئے اور وہاں (حضرت مدنی کے الفاظ میں) "دن بھر شعروشاعری کا چرچا رہا"

علمائے کرام کی اردو زبان وادب سے وسیع واقفیت اور گہری دلچسپی کا ہی اثر ہے کہ ان حضرات کی تصانیف اور ترجمے آج تک دستاویز اور سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں، ایک جانب ان کا علمی استدلالی مقام بے پناہ ہے، دوسری طرح ان کی ادبی لسانی حیثیت معتبر ہے، بعض حضرات کی تحریروں پر زبان کی قدامت

(۱) مثلاً قدیم علماء میں حضرت شاہ عبدالعزیزؒ حضرت شاہ عبدالقادرؒ اور بعد کے عہد میں نامور محدث ومحقق علامہ ظہیر احسن شوق نیموی مؤلف آثار السنن بہت ممتاز ہیں، اور بھی متعدد بڑے علماء کے نام لئے جاسکتے ہیں، مگر نمونہ اور ثبوت کے لئے یہی بہت ہیں۔

کا کچھ اثر ہو تو ہو لیکن لسانی سقم اور زبان کے قواعد ولغات سے ناواقفیت کا الزام ان حضرات کی تصانیف وتحریروں پر مشکل سے ہی آسکتا ہے۔ بدقسمتی سے ایک آج کا دور ہے کہ ہمارے حلقوں میں مروج زبانوں خاص طور سے اردو کے معیاری ادب، لسانی شعری بحثوں اور اہل نظر سے استفادہ کی بات خواب وخیال ہو کر رہ گئی ہے، یہی نہیں بلکہ اس کو معیوب یا شاید گناہ سمجھا جاتا ہے، اسی لئے ایسی تحریریں اور لکھنے والے عام ہو رہے ہیں جن کا ایک ایک صفحہ اردو سے ناواقفیت کا نوحہ خواں ہے۔

د: اس تحریر سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت شیخ الہند نے ترجمہ قرآن کی تکمیل کے لئے کس قدر مشقت برداشت کی ہے اور کس قدر محنت فرمائی ہے، اور اردو شعر وسخن کا جو وسیع سرمایہ حضرت نے اہل کمال سے حاصل کیا تھا اس نے ترجمہ قرآن کریم میں کس طرح شیخ الہند کی مدد اور رہنمائی کی۔

ہ: حضرت شیخ الہند کا ترجمہ قرآن کریم اگرچہ اردو کے بہترین ترجموں میں سے ہے اور آج کل غالباً مقبول ترین ترجمہ ہے، اس کی حضرت مدنی کی نظروں میں جو قدر ومنزلت ہوگی اس کا ہم کم سواد اندازہ بھی نہیں کر سکتے، مگر اس کے باوجود حضرت مدنی نے صاف لکھ دیا ہے کہ:

> "ہم کسی طرح بھی یہ دعویٰ نہیں کر سکتے کہ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کا ترجمہ قطعی طریقہ پر ہر جگہ خطاؤں سے مبرا ہی ہے"

و: حضرت مدنی کی زیر تعارف شیخ الہند کے ترجمہ قرآن کریم "موضح الفرقان" کی تمہید اور سب سے پہلی طباعت میں شامل ہے۔ اس نسخہ کے شروع میں مولانا مجید حسین کی تمہید (گذارش طابع وناشر) ترجمہ قرآن مجید پر علمائے ہند کی رائیں، قطعات تاریخ، بدرالحسن جلالی مرادآبادی مدیر "مدینہ" بجنور کا مضمون (عرض نیاز بدر) درج ہیں، اسی میں حضرت مدنی کی یہ تحریر بھی شامل ہے، جس کا عنوان یہ ہے:

تقریظ

از قلم سعادت رقم فخر العلماء متقدانا حضرت مولانا حسین صاحب مدظلہ العالی

جانشین حضرت شیخ الہند

حضرت مدنی نے یہ مضمون یا تقریظ ۲ر شعبان المعظم ۱۳۴۲ھ/۱۶ر فروری ۱۹۲۶ء میں مکمل کی، اس زمانہ میں (۱۳۴۲ھ، ۱۹۲۴ء سے ۱۳۴۷ھ ۱۹۲۸ء تک) حضرت سلہٹ میں بحیثیت شیخ الحدیث قیام فرماتے۔

یہ تحریر باریک قلم سے بڑے سائز (لمبائی ۲۷ سینٹی میٹر، چوڑائی ۲/۱-۱۷ سینٹی) کے دو صفحوں میں آئی ہے۔

ز: حضرت کی یہ تحریر ترجمہ شیخ الہند "موضح الفرقان" کی سب سے پہلی اشاعت میں شامل ہے۔ راقم سطور کو اس طباعت کے علاوہ ترجمہ شیخ الہند کی دس علیحدہ علیحدہ اشاعتوں سے استفادہ کی سعادت ملی ہے، مگر ان میں سے کسی میں بھی یہ مضمون موجود نہیں، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ مضمون (غالباً) ایک ہی مرتبہ چھپا ہے، اس لئے کم یاب اور تقریباً غیر متعارف ہے۔

ح: ترجمہ شیخ الہند سب سے پہلی مرتبہ ۱۲/ ذی قعدہ ۱۳۴۱ھ (۲۸/ جون ۱۹۲۳ء) کو مدینہ پریس بجنور میں چھپنا شروع ہوا تھا اور تقریباً پونے تین سال کی مسلسل محنت و کوشش کے بعد نصف شعبان ۱۳۴۴ھ (اخیر فروری ۱۹۲۶ء) میں اس کی پہلی طباعت مکمل ہوئی، یہ نسخہ دلآویزی اور حسن طباعت کا ایک عمدہ نمونہ ہے، اگرچہ بعد میں ایک دو ایڈیشن اس سے بھی اچھے چھپے ہیں مگر اس نسخہ کی خصوصیات اور امتیازات اپنی جگہ ہیں۔

ط: تمہید حواشی اور ضمنی عنوانات کا اضافہ راقم سطور نے کیا ہے۔ حواشی میں حضرت شیخ الہند کی سوانح کے بعض متعلقات اور حضرت نانوتویؒ کے شاگردوں کے (جو شیخ الہند کے ہم سبق بھی تھے) نسبتاً مفصل تعارف کی ضرورت تھی، متعارف شخصیات کے تعارف میں تفصیلات کا اہتمام نہیں کیا گیا۔

ی: اصل مضمون میں دو تین جگہوں پر غالباً سہو کاتب سے ایک دو حرف رہ گئے تھے، اندازہ سے اس کی تکمیل کر دی گئی ہے، اضافہ کئے گئے الفاظ امتیاز کے لئے قوسین ( ) میں لکھے ہیں۔

راقم سطور اس اہم تحریر سے استفادہ اور اس سلسلہ کی معلومات کے لئے (مولوی مجید حسین صاحب کے پوتے) جناب منیر اختر صاحب بجنوری کا ممنون ہے۔ موصوف نے حضرت شیخ الہند کے ترجمہ کے سلسلہ میں اپنی معلومات اور بھرپور تعاون سے نوازا، اور انہی کی اجازت سے یہ تحریر یہاں شائع کی جا رہی ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کو جزائے خیر اور اجر عظیم عطا فرمائے۔ آمین!

شیخ الہند، حضرت مولانا محمود حسن
کے مختصر اور نادر حالات

شیخ الاسلام، حضرت مولانا حسین احمد مدنی کے قلم سے

تمہید حامداً و مصلیاً و مسلماً! امابعد! فطرت انسانی نے جو جو عجائب و غرائب اس عالم شہادت میں ظاہر کئے ہیں ان میں سے یہ امر بھی ہے، کہ انسان کو اپنے محبوب کے بڑے سے بڑے عیوب بھی نظر نہیں آتے، آنکھیں فقط اس کے محاسن اور کمالات کو دیکھتی ہیں اور نہ صرف معمولی نظر سے دیکھتی ہیں بلکہ غیر معمولی طریقہ پر چھوٹی سی چھوٹی فضیلت محبّ اور دلدادہ کی نظر میں پہاڑ کی طرح دکھائی دیتی ہے، اس کے لئے مدائح اور محامد کے طور پر اور مبالغہ سے بھرے ہوئے قصائد و خطب بھی بہت کم معلوم ہوتے ہیں، دھواں دھار تقاریر بھی اس میدان میں رائی کے دانہ سے چھوٹی دکھائی دیتی ہیں۔ برعکس اس کے دشمن اور مبغوض کے جملہ کمالات خواہ وہ کتنے ہی بڑے کیوں نہ ہوں، آنکھوں کے سامنے بھی نہیں پڑتے اس کے فقط عیوب دکھائی دیتے ہیں، اور یہ بھی نہیں کہ فقط واقعی عیوب دکھائی دیں بلکہ جس طرح سبز عینک سے تمام اشیاء سبز ہی سبز نظر آتی ہیں، اسی طرح بغض و عداوت کی آنکھ حقیقی کمالات اور واقعی فضائل کو بھی معائب ہی کے رنگ میں دیکھتی ہے، کسی واضح سے واضح کمال کا اقرار کرنا عدو اور حاسد کو پہاڑ اٹھالینے سے زیادہ تر گراں معلوم ہوتا ہے، اس کے محامد اور مدائح کے سننے اور دیکھنے سے نہایت ہی زیادہ کلفت اور دل تنگی پیش آتی ہے۔ ولنعم مامثل.

رعین الرضا عن کل عیب کلیلۃ   ولکن عین السخط تبدی المساویا

اگرچہ مذکورہ بالا قاعدہ فطری قانون شمار کیا جاتا ہے مگر حقیقت میں (ایسے) اشخاص بھی ہر زمانہ میں ضرور پائے جاتے ہیں، جو کہ افراط و تفریط کی ناگوار موجوں سے محفوظ رہ کر حقائق کو دریافت اور ظاہر کرتے رہتے ہیں، محبت مفرطہ کے سواحل سے تحقیق و صداقت نے ان کو دور کر کے وسط بحار میں پہونچا کر واقعی دُرر اور اصلی چمکدار لآلی کے معدن تک پہنچا دیا ہے۔

معذرت اور اظہار واقعہ وسیلتی فی الدارین حضرت شیخ الہند حضرت شیخ الہند قدس اللہ سرہ العزیز کے

ترجمہ کے متعلق میرا کچھ لکھنا خواہ وہ کتنی ہی صداقت پر مبنی کیوں نہ ہو مجھ کو زیادہ تر اندیشہ میں ڈالتا ہے کہ بہت سے اشخاص افراط محبت پر محمول فرماتے ہوئے غیر واقعی خیال کریں گے۔ میں جہاں تک غور کرتا ہوں ایسا گمان کرنے والے حضرات ایک بڑے درجہ تک معذور ہیں، ایک نالائق خادم اپنے ولی نعمت اور روحانی وجسمانی آقا، دنیا اور آخرت کے وسیلہ کے متعلق جو کچھ بھی کہے یا لکھے افراطِ محبت سے حسب قاعدہ مذکورۃ الصدر محفوظ نہیں رہ سکتا، اس لئے میں اس مقام میں کچھ بھی خامہ فرسائی کرنا مناسب نہیں دیکھتا تھا، مگر مولانا مجید حسین صاحب (۱) کے اصرار اور اظہار واقعیت کے خیال نے مجبور کر کے چند سچے کلمات لکھوائے ہیں، جن سے ان حضرات کے دماغ پر بھی قدرے روشنی پڑنے کا خیال ہے جو کہ حسب قاعدہ مشہورہ "انظر الی من قال ولا تنظر الی ما قال" (۲) فقط اسی طرف اپنی عنان توجہ منعطف کرتے ہیں، کہ قائل میں کن اوصاف کا اجتماع ہے، وہ کیسا شخص ہے اس کی ظاہری تزک کی کیا حالت ہے، کلام کی تہہ تک پہنچنا اور حقیقت کے بے بہا موتیوں کا تلاش کرنا ان کو نہیں آتا ہے۔

شیخ الہند میں جامعیت کمال کے قدرتی سامان میں جو کچھ اس مقام میں عرض کر رہا ہوں بلا کم وکاست ان واقعی اور صحیح معلومات کے بحار سے چند قطرے ہیں، جن کا علم مجھ کو حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں مدتوں رہ کر حاصل ہوا ہے، میں اس میں ذرا بھی مبالغہ اور افراط محبت کو دخل نہ دوں گا، اس سے مقصد اس ترجمہ کی واقعی شان کو ناظرین پر حسب استطاعت ووقت ظاہر کرنا ہے اور بس۔

---

(۱) مولانا مجید حسن، بجنور کے رہنے والے تھے، ابتدائی حالات معلوم نہیں۔ ہفت روزہ الخلیل بجنور میں کتابت سے عملی زندگی شروع کی۔ ۱۹۱۲ء میں مدینہ اخبار جاری کیا، مدینہ جو ہفت روزہ تھا بعد میں سہ روزہ ہو گیا تھا، ہندوستان کا بہت مقبول طاقت ور، موثر اخبار تھا جو جمعیۃ علماء اور کانگریس کے نظریات کا ترجمان تھا، اس کے اداریئے اہمیت اور توجہ کے ساتھ پڑھے جاتے تھے، مولوی مجید حسن نے مدینہ اخبار اور اپنے طباعتی سلسلہ کو ترقی دینے کے لئے ایک پریس مدینہ پریس کے نام سے قائم کیا جو حسن طباعت میں بہت ممتاز اور مشہور رہا۔

مولوی مجید حسن معقول آمدنی اور پیسے کی فراوانی کے باوجود بہت سادہ زندگی گزارتے تھے، مولانا مجید حسن کی تقریباً اسی سال کی عمر میں ۲۷ رجب ۱۳۸۲ھ/ ۱۱ نومبر ۱۹۶۲ کو بجنور میں وفات ہوئی۔ (معلومات جناب منیر اختر صاحب)

(۲) "یہ دیکھو کہ کس نے کہا ہے کہ یہ مت دیکھو کیا کہا ہے" مگر معروف مقولہ جو حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے منسوب ہے یہ ہے: انظر الی ماقال ولا تنظر الی من قال (یہ دیکھو کیا کہا گیا ہے، یہ مت دیکھو کس نے کہا ہے)

قدرت نے جس طرح حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ میں ان ذاتی کمالات کا گلدستہ رکھ دیا تھا جن کا تحقق کتاب اللہ کے صحیح ترجمہ کرنے کے لئے ضروری ہے، اسی طرح اس نے بہت سے ایسے خارجی اسباب بھی مہیا کر دئے تھے جن کا وجود ہر زمانہ میں بہت کم افراد کو میسر آتا ہے۔

استاد اور رہنمائے طریقت فطرتاً آپ کو نہایت ذکی، ذہین، نہایت وقاد طبیعت، نہایت قوی حافظہ، نہایت صحیح دماغ، نہایت قوی اور وسیع دل عطا کیا گیا تھا۔ اخلاق فاضلہ اور تقویٰ و اخلاص وللّٰہیت و پرہیزگاری وغیرہ آپ میں گویا کوٹ کوٹ کر بھر دئے گئے تھے۔

پھر اس پر طرہ یہ ہوا کہ حضرت شمس الاسلام، وارث حقیقی حضرت خیر الانام (علیہ الصلوٰۃ والسلام) حکیم الامت، امام الائمہ حضرت قطب الوقت، العارف باللہ، مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی (۱) اور حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی (۲) قدس اللہ تعالیٰ اسرارہما کی صحبت اور مدت دراز تک فیض خدمت اور ان دونوں حضرات کی خاص توجہ و تربیت نصیب ہوئی، علم ظاہر اور باطن ہی میں ان دونوں بزرگوں سے مولانا رحمۃ اللہ علیہ فیضیاب (ہی) نہیں ہوئے، بلکہ اکتساب اخلاق فاضلہ وملکات کاملہ بھی نہایت اعلیٰ پیمانہ پر حاصل ہوا۔ صحبت جو اعلیٰ ترین شرط و کمالات باطنیہ میں سے ہے، حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کو علی اتم وجہ و اکملہ نصیب ہوئی، مرشد عالم قطب الاقطاب حضرت حاجی امداد اللہ صاحب (۳) قدس سرہ العزیز کی ارادت اور خلافت طریقت سے حظ وافر ملا۔

---

(۱) حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی ولادت: شوال ۱۲۴۸ھ (مارچ ۱۸۳۳ء) وفات: ۴؍جمادی الاولیٰ ۱۲۹۷ھ (۱۵؍اپریل ۱۸۸۰ء)

(۲) حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی ولادت: ۶ ذی قعدہ ۱۲۴۴ھ/ ۱۱؍مئی ۱۸۲۹ء وفات: ۹ جمادی الثانیہ ۱۳۲۳ھ (۱۱؍اگست ۱۹۰۵ء)

برصغیر ہند میں ائمہ سلف، اکابر امت، حضرت مجدد الف ثانی اور حضرت شاہ ولی اللہ کی روایات علوم اور خدمت دین، تعلیم وتلقین سنت وشریعت کے وارث، لاکھوں علماء اور کروڑوں افراد کے مقتدا، میر کارواں اور قافلہ سالار تھے، ان کے دم سے دین کی خوشبو مہک رہی ہے رحمہم اللہ تعالیٰ

(۳) حضرت حاجی امداد اللہ تھانوی مہاجر مکی ولادت: صفر ۱۲۳۳ھ (جنوری ۱۸۱۸ء) وفات جمادی الاخریٰ ۱۳۱۷ھ، اکتوبر ۱۸۹۹ء دس بارہ عارفانہ کتابوں کے مصنف، بے شمار علماء کے مرجع ومقتدا اور سلوک ومعرفت میں اس عہد کے امام اور سرگروہ مشائخ کاملین تھے۔ حضرت موصوف کے احوال وکمالات وکرامات پر کئی کتابیں لکھی گئی ہیں۔ رحمہ اللہ تعالیٰ

خوش قسمتی سے والد ماجد مرحوم و مغفور ایسے ملے جو کہ علم و ادب، عربی و فارسی، اردو کے نہ صرف اساتذہ میں سے تھے، بلکہ ان تینوں زبانوں کے امام تھے(۱) طبیعت علوم ادبیہ اور بلاغت و بیان و بدیع وغیرہ میں نہایت رسا تھی۔ ان کی تصانیف شروح حماسہ، و متنبّی، سبعہ معلقہ، بانت سعاد، تذکرۃ البلاغۃ و قصائد عربیہ وغیرہ ان کے غلو شان کے شاہد ہیں۔ علاوہ اساتذہ مذکورین کے مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی (۲)

---

(۱) شیخ الہند (مولانا محمود حسن) کے والد ماجد، مولانا ذوالفقار علی خلف شیخ فتح علی دیوبندی، تقریباً ۱۲۳۷ھ میں ولادت ہوئی۔ مولانا مملوک العلی اور دوسرے علماء سے تعلیم حاصل کی، بریلی کالج میں عربی کے استاد مقرر رہوئے، بعد میں سلسلہ تدریس سے تعلیم کے انتظامی شعبہ میں منتقل ہو کر انسپکٹر مدارس مقرر رہوئے۔

آخر میں ضلع سہارنپور کے مدارس کے انسپکٹر تھے۔ دیوبند میں قیام رہا، تمام عمر وہیں گذاری۔ مدرسہ (دار العلوم دیوبند) کا جن بزرگوں نے منصوبہ بنایا اور اس کو اخلاص وللّٰہیت سے پروان چڑھایا، ان میں ایک ممتاز نام مولانا ذوالفقار علی صاحب کا بھی ہے، مولانا تمام زندگی مدرسہ کے اہم رکن، سرگرم معاون اور اسکے مجلس منتظمہ کے بنیادی ممبر رہے۔

مولانا کا برصغیر کے عربی کے ممتاز فاضلوں میں شمار ہے۔ مولانا نے عربی ادب کی ممتاز ترین درسیات اور معروف قصائد کی شروحات لکھیں، بعض کو قبول عام حاصل ہوا۔ مولانا کی اہم تالیفات میں تسہیل البیان فی شرح الدیون، تسہیل الدراسہ شرح حماسہ، التعلیقات علی السبع المعلقات، عطر الوردہ شرح قصیدہ بردہ، الارشاد الی بانت سعاد سر فہرست ہیں۔ تذکرہ البلاغت اور تسہیل الحساب بھی مولانا کی تصانیف میں مشہور ہیں۔ تقریباً پچاسی (۸۵) سال کی عمر میں ۱۳۲۲ھ/۱۹۰۴ء میں دیوبند میں وفات ہوئی۔

حیات شیخ الہند از مولانا سید اصغر حسین دیوبندی ص:۱۳۔۱۵ (لاہور: ۱۹۷۷ء) تذکرہ مولانا محمد احسن نانوتوی، محمد ایوب قادری ص:۴۵ (حاشیہ) کراچی: ۱۹۶۱ء۔

(۲) حضرت مولانا محمد یعقوب خلف مولانا مملوک العلی نانوتوی (ولادت ۱۳؍صفر ۱۲۴۹ھ/ جولائی ۱۸۳۳ء) والد ماجد سے تعلیم حاصل کی، تمام علوم میں کامل ہوئے، شاہ عبد الغنی اور مولانا احمد علی محدث سے حدیث پڑھی۔

تعلیم کے بعد اجمیر کے سرکاری مدرسہ میں مدرس ہوئے ۱۸۵۷ء تک تمام وقت تعلیمی خدمت میں گزرا۔ ۱۸۵۷ء کے بعد دار العلوم دیوبند کو ترقی دینے آگے بڑھانے میں اپنے معاصرین اور رفقاء کے ہم قدم رہے، مولانا مدرسہ عربیہ اسلامیہ (دار العلوم) دیوبند کے پہلے صدر مدرس اور علوم میں فخر اماثل تھے۔ سلوک و معرفت میں حضرت حاجی امداد اللہ سے مجاز تھے، تالیفات، تراجم، مکتوبات، (بیاض یعقوبی کے مندرجات و مکتوبات کے علاوہ) اور مختلف موضوعات پر مضامین علمی یادگار ہیں۔ سیکڑوں طلبا نے مولانا سے استفادہ کیا، جس میں حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی کا نام بہت ممتاز ہے۔ رحمہم اللہ یکم ربیع الاول ۱۳۰۲ھ (۲۰ دسمبر ۱۸۸۴ء) کو طاعون میں مبتلا ہو کر وفات ہوئی نانوتہ میں دفن کئے گئے۔

(بیاض یعقوبی، مرتبہ امیر احمد عشرتی نانوتوی ص:۵ نیز ص:۱۵۳۔ طبع اول: تھانہ بھون ۱۹۲۹ء)

اور ملا محمود صاحب (۱) مولانا مہتاب علی صاحب (۲) وغیرہ قدس اللہ اسرارہم، ایسے ایسے اساتذہ ملے جو کہ اپنے زمانہ میں بے نظیر شمار کیے جاتے تھے۔

ساتھی بھی اعلیٰ درجہ کے فاضل ملے

ہم سبق ایسے ایسے چیدہ اشخاص قدرت نے بہم پہونچائے جو کہ نہایت ذکی اور سلیم الطبع قوی الحافظہ جامع الکمالات تھے، مولانا فخر الحسن صاحب گنگوہی (۳)

---

(۱) مولانا ملا محمود، مولانا ممتاز علی دیوبندی کے فرزند اور دیوبند کے خاندان سادات کے فرد ہیں، مولانا محمد قاسم سے تعلیم حاصل کی، مولانا شاہ عبدالغنی مجددی سے حدیث پڑھی، مؤخر الذکر کے خاص تربیت یافتہ اور انجاح الحاجہ کی تصنیف میں استاذ جلیل (شاہ عبدالغنی مجددی) کے معاون و شریک تھے۔ اس کے علاوہ بھی متعدد کتابوں کے مصحح، حاشیہ نگار تھے۔ مدرسہ اسلامیہ عربیہ (دارالعلوم) دیوبند میں سب سے پہلے مدرس مقرر کیے گئے، بعد میں مدرس سوم ہو گئے تھے۔

یہ معلومات مختلف ذرائع سے اخذ کی گئی ہیں اور اس میں کئی پہلی بار شائع ہو رہی ہیں۔

(۲) مولانا مہتاب علی خلف شیخ فتح علی دیوبندی (مولانا ذوالفقار علی کے بڑے بھائی) ممتاز عالم اور دیوبند میں سرکاری مدرس تھے، مدرسہ اسلامیہ عربیہ دیوبند کے قیام کے فیصلہ کے بعد اس کے مقصد کے لئے سب سے پہلا کام اہل قصبہ کا تعاون اور نظم کی فراہمی تھی۔

۱۵ر محرم الحرام ۱۲۸۳ھ (۳۰ر مئی ۱۸۶۶ء) کو حضرت حاجی عابد حسین نے سب سے پہلا چندہ کیا، حاجی صاحب کے بعد چندہ کی سب سے پہلی رقم مولانا مہتاب علی کی تھی، مدرسہ کے افتتاح کے بعد ۱۹ر محرم ۱۲۸۳ھ کو مدرسہ کے تعاون کے لئے جو سب سے پہلی اپیل اور اشتہار چھپا اس میں حضرت عابد حسین اور حضرت مولانا محمد قاسم کے بعد تیسرا نام مولانا مہتاب علی کا ہے، جس سے معلوم ہو رہا ہے کہ مولانا مدرسہ کے سب سے پہلے محرکین اور سرگرم معاونین میں سرفہرست تھے۔ اس وقت سے وفات تک مدرسہ کے معاون اور رفیق رہے، مولانا قاری محمد طیب صاحب نے لکھا ہے کہ مولانا مہتاب علی ۱۳۰۴ھ ۱۸۸۷ء تک مجلس منتظمہ (شوریٰ) کے رکن تھے (ص: ۱۰۲ دارالعلوم کی صد سالہ زندگی۔ دیوبند (۱۳۸۵) لیکن سید محبوب رضوی کی اطلاع یہ ہے کہ مولانا مہتاب علی کی ۱۲۹۳ھ میں وفات ہوئی؟ (تاریخ دیوبند، حاشیہ، ص: ۳۳۱۔ دیوبند: ۱۹۷۲ء)

(۳) مولانا فخر الحسن خلف شاہ عبدالرحمان گنگوہ میں مقیم ممتاز انصاری خاندان (اولاد سیدنا ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ) کے فرد ہیں، جس سے حضرت مولانا گنگوہی وغیرہ کو بھی نسبت ہے۔ قیاساً ۱۸۴۶ء (۱۲۶۲ھ) میں ولادت ہوئی ہوگی (ص: ۷۶-۱۷۔ فخر العلماء) ابتدائی اور متوسط درسی کتابیں حضرت مولانا گنگوہی سے پڑھیں (ص: ۱۶۸) بعد میں دیوبند سے درسیات مکمل کیں، حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی سے خاص استفادہ کیا اور حضرت مولانا کے اہم شاگردوں میں ہیں۔ مولانا محمد یعقوب نانوتوی نے کے تین اہم ترین اور ممتاز ترین شاگردوں کا ذکر کیا ہے، جس میں پہلا نام شیخ الہند مولانا محمود حسین کا، دوسرا مولانا فخر الحسن کا ہے:

بقیہ صفحہ آئندہ پر

مولانا احمد حسن صاحب امروہی (۱) حافظ عبد العدل صاحب پھلتی (۲) مولانا عبدالحق صاحب پوری (۳) وغیرہ رحمہم اللہ تعالیٰ مولانا مرحوم کے شرکائے درس اور جلساء تھے۔

(**بقیه صفحه گذشته**) دوسرے مولوی فخر الحسن گنگوہی ہیں، وارستگی مزاج میں مولانا کے قدم بہ قدم بلکہ کچھ بڑھ کر ہیں، عمدہ استعداد ہے۔ انہوں نے بھی دیوبند میں تحصیل کی ہے اور اول جناب مولوی رشید احمد صاحب سے تحصیل کی تھی۔ حالات طیب مولانا محمد قاسم ص:۳۳۔۳۲

مولانا فخر الحسن کو جو سند دی گئی تھی اس کی نقل ۱۲۹۰ء کی روداد میں درج ہے (ص:۲۸) مدرسہ اسلامیہ نگینہ سے تدریس کی ابتدا ہوئی، اس کے مختلف مقامات پر قیام رہا۔ حضرت نانوتوی کے اہم ترین سفروں اور مناظروں میں رفیق اور خادم رہے، حضرت کے ملفوظات وسوانح مرتب کئے اور حضرت کی کئی کتابیں تقریریں اور افادات خاص اہتمام سے چھپوائے، ان خدمات کی وجہ سے مولانا کو ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔

مولانا کی اہم ترین دینی خدمت علمی یادگار اور صدقہ جاریہ سنن ابوداؤد اور سنن ابن ماجہ کا حاشیہ ہے، جو بارہا چھپا ہے اور چھپتا رہتا ہے، خصوصاً ابوداؤد کا حاشیہ بہت ممتاز اور متداول ہے۔ محقق جلیل مولانا عبدالرشید نعمانی نے ان دونوں کا تعارف کرانے کے بعد لکھا ہے:

"والتعليقات كلاهما يدلان على مشاركة الجيده في علم الحديث وفنونه"

یہ دونوں حاشیے علم حدیث اور اس کے مباحث میں (مولانا فخر الحسن کی) مہارت اور اعلیٰ نظر کی ثبوت ہیں۔

ماتمس اليه الحاجه لمن يطالع سنن ابن ماجه ص: ۲۱۴ (قطر ۱۴۰۴ھ)

مولانا کی ان کے علاوہ بھی تصانیف تھیں مگر ان کا مفصل احوال دستیاب نہیں، کیوں کہ کانپور کے فسادات میں مولانا کا کتب خانہ جلا کر خاکستر کر دیا گیا تھا، اس لئے مولانا کی متعدد کتابیں بے نام ونشان ہو گئیں۔

مولانا فخر الحسن (تقریباً ۱۳۰۳ھ، ۱۸۸۵ء میں) ترک وطن کر کے کانپور چلے گئے تھے۔ تا حیات وہیں رہے، ایک رئیس کے طبیب خاص تھے یہی ذریعہ معاش تھا، اسی ملازمت پر غالباً آخری ذی قعدہ یا شروع ذی الحجہ ۱۳۱۵ھ (۱۸۹۸ء) میں کانپور میں وفات ہوئی۔ مزید معلومات کے لئے فخر العلماء (سوانح مولانا فخر الحسن) تالیف اشتیاق اظہر (کراچی: ۱۹۹۱ء) یہ کتاب اگرچہ ذمہ دارانہ اور بہت مستند نہیں ہے مگر مولانا کے حالات پر اس کے علاوہ کوئی اور کتاب دستیاب نہیں، متفرق معلومات بکھری ہوئی ہیں۔ نیز ملاحظہ ہو، رپورٹ مجلس مؤتمر الانصار مراد آباد۔

مولانا کی یہ خصوصیت اور امتیاز بھی نا قابل فراموش ہے کہ مجلس ندوۃ العلماء (جس نے بعد میں دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ بھی قائم کیا) کے محرک اول مولانا سید ظہور الاسلام فتح پوری (فتح پورہ ہنسوہ) نے جن علماء کو اپنی رفاقت کے لئے منتخب کیا اور جو ندوۃ العلماء کی تحریک وتاسیس میں پیش پیش اور سر فہرست رہے ان میں ایک ابتدائی اور بہت نمایاں نام مولانا فخر الحسن گنگوہیؒ کا بھی ہے۔ مزید معلومات کے لئے:

الف: ندوۃ العلماء بانی اور محرک، تالیف ڈاکٹر محمد اسماعیل آزاد۔ (فتح پورہ ہنسوہ: ۱۹۹۶ء)

ب: مولانا سید ظہور الاسلام فتح پوری (حیات وخدمات) تالیف مولانا عبدالوحید صدیقی فتح پوری (فتح پور)

(۱) مولانا سید احمد حسن بن سید اکبر امروہوی، شاہان امروہوی کی اولاد میں تھے، ابتدائی تعلیم وطن کے متعدد علماء سے حاصل کی، طب پڑھی اور اس کے بعد حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی سے تعلیم واستفادہ کے لئے میرٹھ حاضر ہوئے، (**بقیه صفحه آئنده پر**)

دیوبند میں خدمت تدریس اور اس میں مہارت وکمال

پھر اس کے بعد مدرسہ دیوبند میں کتابوں سے فارغ ہونے کے بعد ہی ملازم ہوئے اساتذہ کی موجودگی ہی میں تمام کتب درسیہ ابتدائیہ وانتہائیہ متعدد مرتبہ

(بقیہ صفحہ گذشتہ) آخر میں مدرسہ دیوبند میں بھی پڑھا، ۱۲۹۰ھ میں دستار فضیلت حاصل ہوئی، شاہ عبدالغنی مجددی اور قاری عبدالرحمان پانی پتی سے بھی سند حدیث حاصل کی۔

مراد آباد، خورجہ، امروہہ وغیرہ میں اعلیٰ مدرس رہے، متعدد تالیفات مجموعہ، فتاویٰ مجموعہ مکتوبات مختلف مناظروں کی رودادیں اور علمی افادات یادگار ہیں۔

طاعون میں مبتلا ہوکر ۲۹؍ربیع الاول ۱۳۳۰ھ، ۱۸؍مارچ ۱۹۱۲ء کو وفات ہوئی۔ مکتوبات سید العلماء (مولانا احمد حسن امروہی) مرتبہ مولانا نسیم احمد امروہی (امروہہ بلاسنہ)

(۲) مولانا عبدالعدل خلف مولوی منشی عنایت علی پھلت ضلع مظفرنگر کے باشندے تھے۔ اپنے وطن میں اور مدرسہ عربیہ (دارالعلوم) دیوبند میں تعلیم حاصل کی، ۱۲۹۰ھ میں دارالعلوم میں ہدایہ، ملا جلال وغیرہ پڑھتے تھے (روداد ۱۲۹۰ھ ص: ۳۴۔۳۶) حضرت مولانا محمد قاسم کے معتمد خدام اور شاگردوں میں سے تھے۔ حضرت مولانا کی وفات کے بعد حضرت کے مکتوبات اور علمی افادات کا ایک مجموعہ فیوض قاسمیہ کے نام سے مرتب کیا، یہ مجموعہ ۱۳۰۳ھ میں مرتب ہوا اور اس کا پہلا حصہ مطبع ہاشمی میرٹھ سے پہلی مرتبہ ۱۳۰۴ھ میں چھپا، بعد میں اور مطابع نے بھی چھاپا (پیش نظر نسخہ مولانا محمد یحییٰ کاندھلوی تاجر کتب گنگوہ کا شائع کیا ہوا ہے) مولانا عبدالعدل نے پہلی طباعت میں اس کے دوسرے حصہ کا بھی اشتہار دیا تھا جس میں حضرت نانوتوی کی اکیس تحریروں اور خطوط کے شامل ہونے کی اطلاع تھی مگر (غالباً) دوسرا حصہ شائع نہیں ہوا، ملاحظہ ہو: تذکرہ مولانا محمد احسن نانوتویؒ، ایوب قادری ص: ۲۳۶) افسوس ہے کہ مولانا عبدالعدل کے تفصیلی حالات اور سنہ وفات وغیرہ معلوم نہیں۔

(۳) مولانا سید عبدالحق خلف نبی بخش بن امام بخش قصبہ پور قاضی ضلع مظفرنگر کے رہنے والے تھے، تقریباً ۱۲۵۸ھ/۱۸۴۲ء میں ولادت ہوئی۔ دارالعلوم دیوبند کے ابتدائی دنوں ۱۲۸۲ھ (۱۸۶۶ء) میں تعلیم کے لئے دیوبند آئے، شرح جامی سے اعلیٰ کتابوں تک تمام درسیات یہیں پڑھیں ذی قعدہ سنہ ۹۰ھ/۹؍جنوری ۱۸۷۴ء کو مدرسہ کے سالانہ جلسہ میں سند فضیلت سے نوازے گئے، جن لوگوں کو سند عطا کی گئی اور ان کے سالانہ امتحانات کے سوالات منتخب جوابات جلسے میں سنائے گئے، ان کی قابلیت کی تعریف کی گئی، ان میں سب سے پہلا نام مولانا عبدالحق کا ہے، مولانا عبدالحق کے اپنی جماعت کی سب کتابوں میں سب سے اعلیٰ نمبرات تھے (روداد مدرسہ عربیہ دیوبند: ۱۲۹۰ھ) تعلیم کے بعد ریاست رتلام میں ملازم ہوئے اور غالباً پوری زندگی اسی میں بسر فرمائی۔

مولانا کی ایک مختصر تحریر جو مولانا اپنی دختر سعدی خاتون کی شادی کے موقعہ پر محرم ۱۳۳۰ھ بطور نصیحت تحریر فرمائی تھی، بہترین جہیز کے نام سے بار بار چھپی ہے اور بہشتی زیور میں بھی شامل ہے۔ ۸؍صفر ۱۳۴۲ھ/۲۰ ستمبر ۱۹۲۳ء کو رتلام میں وفات ہوئی۔ قرارداد دارالعلوم دیوبند ۱۳۴۲ھ نیز تاریخ دارالعلوم، سید محبوب رضوی ص: ۱۸۵ (اشاعت خاص ماہ نامہ الرشید ساہی وال ۱۹۸۰ء)

مولانا عبدالحق کو متعدد اکابر علماء (روداد مدرسہ دیوبند، مولانا محمد یعقوب نانوتوی اور مولانا تھانوی وغیرہ) نے صاحب پوری بھی لکھا ہے جو پور قاضی کا مخفف ہے، الگ سے کوئی اور نسبت نہیں۔ مولانا عبدالرؤف صاحب عالی جو مولانا عبدالحق کے نواسے اور مولانا عبداللطیف صاحب پورقاضوی (ناظم مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور کے صاحبزادے ہیں) کا قول ہے کہ ہماری طالب علمی کے زمانہ تک پور قاضی کے طلبہ کو صاحب پوری کہا جاتا تھا:

یہاں یہ صراحت مفید ہوگی کہ بہترین جہیز کے نام سے اور بھی دو تین رسالے چھپے ہوئے ملتے ہیں، ہمارے نواح میں مولانا عاشق الٰہی میرٹھی کا اس نام کا رسالہ خاصا معروف ہے، وہ علیحدہ ہیں۔

پڑھا ڈالیں۔ مدرسہ دیوبند ہمیشہ سے ہر قسم اور ہر طرف کے طلبہ کا مرکز رہا ہے اس وجہ سے مستفیدین کا ہر زمانہ میں ہجوم رہا کیا، ایام شباب اور زمانہ قوت میں اس قدر مشغولی ہوئی کہ دن رات میں کوئی وقت درس وتدریس سے جب فارغ نہ رہا، تو تہجد کے وقت کو بھی سالہا سال تدریس علوم میں مشغول کیا، ادھر مدرسہ میں کتب خانہ اس قدر وسیع پیمانہ پر موجود تھا کہ کبھی کسی شرح یا حاشیہ یا کتاب کے دیکھنے اور استفادہ کرنے میں کوئی دقت نہیں پڑی، ہر فن اور ہر علم کی کتابیں اس قدر پڑھائیں کہ سب کی مع ابحاث شروح وحواشی تقریباً محفوظ ہوگئیں۔ اسی وجہ سے تھوڑے ہی عرصہ میں مولانا رحمۃ اللہ علیہ کو کسی کتاب یا حاشیہ وشرح کے دیکھنے کی اصلاحات باقی نہ رہی تھی، بلا تکلف بغیر مطالعہ کئے ہوئے تمام معقولات ومنقولات اصول وفروغ وغیرہ کو پڑھاتے تھے اور نئی نئی تحقیقات خصوصاً علم حدیث وتفسیر آیات میں ظاہر فرمایا کرتے تھے، جن کو سن کر حاضرین مجلس اور اساتذہ فن دنگ ہو جاتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ ہر طرف سے علماء اور طلبا ٹوٹ پڑے تھے، تقریباً دو ہزار سے زیادہ علماء اطراف عالم میں آپ سے بلا واسطہ مستفید ہو کر عالم اسلام کی خدمت کررہے ہیں اور لوگوں کو فائدہ پہنچا رہے ہیں۔

حاشیہ مختصر معانی کا ذکر دوران تدریس مولانا کو مختصر معانی کے تحشیہ کی بھی نوبت آئی، جس کی وجہ سے حواشی دسوقی اور بنانی، مطول (۱) وغیرہ کے ابحاث پر تفصیلاً نظر کرنی پڑی (۲) یوں تو مطول، مسلم الثبوت توضیح وتلویح، بیضاوی وغیرہ مولانا کے زیر تدریس اکثر رہا کرتی تھیں۔ جن کی وجہ سے علوم عربیہ اور فنون تفسیر وبلاغت پر خاص طور سے توجہ کی نوبت آتی رہتی تھی مگر تحشیہ کی وجہ سے اور بھی قوت دوبالا ہوگئی۔

---

(۱) بنانی اور دسوقی، دونوں شیخ سعد الدین تفتازانی کی شہرۂ آفاق تصنیف مختصر المعانی کے حاشیہ (بلکہ مفصل شرحیں) ہیں:

الف: دسوقی۔ محمد بن احمد بن عرفہ دسوقی وفات ۱۲۳۰ھ (۱۸۱۵ء) (الاعلام ج:۶/ص:۱۷)

ب: بنانی شیخ مصطفیٰ بن محمد بن عبدالخالق بنانی (وفات بعد ۱۲۳۷ھ/۱۸۲۱ء کی تالیف ہے۔ (الاعلام خیر الدین زرکلی ج:۷/ص:۲۴۲) مصنف نے اس کو تجرید کے نام سے موسوم کیا تھا، مگر مصنف کی نسبت سے بنانی کے نام سے مشہور ہے، دو بڑی جلدوں میں چھپی ہے، دو حصوں پر مشتمل چار جلدوں میں ہے۔

دونوں کتابیں ایک ہی وقت لکھی گئیں، دسوقی شوال ۱۲۱۰ھ (اپریل ۱۷۹۶ء) میں مکمل ہوئی اور تجرید جمادی الثانیہ ۱۲۱۱ھ میں پایۂ اختتام کو پہنچی۔

(۲) حاشیہ مختصر المعانی، شیخ الہند کی مشہور تالیف ہے، عام طور پر تمام مدارس میں مختصر کا یہی نسخہ زیر استعمال ہے اور پڑھایا جاتا ہے جس پر شیخ الہند کا حاشیہ ہے، یہ حاشیہ مولوی عبدالاحد (مالک مطبع مجتبائی، دہلی) نے شیخ الہند سے لکھوایا تھا۔ مولوی عبدالاحد نے صراحت کی ہے کہ شیخ الہند نے پہلے مختصر المعانی کا تین مصری طباعتوں اور قلمی نسخوں سے مقابلہ کرکے تصحیح کی، پھر اس پر جامع اور اہم حاشیہ لکھا جو مختصر المعانی کے اکثر حواشی اور شروحات کا بہترین خلاصہ ہے اور مولوی عبدالاحد صاحب کے بقول مختصر المعانی کی تمام شروح اور حواشی سے مستغنی کرنے والا ہے:

بقیہ صفحہ آئندہ پر

ذوق شعر وادب مولانا رحمۃ اللہ علیہ کو عنفوان شباب میں اردو اور فارسی شعر وشاعری کا اچھا خاصا چسکا پڑ گیا تھا چونکہ طبیعت موزوں تھی، اس لئے بہت جلد اس میں غیر معمولی ترقی کر گئے تھے۔ شعر وشاعری میں میر اور غالب سے بہت زیادہ مناسبت تھی، اساتذہ اردو کے اس قدر اشعار اس بڑھاپے اور کمزوری کے زمانہ میں بھی یاد تھے اگر وہ سب لکھے جاتے تو بہت بڑا دیوان تیار ہو جاتا۔(۱)

علی ہذا القیاس فارسی اور عربی شعراء کے قصائد کے قصائد اور ان کے دواوین کے اوراق کے اوراق محفوظ

(بقیہ صفحہ گذشتہ)

"حتی کانه لاحقوائه علی المطالب الفخیمة شرح جدیدومغن عن سائر الشروح و الزبر القدیمة وناسخ للحواشی المعتبرة والتعلیقات الکریمة"

(صفحہ آخر مختصر المعانی مطبع مجتبائی دہلی۔ طبع اول و دوم)

اس حاشیہ کی یہ افادیت اور قدر و منزلت صرف اس کے ناشر کا خیال نہیں بلکہ اہل نظر علماء بھی برسوں کے مطالعہ تلاش و جستجو اور مختصر معانی کے درجات کی تعلیم و تحقیق کے بعد اسی نتیجہ پر پہنچے تھے کہ شیخ الہند کا یہ حاشیہ مختصر کی تمام شروحات کا مغز اور ایسا انتخاب ہے کہ اس سے بہتر دشوار ہے۔ مثلاً مولانا مناظر احسن گیلانی نے لکھا ہے:

"بعد کو جب دسوقی کے ساتھ ملا ملا کر ان حواشی کے مطالعہ کا موقع ملا تب مولانا کی غیر معمولی انتخابی قوت کا اندازہ ہوا، گویا اس ضخیم وکیم و شیم شرح کی روح نکال کر مولانا نے رکھ دی تھی۔ ہزار ہا ہزار صفحات کے پڑھنے سے بھی جو نتائج حاصل نہیں ہو سکتے، وہ ان چند سطروں میں مل جاتے تھے، اور اس وقت معلوم ہوا کہ کمال صرف یہی نہیں ہے کہ اپنی طرف سے کوئی نئی بات پیش کی جائے، بلکہ دوسروں کے کلام سے چھلکوں کو اتار کر صرف مغز برآمد کر لینا اور جہاں ضرورت ہو ٹھیک اسی جگہ پر موقع موقع کے ساتھ اس کو درج کر کے مشکلات کو حل کرتے چلے جانا بجائے خود ایک ایسا کمال ہے کہ اپنی طرف سے کچھ لکھ لکھا دینا تجربہ بتاتا ہے کہ اس سے کہیں زیادہ آسان ہے۔" احاطہ دار العلوم میں بیتے ہوئے دن: ۳۷۔۳۷

اسی سلسلہ گفتگو میں یہ بھی تحریر ہے کہ:

"کوئی شبہ نہیں کہ مختصر المعانی پر مولانا مرحوم کا یہ حاشیہ ایسا حاشیہ ہے، جس نے طلباء ہی نہیں کو بلکہ مدرسین کو بھی اس کتاب کی تمام شرحوں سے مستغنی کر دیا ہے"

احاطہ دار العلوم میں بیتے ہوئے دن ص: ۳۷ (دیوبند بلاسنہ)

شیخ الہند کا حاشیہ مختصر المعانی پہلی مرتبہ مطبع مجتبائی دہلی سے شائع ہوا، ربیع الثانی ۱۳۲۵ھ/ جون ۱۹۰۷ء میں اس کی طباعت مکمل ہوئی، دوسرا ایڈیشن ۱۳۳۳ھ (۱۹۱۵ء) میں چھپا، اس وقت سے ۱۹۴۷ء تک یہ حاشیہ مطبع مجتبائی سے برابر چھپتا رہا، بعد میں ہندو پاکستان کے متعدد تاجران کتب نے شائع کیا۔

(۱) حضرت شاہ عبد العزیزؒ کے عہد سے حاضر تک اکثر بڑے علماء بلکہ مشائخ کرام کے متعلق معلوم ہے کہ وہ اپنے پسندیدہ شعراء اور منتخب اشعار کی بیاضیں (کاپیاں) رکھتے تھے، جس میں حکیم الامت تھانویؒ، شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا اور مولانا محمد یوسف کاندھلوی رحمہم اللہ جیسے اصحاب بھی شامل ہیں۔

تھے، بار بار جب اشعار مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے سنانے شروع کیے تو حاضرین کو کثرت محفوظات سے تعجب شدید ہوا، متعدد فرمایا کہ اب حافظہ کمزور ہو گیا پہلے کے سب محفوظات باقی نہیں رہے۔

مرزا غالب کے شاگرد، ہرپال تفتہ کے ساتھ ایک ادبی نشست اور تفتہ کا شیخ الہندؒ کے شعری ادبی ذوق اور ان موضوعات پر وسعت نظر کا اعتراف

عنفوان شباب میں مرزا غالب کے سکندر آبادی مشہور (۱) ہندو شاگرد کسی تقریب میں دیوبند آئے تھے، کہ مولانا رحمۃ اللہ علیہ ان کو سن کر معہ چند ہمراہیوں کے ان کے پاس پہنچے، دن بھر شعر و شاعری کا چرچا رہا، (تفتہ) مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی محفوظات اور شاعرانہ مناسبت کو دیکھ کر دنگ ہو گئے، اور کہنے لگے کہ میں نے اپنی تمام عمر میں اساتذہ کے کلام کا اس قدر جمع کرنے والا حافظ نہیں دیکھا، اردو محاورات پر بسا اوقات جب مولانا سے اثناء ترجمہ میں کوئی تذکرہ آیا، فوراً میر یا مومن خاں، ذوق غالب وغیرہ کے اشعار کے اشعار سنا دیتے تھے، یہ واقعات بہت سی دفعہ پیش آئے۔

حافظ نہ ہونے کے باوجود آیات شریفہ کا غیر معمولی استحضار

مولانا رحمۃ اللہ علیہ کو قرآن شریف سے خاص شغف تھا، باوجود حافظ نہ ہونے کے اس قدر آیتیں یاد تھیں کہ گویا حافظ ہو گئے تھے۔ بخاری شریف میں ادنیٰ ادنیٰ مناسبت سے لغات کو لا کر بخاری تفسیر کیا کرتا ہے، اچھے سے اچھے حافظ وہاں

(۱) منشی ہرگوپال تفتہ، غالب کے مایۂ ناز شاگرد اور ممتاز شاعر تھے۔ ہرگوپال تفتہ سکندر آباد ضلع بلند شہر کے باشندے، کائستھ خاندان کے رکن اور موتی لال کے بیٹے تھے۔ ۱۲۱۴ھ/ ۹۸-۱۷۹۹ء میں پیدا ہوئے تعلیم کے بعد خاندانی معمول کے مطابق قانون گو رہے، غالب کو تفتہ نہایت عزیز تھے، غالب کے سب سے زیادہ خطوط تفتہ کے نام ہیں، تفتہ شروع میں رامی تخلص کرتے تھے، غالب کے شاگرد ہوئے تو غالب نے یہ تخلص بدل کر تفتہ کر دیا تھا، غالب ان کو مرزا تفتہ کہتے تھے۔

تفتہ سخن شناسی میں بے نظیر تھے، عموماً فارسی میں کہتے تھے، تفتہ کا فارسی کلام اپنے ہم عصروں سے ممتاز اور طالب و کلیم کے پایہ کا ہے، فارسی کلام کے چار دیوان یادگار ہیں جس میں (اندازاً) بارہ تیرہ ہزار شعر ہیں۔

تفتہ نے گلستاں سعدی کی تضمین لکھی تھی اور بوستاں کے جواب میں سنبلستان تحریر کی، تفتہ پندرہ رمضان ۱۲۹۶ھ/ ۲ر ستمبر ۱۸۷۹ء کو سکندر آباد میں دنیا سے رخصت ہوئے۔ مولوی مختار احمد تھانوی نے تاریخ وفات کہی:

سال نقلش بادل زار از خرد من شنیدم بے سر و پا شد سخن ۱۲۰۶+۱ ۱۲۹۶ھ

مزید معلومات کیلئے تفتہ اور غالب مؤلف محمد ضیاء الدین انصاری۔ (دہلی: ۱۹۸۴ء) نیز تلامذۂ غالب مالک رام ص: ۶۳-۶۶ (نکودر: طبع اول)

چکرا جاتے ہیں اور نہیں بتا سکتے کہ یہ الفاظ کن کن آیتوں میں وارد ہیں، ماسبق اور مابعد کو پڑھ دینا نہایت مشکل ہوتا ہے مگر مولانا رحمۃ اللہ علیہ بلا تامل بخاری شریف پڑھاتے ہوئے اور خصوصاً کتاب التفسیر کے وقت آیات کو اول سے پڑھ دیتے تھے اور تفسیر بیان فرماتے تھے(۱) یہی مشغلہ سالہا سال رہا ہے۔

قرآن شریف کی تلاوت اور خدمت حدیث کا ذوق رمضان شریف میں علاوہ دن کو بڑی مقدار تلاوت کرنے کے تراویح اور نوافل میں ہمیشہ دس دس بارہ بارہ پارے یا کم وبیش سنا کرتے تھے، حفاظ سنانے والے تھک جاتے تھے مگر خود اخیر وقت تک نہ تھکتے تھے، کبھی کوئی کمزوری ظاہر ہوتی تھی، نہ معلوم کون سی روحانی قوت اور باطنی مناسبت قرآن شریف سے تھی جو کہ اس طرح ان کو محو کر دیتی تھی کہ ذرا بھی تکان محسوس نہ ہوتا تھا۔

مالٹا کی اسارات کے زمانے میں غالباً روزانہ ایک قرآن ناظرہ ختم کرتے، یا قریب بختم تو ضرور پہنچا دیتے تھے۔ حدیث شریف جو کہ حقیقۃً قرآن شریف کی تفسیر ہے، آخری وقت تک مولانا کا مشغلہ رہا ہے، اسی طرح تدریسی علوم میں تقریباً چالیس برس سے زیادہ مدت مولانا رحمۃ اللہ کی گذری ہے۔

باطنی اشغال پر استقامت، سیر سلوک اور حضرت گنگوہی سے اجازت باطنی اشغال جب سے کہ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب قدس اللہ سرہ العزیز سے ۱۲۹۵ھ میں بیعت ہوئے، آخری وقت تک ترک نہ فرمائے، بلکہ اس میں روز افزوں ترقی کرتے رہے اور بہت جلد سلوک کی منزلیں زیر تربیت

---

(۱) بخاری کے تراجم ابواب کے ضمن میں قرآن شریف کی جو آیتیں آئی ہیں ان آیتوں سے پہلے اور بعد کی سب آیتیں حضرت شیخ الہند کو از بر یاد رہتی تھیں، جیسا کہ مولانا مدنی نے تحریر کیا ہے اور مولانا مناظر احسن گیلانی نے لکھا ہے کہ ان آیتوں کا ضمناً ذکر نہیں تھا بلکہ ان کے ذریعہ سے قرآن فہمی کی نئی راہیں بھی کھلتی تھیں۔ مولانا گیلانی کا مفصل اقتباس ملاحظہ ہو:

”اپنے تراجم میں امام بخاری کا یہ قاعدہ ہے کہ قرآن آیتوں کو حسب ضرورت شریک کرتے چلے گئے ہیں، اس بہانے سے ان قرآنی آیتوں کے نئے پہلوؤں کے جاننے ہی کا موقع نہیں ملتا تھا، بلکہ قرآن فہمی کی نئی راہیں بھی کھلتی تھیں اور میں کیا بتاؤں کہ ترمذی شریف کے درس کے بعد بخاری شریف کا درس جب شروع ہوا تو دل کے لئے بھی اور دماغ کے لئے بھی کیسی لذیذ خوراکیں ملنے لگیں، ایسی خوراکیں جو منطق کی کسی کتاب میں ملیں، نہ فلسفے میں نہ ادب میں اور نہ کسی اور فن میں ملی تھیں۔ احاطۂ دار العلوم میں بیتے ہوئے دن ص: ۱۵۶ (دیو بند بلا سنہ)“

مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ تمام کرکے خلافت حاصل کی،(۱) مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے تفصیلی کیفیت حضرت حاجی صاحب قدس سرہ العزیز کے پاس مولانا کے سلوک اور ترقی کے مقامات کی لکھی، جس پر حضرت حاجی صاحب مرحوم نے مکہ معظّمہ سے خلافت نامہ تحریر فرمایا۔ یہ روحانی تربیت اور باطنی کمال وہ چیز ہے، جس سے حقیقی تفسیر کے لئے ہر قسم کی آسانی میسر ہوسکتی ہے۔

ترجمہ قرآن پاک کیلئے وسیع مطالعہ محنت اور انہماک

خلاصہ کلام یہ کہ صحیح اور معتبر ترجمہ وتفسیر کے جتنے مبادی اور اسباب تھے، خداوند کریم نے مولانا رحمۃ اللہ علیہ میں اس طرح مہیا کردیئے تھے کہ ان کا اجتماع دعادۃً نہایت ہی اقل ہوا کرتا ہے، مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے ہر قسم کے کمالات میں جب مراحل کو طے کرلیا اور آخری حصہ عمر کو پہنچ گئے، یعنی جب کہ جملہ مبادی اور اسباب کو تکملہ ہوگیا، اسوقت قدرت نے مولانا رحمۃ اللہ علیہ سے یہ کام لیا۔

ابتدائی ترجمہ میں مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے نہایت چھان بین اور کدوکاوش، کتب بینی، تحقیق وتدقیق سے کام لیا، موجودہ ہر قسم کے اردو فارسی تراجم بھی پاس ہوتے تھے، تفسیر کی متعدد کتابیں بھی ہر ہر آیت پر دیکھتے تھے، وقت کے گذرنے کا خیال نہ تھا، بلکہ حقیقت پر پہنچنے کا قصد ہوتا تھا۔ غور وخوض میں ادنیٰ تکاسل کو راہ نہ دیتے تھے، ہندوستان میں عرصہ دراز تک کام کرتے رہے، مگر ہجوم خلائق اور کثرت واردین واشغال نے جب تک تکمیل نہ ہونے دی تو قدرت نے مالٹا میں غالباً اسی کام کے لئے ڈال دیا، جہاں بالکل فرصت ہی فرصت تھی: مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے وہاں نہایت فراغت کے ساتھ نہ صرف ترجمہ کو تمام ہی کیا بلکہ مکرر نظر بھی ڈالی اور اصلاح

(۱) ایک وضاحت نہایت ضروری ہے کہ شیخ الہند اگرچہ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے شاگرد رشید، جان نثار، مخلص خادم، سفر وحضر کے رفیق، حضرت کے معتمد اور علمی جانشین تھے مگر حضرت مولانا نانوتوی سے مولانا کو اجازت بیعت حاصل نہیں۔ حضرت مولانا کا معمول تھا کہ مولانا کے جو شاگرد سیر سلوک مکمل کرلیتے تھے، یا جو مریدین یا مسترشدین اجازت کے اہل ہوجاتے تھے ان کو حضرت حاجی صاحب کی خدمت میں بھیج دیتے تھے، اگر ضرورت سمجھتے تو حضرت حاجی صاحب ان کو اجازت دے دیتے تھے۔ حضرت مولانا محمد قاسم نے خود کسی کو خلافت عطا نہیں کی۔ حضرت حاجی امداد اللہ، مولانا محمد یعقوب نانوتوی اور حاجی رفیع الدین مہتمم اول، دیوبند نے وضاحت فرمائی ہے کہ حضرت مولانا نانوتوی نے کسی کو مجاز نہیں کیا۔ حالات طیب مولانا محمد قاسم: از مولانا یعقوب نانوتوی ص:۳۳ (طبع اول: بھاولپور ۱۲۹۷ھ) اس لئے شیخ الہند بھی حضرت حاجی صاحب کے مجاز ہیں اور حضرت مولانا گنگوہی سے بھی اجازت بیعت حاصل ہے۔

فرماتے رہے۔ جس طرح مولانا رحمۃ اللہ علیہ کو بخاری شریف پڑھاتے پڑھاتے بخاری شریف کے تراجم ابواب اور احادیث کے متعلق خاص ملکہ ہو گیا تھا، اسی طرح اس مدت میں تفسیر آیات کے متعلق بھی نہایت عجیب اور کامل ومکمل ملکہ ہو گیا تھا، مگر افسوس کہ زمانہ نے مہلت نہ دی، اگر فوائد کی تکمیل ہو جاتی تو خلائق کو بہت زیادہ انتفاع کی صورت حاصل ہوتی۔

مولانا رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے اسلاف کرام خصوصاً حضرت مولانا نانوتوی اور حضرت مولانا گنگوہی قدس اللہ اسرارہما کو حضرت شاہ عبدالقادر صاحب (۱) رحمۃ اللہ علیہ کے ترجمہ (موضح قرآن) پر بہت زیادہ اعتبار تھا اور حقیقت میں وہ ہے بھی تمام متراجم میں زیادہ تر قابل واعتماد، حضرت شاہ صاحب مرحوم ومغفور ہر قسم کے ظاہر اور باطنی کمالات کے گلدستہ ہیں، اس لئے ان پر اعتماد ہونا ضروری ہے۔ مقدمہ میں مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے کچھ اس کا اظہار بھی فرمایا ہے اور زبانی جو کچھ فرمایا کرتے تھے اس کے لئے دفاتر کی ضرورت ہے۔ اس ترجمہ کو مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے اپنا امام بنایا ہے اور حسب تغیر زمانہ محاورات کے متبدل ہو جانے کی وجہ سے کچھ تغیر دیا ہے، جس کی تفصیل اور حالت مقدمہ سے ظاہر ہوگی۔

ہم اس ترجمہ کو سہو وخطا سے پاک نہیں سمجھتے اس میں شک نہیں کہ بے عیب فقط ذات خداوندی ہے، انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام ہی فقط معصوم ہیں، انسان خواہ کتنی ہی کامل کیوں نہ ہو عیوب سے منزہ خطاؤں سے مطہر نہیں ہو سکتا، (اس لئے) ہم کسی طرح بھی یہ دعویٰ نہیں کر سکتے کہ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کا ترجمہ قطعی طریقہ پر ہر جگہ خطاؤں سے مبرا ہی ہے، مگر واقعہ یہ ہے کہ جو جو سامان اللہ تعالیٰ نے ترجمہ کی صحت اور تفسیر کی واقعیت کے مولانا رحمۃ اللہ علیہ میں جمع کر دئے تھے اور جس اخلاص اور کوشش سے مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے اس کو تحریر فرمایا ہے ہم حلفیہ کہتے ہیں کہ موجودہ زمانہ میں تو درکنار پہلے زمانہ میں بھی عموماً یہ امور کہیں پائے نہیں گئے؟

یوں تو انکار کرنے والے، عیب چینی کرنے والے جن کی قسمت میں ازلی محرومیت لکھی ہوتی ہے، وہ خدا اور رسول اور اس کی سچی کتاب کو بھی نہیں چھوڑتے، اس پر بھی طعنے کستے رہتے ہیں: یضل بہ کثیراً ویھدی بہ کثیراً! الآیہ خود قرآن میں موجود ہے، مگر ہم نکتہ چینی والے حضرات سے یہ ضرور کہہ دینا چاہتے ہیں، کہ ذرا مقام ترجمہ کی

---

(۱) حضرت شاہ عبدالقادر حضرت شاہ ولی اللہ کے چوتھے صاحبزادے ۱۱۶۷ھ (۵۴-۱۷۵۳ء) میں ولادت ہوئی اور تریسٹھ سال کی عمر میں رجب ۱۲۳۰ھ (جون ۱۸۱۵ء) میں وفات ہوئی۔ رحمہ اللہ تعالیٰ ہر چہ گویم بوصفش غیر کافی۔

تنگی اور مولانا کے لئے اسباب و وسائل کی فراہمی وغیرہ پر غور کر کے اعتراض اور نکتہ چینی کریں۔ واللہ یقول الحق و هو یهدی السبیل.

مولانا مجید حسن کا شکریہ مولانا مجید حسن صاحب شکر اللہ سعاہم نے اس ترجمہ کی تصحیح اور تحسین کتابت وطباعت وغیرہ میں جو عرق ریزی فرمائی ہے وہ بھی انہی کا حصہ تھا، خداوند کریم ان کو اس خدمت کتاب اللہ کا اجر جزیل دنیا اور آخرت میں عطا فرمائے آمین۔ حقیقت یہ ہے کہ جس طرح یہ ترجمہ واقع میں مکمل تھا اسی طرح اس کو ظاہری زیور بھی مولوی صاحب موصوف کی سعی بلیغ سے حاصل ہوا۔ اب ہم مولوی صاحب موصوف کی ثنا وصفت اور دعا کرتے ہوئے ناظرین سے سمع خراشی کی معافی مانگتے ہوئے رخصت ہوتے ہیں۔

خداوند کریم ناظرین کو اپنی رحمت خاصہ سے نوازے اور کاتب وطابع اور جملہ سعی کرنے والوں کو دارین میں خوش وخرم رکھے، حضرت مولانا قدس اللہ سرہٗ العزیز اور حضرت شاہ عبد القادر صاحب قدس اللہ سرہ العزیز کے لئے یہ ترجمہ بہترین باقیات صالحات ہو۔

و آخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین ، والصلوٰۃ والسلام علی سید المرسلین، و آلہ و صحبہ اجمعین

کتبہ ننگ اکابر

حسین احمد غفرلہٗ از سلہٹ

دوم شعبان ۱۳۴۴ھ (۱۶ر فروری ۱۹۲۶ء) سہ شنبہ

ضلع سہارنپور میں تحریک ۱۸۵۷ء کی ایک جھلک

[اس وقت کے فوجی اور سول افسران کی خط و کتابت، انگریز وقائع نویسوں اور مقامی عہدہ داران کی چند تحریرات]

تمہید شمارہ [۱۷ جنوری، مارچ ۲۰۰۸ء] کے اعلان کے مطابق، آئندہ صفحات میں ضلع سہارنپور یوپی میں تحریک سنہ ۱۸۵۷ء کے احوال پر مشتمل معاصر اور دستاویزی نوعیت کی تین تحریرات شائع کی جارہی ہیں۔

پہلی تحریر گذشتہ مضمون کا ضمیمہ اور اطہر عباس صاحب (A.A) رضوی صاحب کی اہم تالیف:

FREEDOM STRUGGLE IN UTTAR PRADESH

کے چند صفحات کا ترجمہ ہے۔ اس کے بعد سنہ ۱۸۵۷ء کے ایک اہم مورخ، ہنری جارج کین (HENRY GEORGE KEENE) کی مشہور کتاب، سنہ ۵۷ (FIFTY SEVEAN) کے چند صفحات کی ترجمانی ہے۔ آخر میں تاریخ سہارنپور، مؤلفہ منشی نندکشور (ڈپٹی کلکٹر ضلع میرٹھ۔ مطبوعہ مطبع مصدر الہدایہ، باندا۔ ۱۸۷۷ء) جو اس وقت کی ایک اہم دستاویز اور سرکاری اشاعت ہے، کے متعلقہ صفحات شامل ہیں۔

جیسا کہ سرکاری افسران کی تحریروں سے واضح ہے، سہارنپور کے سنہ ۱۸۵۷ء کے واقعات، تھانہ بھون اور ضلع مظفر نگر کی روداد حریت ۱۸۵۷ء کا ضمیمہ ہیں، سہارنپور میں جو کچھ ہوا وہ ضلع مظفر نگر اور بجنور کی آتش فشانی کے شعلے تھے، جو بھڑک کر حدود سہارنپور میں داخل ہوئے اور وہاں بھی ایک حرکت و جنبش اور جاں فروشی کا ماحول قائم کر دیا۔ احوال و آثار کے گذشتہ شمارہ کے مندرجات اور زیر نظر تحریرات سے صاف معلوم ہو رہا ہے کہ سہارنپور کی تحریک بھی جدوجہد تھانہ بھون کی یلغار و پیکار کا ایک حصہ تھی، اس لئے سہارنپور کی روداد کو نظر انداز کیا جانا تحریک تھانہ بھون کے ایک باب کو فراموش کرنے کے برابر ہوگا۔ لہٰذا سہارنپور کی روداد بھی ایک جھلک حاضر ہے۔

تاریخ سہارنپور میں جنگی سرگرمیوں کے علاوہ اس کا بھی کچھ تذکرہ ہے کہ تحریک ۱۸۵۷ء کے خاتمہ کے بعد، ضلع سہارنپور کے قصبوں تحصیلوں میں کن مقامات پر کس قدر لوگوں کو پھانسیاں دی گئیں اور ان کے لئے کیا کیا سزائیں تجویز ہوئیں۔ تاریخ سہارنپور کے مؤلف نے ابتدائی تقریباً دو صفحوں کے علاوہ اپنی اکثر اطلاعات (خود ڈپٹی کلکٹر ہوتے ہوئے بھی) سرسید احمد کی مشہور تالیف، سرکشی ضلع بجنور سے لی ہیں اور اس میں کہیں کہیں خاموشی سے اصلاح بھی دی ہے، اس پہلو سے بھی ان تحریروں کا مطالعہ کیا جاسکتا ہے، خصوصاً لالہ نند کشور، ڈپٹی کلکٹر ہر اک موقع پر نواب بجنور کا صحیح نام، نواب محمود خاں لکھتا ہے، وہ نواب بجنور کا نام لکھنے میں کہیں بھی سرسید احمد کی نامحمود روش پر نہیں چلا، جو محمود تھا اس کو محمود ہی رہنے دیا، مذموم قرار نہیں دیا۔ راقم کے پیش نظر نسخہ تاریخ سہارنپور کے صفحات ناتمام ہیں، اس لئے تمام تفصیلات کا احاطہ نہیں ہوسکا، لیکن جو کچھ ہے اس سے بھی بہت کچھ جانا اور سمجھا جاسکتا ہے۔

انگریز افسروں کی تحریروں کے مطابق، سنہ ۱۸۵۷ء کی ملکی جدوجہد کے زمانہ میں، ضلع سہارنپور اپنے قریبی علاقوں خصوصاً مظفرنگر اور بجنور کی نسبت بہت پرسکون تھا، اور جب پرسکون علاقوں میں جذبۂ جہاد اور مقابلہ آرائی کا یہ عالم تھا تو سرگرم علاقوں میں کیا کچھ نہیں ہوا ہوگا۔

تاریخ سہارنپور میں پھانسی وغیرہ سخت سزائیں پانے والے (مجاہدین/مجرمین) کے گوشواروں کے مطالعہ سے ایک بڑی حقیقت اور بھی سامنے آرہی ہے کہ جب سہارنپور جیسے بےضرر علاقہ میں تحریک ۱۸۵۷ء میں سرگرم حصہ لینے کی پاداش میں، نوے لوگوں کو پھانسی کی سزا ہوئی اور یہ وہ سزائیں ہیں جو تحریک کے دور میں یا اس کے بعد بروقت نہیں دی گئیں، بلکہ اس کے ڈیڑھ دو سال بعد، سنہ ۱۸۵۹ء کے اواخر میں بہ ظاہر مقدمات کی عدالتی کارروائی اور سماعت کے بعد سنائی گئیں تھیں۔ سزائیں دینے والے افسران کی سفاکی اور خوں آشامی کا اس سے علم ہوتا ہے کہ صرف ایک قصبہ دیوبند کے چھیالیس اصحاب کو بہ یک وقت پھانسی دی گئی تھی۔ جب ڈیڑھ دو سال بعد سزاؤں کا یہ عالم تھا تو اس علاقہ میں سنہ ۱۸۵۷ء میں اور اس کے فوراً بعد، جب افسران کو ہر طرح کی سخت سے سخت ترین سزائیں دینے، یہاں تک کہ زندہ جلانے اور توپوں سے باندھ کر اڑا دینے کے

بھی معمولی درجہ کے افسروں کو مکمل فوجی اختیارات حاصل تھے اور عملاً مارشل لا نافذ تھا، ان علاقوں میں کتنے افراد کو تہہ وتیغ کیا گیا ہوگا اور کس قدر غیر معمولی خوں ریزی ہوئی ہوگی، کتنے لوگوں کو اپنی جانوں سے ہاتھ دھونا پڑے گا، اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

کبھی فرصت سے سن لینا بڑی ہے داستاں میری!

بہر صورت ان صفحات میں ہمارے لئے بڑی عبرت ہے اور سبق حاصل کرنے کے لئے بھی بہت کچھ ہے، کاش ہم سبق حاصل کرسکتے۔

رضوی صاحب کے صفحات کا ابتدائی ترجمہ ماسٹر نور محمد صاحب اسارا کی یادگار ہے، تصحیح ونظر ثانی اور ہنری کین کی ترجمانی ڈاکٹر جلیل احمد صاحب منگلوری/علی گڈھ نے کی ہے، مگر یہ لفظی اور مکمل ترجمہ نہیں ہے، کہیں کہیں سے چند فقرے (جن کی یہاں ضرورت نہیں تھی) چھوڑ دیئے گئے ہیں۔تاریخ سہارنپور کے ترجمہ کی ضرورت نہیں تھی مگر اس کی صحیح نقل بھی ایک مرحلہ تھا جو بعض معاونین کی مدد سے مکمل ہوا۔ فلحمد للہ

(نور)

(۱)

ضلع سہارنپور میں تحریک ۱۸۵۷ء کے چند اشارات

یوپی میں آزادی کی جنگ　　اطہر عباس رضوی

MUTNY IN UTTAR PARDESH BY ATHAR ABBASI(A.A)RIZVI

برٹش فورس اور محراب خاں کے درمیان مقابلہ آرائی

اسپانکی (R,Spankie) مجسٹریٹ سہارنپور کا خط کمشنر میرٹھ کے نام مورخہ ۲۳/اپریل ۱۸۵۸ء

آج اور کل کوئی خاص واقعہ ضلع میں پیش نہیں آیا۔ ۲۱/تاریخ کو مجھے اطلاع ملی کہ ہماری فوج نے محراب خاں کو شکست دی اور ان سے دس بندوق چھین لیں اور کثیر تعداد میں ان کے آدمیوں کی ہلاکت ہوئی۔ بجنور اور دارانگر کے بارے میں معلوم ہوا کہ ان کو باغیوں نے خالی کر دیا اور متوقع ہے کہ ہمارے فوجی دستہ کے قبضہ میں آجائیں گے، کیونکہ ان کے قبضہ سے ۱۷/تاریخ سے اب تک ۲۳/گن چھین لی گئی ہیں۔

سہارنپور

معتبر اور مصدقہ خبر کے مطابق بھائی روپ بنجارا کی ایک بڑی جماعت، سلطانپور کناری اور آصف گڑھ کے درمیان فتواہ گاؤں میں جمع ہو گئے اور خندقوں میں پوشیدہ ہیں، میں خیال کرتا ہوں کہ جتنی جلدی ممکن ہو، بلا کسی تاخیر کے منتشر کیا جائے اور ان کا ٹھکانا چھڑا دیا جائے۔

(۲) ان لوگوں کے بارے میں معلوم ہوا ہے کہ ان لوگوں نے قریب ۶/فٹ اونچی حفاظتی دیوار بنا رکھی ہے اور ساتھ میں یہ بھی معلوم ہوا کہ ان کے پاس ڈھائی سو (۲۵۰) ہتھ گولے اور دوزیرس (Zumboors) ہیں، ان کی تعداد ایک ہزار سے دو ہزار تک بتائی جاتی ہے، لیکن میرے خیال میں یہ تعداد پانچ سو اور چھ سو کے درمیان ہے۔

(۳) میری رائے میں ان پر حملہ کرنا اس وقت تک مناسب نہیں، جب تک ہمارے پاس کافی تعداد میں فوجی دستے نہ ہوں۔ اگر آپ پچاس آدمی نساری بٹالین (Nusseeree Battalion) کے مہیا کرادیں، میں ان کے ساتھ سرنگ کھودنے والے تین سپاہی، ایک چھ پاؤنڈر گن، اس کو چلانے والے یوروپین اور بیس گھڑسواروں کا دستہ شامل کردوں گا، تب ہم اس کام کو بہ آسانی کرسکتے ہیں۔

میں درخواست کرتا ہوں کہ آپ فوری جواب دیں، اور ہر ممکن امداد اس سلسلہ میں فراہم کریں۔

منگلور میں دھمکی

روڑکی سے چھ میل کے فاصلہ پر قصبہ منگلور پر حملہ کی خبر کی اطلاع ملی، اور اس کے لئے گوجر جو اس قصبہ کے قرب میں آباد ہیں، تیار کئے گئے ہیں۔ آپ اس سلسلہ میں بتائیں کہ کیا پنجاب کیولری سہارنپور سے بلائی جاسکتی ہے، اور دوسرے افراد جو اس تھانہ میں متعین ہیں۔ اس رجمنٹ نے ہر حال اچھا کام انجام دیا اور موضع بُلّہ جو کرنول کے قریب ہے، انہوں نے ایک سو پچاس باغیوں کو ہلاک کردیا۔ اگر سہارنپور کے مجسٹریٹ سر جان (Sir John law rence) کی رجمنٹ کو واپس کرنے پر تیار ہوجائیں، تو ان کو ایسا کرنے کی اجازت دی جائے۔

گنگا گھاٹ کے کنارے نقل و حرکت

میرٹھ، ہردوار کے قرب و جوار میں گھوڑ کھوں اور یوروپین کی ایک جماعت نگرانی رکھ رہی ہے، لیکن اس بات کی توقع نہیں ہے کہ باغی روہیلکھنڈ سے آگے بڑھیں گے اور دریا پار کریں گے۔

مایاپور میں مشغولیات

کپتان بائسر گون (Captain Boisragon) کا خط بنام کرنل اسمتھ (Colonel Baird Smith) مورخہ ۱۱ر جنوری ۱۸۵۸ء از مایاپور، نجیب آباد کے نواب کی فوجوں کا کنکھل، جوالاپور، اور ہردوار پر حملہ۔ روڑکی سے برابر اطلاعات مل رہی ہیں کہ ۸ر تاریخ کو ۲ر بجے سے شام کے سات بجے تک نجیب آباد سے نواب کی قیادت میں دشمن فوجوں نے گنگا ندی کو پار کرلیا۔ کنکھل، جوالاپور اور ہردوار میں سرکاری املاک کو برباد کردیا اور حکومت کی املاک مایاپور میں اپنے قبضہ میں لے لی، مسٹر ڈی بروس (Mr. Dubross) جو تار بابو ہیں، ان کو قیدی بنالیا اور اس بات کا دعویٰ کیا کہ ان مقامات کو نواب مذکورہ نے فتح کرلیا۔ تھانیدار جوالاپور کی آخری اطلاع کے

مطابق، دشمن کی فوج آگے بڑھ رہی ہے اور بہادر آباد تک پہونچ گئی ہے، اور روڑکی پہونچنے والی ہے۔ اس لئے مجھے کپتان ریڈ (Captain Reed جوروڑکی کی کمان کرر ہے ہیں) نے ہدایت دی ہے کہ منگلور میں مقیم لیفٹینینٹ ٹی۔ بوئسرا گون (Lt. T. Boisragon) سے درخواست کی جائے کہ وہ ایک فوجی دستہ جس میں پچاس گورکھا، پانچ سوسکھ اور دو عدد سکس پاؤنڈر گن زیر قیادت (St. Lgeorge) بھیجیں۔ یہاں سے ۲۴ رمیل کے فاصلہ پر ہے، اس کام کو اچھے سپاہیوں کی مدد سے کرایا جائے تا کہ اطمینان بخش نتیجہ برآمد ہو۔

کن کھل کے قریب بغاوت

۹ رتاریخ کو صبح ۸ ربجے یہاں پہونچتے ہی میں (Lt. Thamason Coptain H Drummand) لیفٹنٹ تھامسن، کیپٹن ایچ ڈرامونڈ اور انجینئرس سول افسر مسٹر میل ویل (Mr. Melville) اور تین یا چار گھوڑ سواروں کو ساتھ لیکر، دشمنوں کے ٹھکانے کا پتہ لگانے نکل پڑا۔ کنارے کنارے دو تین میل چلنے پر ہم نے ان کے کیمپ کو دیکھ لیا، جو کہ بھگوان انجنی کے پاس، اور کنکھل سے سیدھے راستہ سے تین میل کے فاصلہ پر تھا، گھاٹ کی وجہ سے ہم کچھ زیادہ نہیں دیکھ پائے مگر اندازہ ہوا کہ وہ کافی تعداد میں پانچ سو (۵۰۰) کے قریب ہیں، ان کی ہم پر تین یا چھ پاؤنڈر فائرنگ سے اندازہ ہوا کہ ان کے پاس کافی تعداد میں بندوقیں بھی ہیں، ان سب اطلاعات کو حاصل کر کے ہم نے کچھ فائرنگ کی، اور آرام کرنے لگے۔

کنکھل میں باغیوں کے داخلہ کی کوشش

کل قریب ۲ ربجے مجھے شیو پرساد ایجنٹ نہر وائی سے اطلاع ملی، کہ باغیوں نے کنکھل کے جنوب میں بھاری تعداد اور ہتھیاروں کے ساتھ جماؤ کرلیا ہے، میں نے فوراً مقابلہ کی تیاری کی، یہ گارڈ [جو کہ ۸ رگھورکھا ۸ رسکھ اور ۵ رسواروں پر مشتمل اور فرسٹ پنجاب کیولیری سے ہے] کیمپ کی حفاظت کے لئے چھوڑ دیا گیا، جس کی نگرانی محکمہ نہر کے افسر مسٹر فلپس (Mr Philips) کریں گے۔ ان کو ہدایت دی گئی کے وہ مایاپور نہر کے پل اور ڈیم کی بھی دیکھ بھال کریں، اور فوراً اطلاع دیں۔ بقیہ فوج کو لیکر میں کنکھل جانے والی خاص شاہراہ سے روانہ ہوگیا۔ میری درخواست پر مسٹر میل ول (Mr Melville) نے بخوشی چارج سنبھال لیا، وہ دشمن کی نقل وحرکت پر نگرانی رکھے ہوئے ہیں، فائرنگ شروع کرنے سے پہلے مجھ سے آملے، اور پورے معرکہ میں ساتھ رہے۔ میں ان کے مفید مشوروں کے لئے ان کا شکر گذار ہوں۔

نواب نجیب آباد کے بھتیجے کو ہلاک کردیا

میں نے فوج وتوپ خانہ کو کئی حصوں میں تقسیم کردیا، تاکہ دائیں بائیں یا پیچھے کی طرف سے دشمن کی روک تھام کی جاسکے۔ مجھے معتبر ذرائع سے باغیوں کی موجودگی کا علم ہو، امیں نے ان کی ایک بڑی تعداد سے (آٹھ یوروپین، تیس گورکھا، تیس سکھ، دوبندوق، اور سولہ آدمیوں کے ساتھ) مقابلہ کیا اور زمین دوز پناہ گاہ بنانے کا جو منصوبہ آپ نے بنایا تھا، میں نے اس کی تعمیل کی۔ میرا ارادہ جوالا پور پہنچ کر دشمن سے مقابلہ کرنے کا تھا، گورکھا اور سکھ رجمنٹ کو ہمراہ لے لیا ہے، اور ایک مقبرہ کو چند لمحات میں گرادیا، کچھ لوگوں کو افسروں نے گولی مار کر ہلاک کردیا، مقابلہ قریب آدھ گھنٹہ جاری رہا، مجھے یقین ہے کہ نواب کا بھتیجہ لیفٹنٹ بوئیسراگون (Lt. T. Boisragon) کے ہاتھوں مارا گیا اور خود نواب بھی زخمی ہوگیا۔ مجھے اس بات کو تحریر کرتے ہوئے خوشی ومسرت ہے کہ ہمارا کوئی آدمی ہلاک یا زخمی نہیں ہوا۔ ہمارے ہر افسر اور افراد نے خواہ وہ یورپین تھے یا مقامی اچھا کام انجام دیا۔

میں یہ ذکر کرنا بھول گیا تھا کہ روڑکی میں لیفٹنٹ بویسراگون (Lt. T. Boisragon) کی جماعت میں دس آدمیوں کا اور اضافہ ہوگیا ہے، پنجاب کی فرسٹ (اول) رجمنٹ سے بھی ۲۰ر آدمیوں کا اضافہ ہوا ہے، ہم نے ۱۵ر گھوڑے بھی حاصل کیے ہیں۔

اقتباس از دی فرینڈ آف انڈیا (The Friend of India) مورخہ ۲۱/۱/۱۸۵۸ء

۱۱ر جنوری کو کپتان بوائے سرگون (Captain Boisragon) کا مقابلہ مایاپور کے قریب ہوا، ایک آدمی کے مرنے کی اطلاع ہے، اور اس کے علاوہ یہ بھی معلوم ہوا کہ نواب نجیب آباد کے بھتیجہ کو ہلاک کردیا گیا ہے۔

خط نمبر: ۲۱۱ر از کمشنر شمالی مغربی یہ بنام گورنر جنرل (تحریر کردہ از آگرہ فورٹ) مورخہ ۱۸ر جنوری ۱۸۵۸ء

۱۰۔۱۱۔۱۲۔۱۳۔۱۴ جنوری میرٹھ کے خط مورخہ ۱۱ر جنوری سے معلوم ہوا کہ بجنور کے باغیوں نے دوآب پر حملہ کردیا اور نہر پر کافی نقصان کردیا، اور سگنل پہونچانے والے کو حراست میں لے لیا۔

مجھے یہ بات بڑے دکھ کے ساتھ تحریر کرنی پڑ رہی ہے، کہ دفعدار اور چھ آدمی جن کے ساتھ ہم نے ہمیشہ اچھا سلوک کیا، وہ باغیوں سے مل گئے، یہ واقعہ مین پور کے پاس عمل میں آیا۔ اب ریاست میں کھلے طور پر ہنگامے ہو رہے ہیں، اور دوآب کی حالت خراب کردی گئی ہے۔

ولیم کا بیان مورخہ ۲۳ جنوری

سہارنپور، بجنور کے باغی سہارنپور اور مظفر نگر اضلاع میں بدنظمی پھیلا رہے ہیں، اور جنہوں نے ۸/جنوری کو تار گھر کے سگنل کرنے والے کو اور دو مقامی عیسائیوں کو موضع پور میں حراست میں لے لیا۔ کپتان Boisra gon نے اپنے ہمراہ ستر سکھ اور گورکھوں اور دس یوروپین کی مدد سے ایک ہزار باغیوں کو منتشر کر دیا، اور سو کے قریب سرکشوں کو ہلاک کر دیا، اور ایک آدمی جو نواب (Nawab Alunee Dolla) بتائے جاتا ہے، نواب صاحب کے بھتیجہ کے ساتھ زخمی ہو گیا، جس کو خود (Captain Boisragon) نے ہلاک کیا ہے۔

باغیوں کا ناگل گھاٹ پر بجلی بنانا

فوجوں کا ایک دستہ روہیل کھنڈ باندھ سے روڑکی آ کر مقیم ہو گیا، اس دستہ میں پانچ سو یوروپین افراد ہیں، باغیوں کی ایک جماعت جس کی تعداد پانچ ہزار ہے، اور جن کے پاس دس گن مشین ہیں، وہ بھی روڑکی میں ناگل گھاٹ کے دوسری جانب پہنچ گئے اور ناگل گھاٹ پر بجلی بنا رہے ہیں، اور دریا پر کمانڈ کیئے ہوئے ہیں، یہ معلوم نہیں کہ ان کا مقصد تعمیری ہے یا تخریبی۔

کن کھل سے واپسی

بریگیڈیر کوک (Brigadier Coke) نے اپنا صدر مقام روڑکی کو بنالیا ہے، بجنور کے مجسٹریٹ شکسپیر (Shakespeare) کی اطلاع کے مطابق دشمن نے دریا پار کرنے کی کوشش نہیں کی، اور معلوم ہوا کہ باغیوں کا کافی حد تک صفایا ہو گیا ہے، فوجی دستوں کی مدد کا فائدہ لیتے ہوئے ضلع کو غیر ہتھیار بند کر دیا گیا ہے، اور مجسٹریٹ مظفر نگر کو بھی اسی مقصد سے امداد روانہ کر دی گئی ہے۔

سہارنپور کو ہتھیاروں سے خالی کر دیا گیا

سہارنپور سے خط موصول ہوا جس سے معلوم ہوا کہ ۲/مارچ کو عوام شہر کو ہتھیاروں سے خالی کر دیا گیا اور پانچ ہزار ہتھیار حاصل کیئے جا چکے ہیں۔

ترجمہ	تصحیح ونظر ثانی
ماسٹر نور محمد صاحب مرحوم	ڈاکٹر جلیل احمد منگلوری
اسارا، ضلع مظفر نگر	کاندھلہ/علی گڑھ

(۲)

سنہ ستاون ۵۷/ تالیف ہنری جارج کین

مطبوعہ لندن: ۱۸۸۳ء

{FIFTY SEVEN BY HENRY GEORGE KEENE}

LONDON-1883

آغاز غدر کے ایک ماہ بعد ایک غیر جانب دار مشاہد نے اس وقت کے حالات اس طرح قلم بند کیے ہیں: "اختصار میں حالات کو یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ کلکتہ، دہلی اور پنجاب کے درمیان براہ راست مراسلت معطل ہو گئی تھی، دہلی میں محض چار ہزار (۴۰۰۰) سپاہیوں پر مشتمل فوج اپنی جگہ پر بمشکل قائم تھی، اس کا حلقۂ عمل پنجاب (لدھیانہ) تھا۔ سر جے لارینس (Sir J. Lowrence) نے کمال بہادری و وفاداری کے ساتھ اپنے یورپین رجمنٹ دہلی کے لئے روانہ کیے، مگر اس میں بھی شبہ تھا کہ کیا اس ٹکڑی کے دہلی پہونچنے تک بھی گھیرا ڈالے فوج اپنی جگہ پر قائم رہ سکے گی یا نہیں۔(۱)

یہ حالات تھے، جس میں اپر انڈیا میں تعینات برٹش طاقت کے تمام افسران کی صلاحتیں داؤ پر لگی ہوئی تھیں، ان حالات کے ختم ہونے کے آثار نظر نہیں آرہے تھے اور آنے والے حالات کے پیشین گوئی کرنا قطعی غیر یقینی تھا۔ ان حالات میں کچھ لوگ حالات کو قابو میں نہ رکھ سکنے اور سرکاری و عوامی جان و مال کی حفاظت نہ کر پانے کے سبب اکھڑ گئے، مگر اکثر و بیشتر نے بڑی قربانیاں دیں، آخر کار ان کی قربانیاں رنگ لائیں، اور امن قائم ہوا۔ ایک سول آفیسر نے جس نے خود جرأت اور حوصلہ مندی کے ساتھ بڑی قربانیاں دیکر اپنے ضلع (غالباً سہارنپور) کو سنبھالے رکھا ہے لکھا ہے:

(1) India and the English by E. de valbezen

''پریزیڈینسی (Presidency) کے سول افسران کو جس قدر مشکلات پیش آئیں اتنی پورے ملک میں کسی نے بھی برداشت نہیں کیں۔ بغاوت کے وقت ان کی کل تعداد ۱۵۳ تھی، ان میں سے تہائی ہلاک یا زخمی ہوگئے، ۲۹ کو قتل کرڈالا گیا، یا لڑتے وقت مارے گئے، یا زخموں کو تاب نہ لاکر مر گئے۔ تین ہیضہ کی چپیٹ میں آگئے، اور باقی سب زخمی، مگر گزٹ میں ان کے زخموں کا کوئی تذکرہ تک نہیں'' ''خاکی رسالہ''

ان سول افسران، ڈسٹرکٹ مجسٹریٹس کو اکثر اوقات ملٹری آفیسر کی طرح کام کرنا ہوتا تھا، جب کہ ان کے پاس صرف ان کے ماتحت کچھ سپاہی وہ بھی اگر گورکھا یا سکھ نہ ہوں تو ناقابل اعتبار تھے۔ کچھ تربیت یافتہ جیل گارڈ اور غیر تربیت یافتہ دیگر افراد ہوتے تھے اور مخالفین ہزاروں کی تعداد میں اور کبھی کبھی تربیت یافتہ باغی، جن کو صرف جان ہتھیلی پر رکھ کر ہی روکا جاسکتا تھا۔

سہارنپور

ہندوستانی اضلاع میں سے غدر کے زمانہ میں سب سے پہلے سہارنپور کا ذکر کرنا مناسب ہے، کیونکہ جغرافیائی اعتبار سے یہ شمالی سرحد پر ہے۔

دوسرے یہ مسوری ولینڈور (Landour) کے پہاڑی اسٹیشن کے قریب ہے، جہاں سب سے زیادہ انگریز رہتے ہیں۔ تیسری وجہ یہ ہے کہ صوبہ کا یہ وہ ضلع ہے جہاں سول افسران کو حالات کو قابو میں رکھنے میں کامیابی حاصل ہوئی۔

سہارنپور ضلع دو ہزار دوانیس (۲۲۱۹) مربع میل پر پھیلا ہوا آٹھ لاکھ نوے ہزار (۸۰۹۰۰۰) آبادی کا ضلع ہے، جس کی تہائی آبادی مسلمان اور باقی ہندوؤں پر مشتمل ہے، اس میں دس فیصد 10% گوجر برادری کے لوگ ہیں، یہ ضلع شمال میں شوالک (Sewalik) کی پہاڑیوں اور مشرق میں گنگا اور مغرب میں جمنا سے گھرا ہوا ہے، اس لئے دوآب کہلاتا ہے۔ اس کا نام سہارنپور اس کے صدر مقام کو سنہ ۱۳۴۰ء (۱۴۱-۷۴۰ھ) میں قائم کرنے (بسانے والے) شاہ ہارون چشتیؒ کی وجہ سے ہے، اس علاقہ پر مغل بادشاہوں اور ان کے وزراء اور روساء نے بھی توجہ دی، جس کی نشانیاں، نور محل، بیگم جہانگیر کے نام پر نور نگر اور شاہ جہاں کی شکارگاہ، بادشاہ محل کی شکل میں موجود ہیں۔

۱۸۵۷ء کے آغاز پر صدر مقام کی آبادی تقریباً پچاس ہزار تھی جس میں سے نصف مسلمان تھے، دیہات میں جو راجپوت مسلمان ہو گئے تھے، وہ دہلی کے بادشاہ کے ساتھ تھے، اونچی ذات کے مسلمان اپنے حالات کی ابتری سے پریشان تھے، لیکن ہندو بغاوت سے بالکل متاثر نہیں تھے، جب تک کہ ان کے کاروبار پر اثر نہ پڑے۔

سہارنپور کی مشرقی سرحد پر ہریدوار واقع ہے، جو کہ ہندوؤں کا بہت بڑا تیرتھ ہے، یہیں گنگا سے گریٹ برٹش کینال (گنگ نہر) نکالی گئی ہے، جو کہ صرف آبپاشی ہی نہیں بلکہ جہازرانی کا کام بھی دیتی ہے، روڑکی میں اسی کے کنارے ایک ورک شاپ اور پاس ہی سول انجینئرنگ کالج (۱) اس ضلع کا انتظام مسٹر رابرٹ اسپنکی (Mr. Robert Spenkie) کے اختیار میں تھا اور روڑکی میں ڈائرکٹر جنرل نہر وائی کرنل آر بارڈ اسمتھ Colonel R. Baird Smith تھے۔

۱۸۵۷ء کے شروع میں کچھ ہندو ٹھیکیداروں نے فوجی مطبخ سے آٹا سپلائی کرنے کا ٹھیکہ حاصل کر لیا، وہ دور دراز سے غلہ لاتے اور روڑکی میں پن چکی سے پسوا کر کانپور و مضافات تک جہازرانی کے ذریعہ بھیجتے۔ ۲۴ر اپریل ۱۸۵۷ء کو، اس سے پہلے کی بغاوت کی کوئی بات سنی جائے، کرنل اسمتھ کو اطلاع ملی کی جو آٹا بھی سپلائی میں ہے، اس کے بارے میں افواہوں کا بازار گرم ہو گیا ہے کہ سرکاری ایجنٹوں نے اس میں ہڈی کا پاؤڈر ملا دیا ہے اور سپاہیوں نے اسے لینے سے انکار کر دیا ہے۔ اس کی اطلاع تو متعلقین افسران کو دی گئی مگر اس کو زیادہ وقیع نہ سمجھا گیا۔

۱۲ر مئی کو مسٹر اسپنکی کو واضح اطلاع ملی کہ میرٹھ کو تلوار و آگ کے حوالہ کر دیا گیا ہے اور مقامی دستوں نے دہلی کی راہ پکڑ لی ہے۔ اکثر یوروپی لوگوں کا خیال تھا کہ یہ وقتی بغاوت ہے، جس کو بہت جلد کچل دیا جائے گا، مگر مسٹر اسپنکی (Mr. Spankie) حالات کا جائزہ دوسری طرح لیا اور عیسائی آبادی کو پہاڑوں پر بھیج طوفان کا مقابلہ کرنے کی ٹھانی۔ وقت گنوائے بغیر عام حالات میں موجود دستوں کو کمک دی گئی، شہر کی دیکھ بھال کے لئے ۵۰ گھوڑ سوار اور اتنے ہی پیدل فوجی اور نواحی علاقوں کی حفاظت کے لئے پولیس کے دستے بڑھائے گئے، ضلع کے خزانہ کی حفاظت کے لئے ۲۹ رویں انفینٹری (پیدل فوج) (29 th Nativeln)

(۱) (یہ اب I.I.T ہو گیا ہے)

کے مقامی سپاہیوں کو قابل اعتبار نہ سمجھتے ہوئے، عیسائیوں نے ہتھیار اٹھا لئے اور مسٹر اسپینکی کے گھر جو کہ خزانہ سے ایک میل کی دوری پر تھا اکٹھا ہو گئے۔

بغاوت کی پہلی نشانی کے طور پر جو کہ ضلع میں پھونس میں چنگاری کی طرح بھڑکی گوجر اور دیگر قانون شکن اقوام نے مقامی مالداروں مہاجنوں کو لوٹنا شروع کر دیا، جس میں پرانی عداوتوں کا حساب کتاب بھی چکتا کیا گیا۔ رہن کے کاغذات کو پانی یا آگ کے حوالہ کر دیا گیا اور اس پرائیویٹ کارروائی کے بعد ان لوگوں نے دور دراز کے دفاتر کے ریکارڈ روم اور خزانوں کا رخ کیا۔ مسٹر اسپینکی (Mr. Spankie) نے فورسز مجتمع کر ان کا مقابلہ کیا اور سبھی جگہ ان کو کامیابی ملی، جہاں پورے گاؤں ان کاموں میں شریک ملے، ان کو آگ لگا دی گئی اور لگان نہ دینے والوں کو جیل بھیج دیا گیا۔

لیکن اس عرصہ میں صدر مقام کے حالات اس قدر تشویشناک ہو گئے کہ ڈویزنل ہیڈ کوارٹر سے مسٹر اسپینکی کو شہر سے باہر جانے کی ممانعت ہو گئی، وہ ۳۰ر مئی کو آخری مرتبہ کسی تادیبی کارروائی کے لئے باہر نکلے، اس کی وجہ یہ تھی کہ قابل اعتبار مقامیوں نے کیپٹن مہک ڈوگال (Coptain Mac Dougall) کو اطلاع فراہم کی کہ شہر میں شرارت پسند عناصر موجود ہیں جو موقع کی تلاش میں ہیں کہ مسٹر اسپینکی صدر مقام چھوڑ دیں تو ہم کام کریں۔ فوجی وجوہات کی بناء پر، دہلی کے مسئلہ کے جلد نہ ختم ہونے سے مقامی لوگوں کا حوصلہ بڑھ رہا تھا مگر پھر بھی ان کے کچھ لیڈروں نے ان کو وفادار نہ سہی مگر خاموش کر رکھا تھا۔ شہر کوتوال جو کہ شرارت پسند عناصر کا ہم مذہب یعنی مسلمان تھا، وہ بھی قوم پرستی یا خواہشات سے مجبور ہو کر دہلی کی باغی کابینہ سے مل گیا تھا، اس کی مراسلت متواتر جاری تھی جہاں سے اس کو نواب کا خفیہ نام ملا ہوا تھا۔ یہ وقت تھا کہ مسٹر اسپینکی نے احساس کر لیا کہ اگر ضلع کے حالات ٹھیک رکھنے ہیں تو باہر سے مدد لینی ہی پڑے گی۔ پنجاب کے حکام نے ان کی درخواست پر ڈبلیو۔ سی پلوڈر (Mr W.C.Plowder) کو چوتھی بنگال کیولری کیپٹن ویلڈ (Coptain Wyld) کی قیادت اور پانچوی مقامی انفنٹری، (پیدل فوج) کیپٹن گارسٹن (Copiain Garstin) کی قیادت میں بھیجی، جس کی وجہ سے مذہبی جوش ٹھنڈا پڑ گیا، اور مالدار ہندو مہاجن بنئے کنڈی تالہ لگا کر آرام سے سونے لگے۔ نواب کے پولیس والے اندر خانہ گڑبڑ کرتے رہے مگر کھلے طور پر ۲ر جون کی شام کو پریشانی پیدا ہوئی کہ مقامی انفنٹری (پیدل فوج) کی نئی بھرتی کے دستہ کے جوان اپنی وفاداری میں متزلزل ہو گئے اور انہیں ڈیوٹی

چھوڑنے کے لئے کہہ کر کیپٹن گراسٹن (Copiain Garstin) ان کی تنخواہیں بانٹنے لگے، تبھی کچھ جوانوں نے اپنے ہتھیار اٹھا لئے اور دروازہ سے داخل ہونے والے مسٹر اسپینکی (Mr. Spankie) پر نشانہ سادھا مگر مسٹر اسپینکی نے محض اپنی چھڑی کے سہارے اپنا دفاع کر لیا۔ اس معرکہ میں ایک مقامی سرجنٹ نے مداخلت کی اور سپاہی کو گولی ماردی۔ مجسٹریٹ کے بنگلے پر لوٹنے والے تین اور افسران کو بھی گولی ماردی گئی۔ مسٹر اسپینکی کی خادمہ ان کا پسٹل لے کر دوڑی اور مسٹر ولڈ (Wyld) نے اپنے آدمیوں کو پکارا، اس اثناء میں ان پر تین بار گولی چلائی گئی۔ باغی اس غیر متوقع مزاحمت کو دیکھ کر ہمت ہار گئے اور بڑھتے اندھیرے کا فائدہ اٹھا کر شہر میں موجود اپنے ہمدردوں کے پاس کھسک لئے۔

اگلے دن میجر باگوٹ (Magar Bagot) تیسری گورکھا یا نسیری بٹالین کے ساتھ آئے، اور اپنے ساتھ ہیضہ کی بیماری بھی سہارنپور لائے۔ اسی وقت مسٹر اسپینکی کو ہوش اڑانے والی اطلاع ملی کہ گارسٹن (Garstin) کے آدمی، جن میں سے کچھ خزانہ کے گارڈ تھے باغی ہو گئے ہیں اور گوجروں نے نواب کے بھروسہ پر خزانہ لوٹنے کی کوشش کی۔

جس وقت مرکزی اسٹیشن پر یہ سب حالات گزر رہے تھے، اسی وقت روڑکی والے بھی اپنی پریشانیوں میں مبتلا تھے، لیکن یہاں کی مشکلات ملٹری کی تھیں نہ کہ سول کی۔ سیپرس (Sappers) کے کچھ لوگ دوسری جگہوں پر ڈیوٹی کر رہے تھے، کچھ باغی ہو کر چلے گئے تھے، صرف کچھ وفادار بچے تھے، جن کی مدد سے کرنل بارڈ اسمتھ (Colonel Baird Smith) ورکشاپ کے گرد قلعہ سا بنائے ہوئے تھے اور ساتھ ہی ساتھ روہیلکھنڈ کے باغیوں سے اپنے دو ساتھی چھڑانے اور کچھ مالگزاری وصولنے میں، انجینئر ولسن کی مدد سے کامیاب ہوئے۔

۴؍جون کی رات مسٹر اسپینکی (Mr. Spankie) نے گوجروں پر حملہ کیا، جن سے خزانہ کو خطرہ ہو رہا تھا، اور ان کو مار بھگایا ساتھ ہی ان کے دو گاؤں بھی جلا دئے۔ ۸؍اور ۹ کو قوت بڑھانے والی افواہ سنی کہ میرٹھ کی افواج میدان میں اتر آئی ہیں اور انہوں نے باغیوں کی ایک ٹکڑی کو غازی آباد میں ہنڈن پر مار بھگایا ہے، اور برٹش فوج کے ساتھ مل گئے ہیں، جس کی قیادت سر۔ ایچ برنارڈ (Sir H. Barnard) کر رہے ہیں۔ یہاں سے دو پارٹیاں جالندھر بریگیڈ کے باغیوں کے تعاقب میں بھیجی گئیں مگر وہ بھی ان باغیوں کو مرکز دہلی پہونچنے سے نہیں روک پائے۔

مسٹر رابرٹسن (Robertson) اور پلوڈن (Plowden) کو باقی ماندہ ٹروپس کے ساتھ بغاوت پر آمادہ دیہات کے خلاف کارروائی کے لئے بھیجا گیا اور ان کو خاطر خواہ کامیابی حاصل ہوئی۔

حالات بدستور جولائی کے دوسرے ہفتہ تک چلتے رہے، سرسری نظر سے دیکھنے والوں کے لئے پریشانی تقریباً ختم ہو چکی تھی مگر پریشانی ختم نہیں ہوئی تھی اور اچانک ایک شام تقریباً ۸/ بجے جبکہ باہر ہلکی بارش ہو رہی تھی اور انگلش لوگ مجسٹریٹ کے مکان میں کھانا کھا رہے تھے، اطلاع ملی کہ میک ڈوگالس (Mac Dougalls) کے حفاظتی دستے نے اپنی پوسٹ خالی کر دی ہے، جو کہ سخت ڈیوٹی کی جگہ ہے۔ میجر باگوٹ (Magar Bagot) فوراً ایک میل کی دوری پر واقع خزانہ (Treasury) کی طرف دوڑے، کیونکہ یہ عین متوقع تھا کہ انتیسویں بٹالین (29th) کے سپاہی بھی بغاوت پر آمادہ ہو جائیں گے، جو کہ ابھی تک برابر اپنی ڈیوٹی دیتے چلے آرہے تھے، اپنے ساتھیوں کے ہمراہ مسٹر اسپینکی (Mr Spankie) بھی جائے واردات کی طرف لپکے۔ ان لوگوں کی پیش قدمی کی اطلاع گارڈس کے پاس ان کے پہنچنے سے پہلے ہی پہنچی، اور وہ لوگ اپنے برتن وغیرہ بھی اس تعداد میں چھوڑ کر بھاگے کہ ان کو نیلام کرنے پر تین سو (۳۰۰) روپئے حاصل ہوئے۔ اناسی سپاہی موسم و اندھیرے کا فائدہ اٹھا کر کھسکنے میں کامیاب ہوئے۔

مسٹر ویلڈ (Wyld) کی قیادت میں بنگال کیولری جمنا کے کنارے سے ہٹالی گئی اور اس کی جگہ ریاست پٹیالہ کی فوج کو لگا دیا گیا، اس طرح سہارنپور گیریسن کو مضبوط کیا گیا۔ اس کے بعد پھر کبھی گڑبڑ نہ ہوئی۔

۱۱/ جولائی کو اپنے قائد کا حکم ماننے کے لئے ہر وقت تیار، مسٹر وابرٹسن (Mr Robrtson) روڑکی میں کیپٹن ریڈ (Coptain Reed) کی انتظامی امور میں مدد کے لئے روانہ ہوئے، کیپٹن ریڈ (Coptain Reed) بارڈ اسمتھ (Baird Smith) کے دہلی چلے جانے کی وجہ سے روڑکی کی ذمہ داری سنبھال رہے تھے۔ کیپٹن ریڈ (Coptain Reed) نے بنجاروں پر حملہ کیا اور ان کو منتشر کر دیا، پھر مسٹر اسپینکی (Mr Spankie) کے حکم پر دیوبند کی جانب پیش رفت کی تا کہ وہاں کے حالات میں بہتری لائی جا سکے۔

دیوبند ایک پرانا قصبہ ہے جہاں کے امن پسند شہریوں نے اپنی حفاظت کے لئے وہ سب کچھ

کیا جو وہ کرسکتے تھے، مگروہ بلوائیوں کا مقابلہ نہ کرسکے اور اکثر مواقع پر ان کے مال ومنال لوٹ لئے جاتے تھے، قصبہ کے حالات کا بغور جائزہ لینے پر معلوم ہوا کہ گوجر، مسلم و مزدور لوگوں کے املاک نہیں لوٹے جاتے تھے۔ بلوائیوں کے حملے خاص طور پر ہندوؤں پر مرکوز تھے، ان کا ایک بڑا اپنے گھر کی حفاظت میں بری طرح زخمی ہوگیا تھا، اس کے بیٹے کو بھی دشمن مسٹر رابرٹس (Mr Robertson) کے پہنچنے سے پہلے لے گئے۔

''نواب'' ابھی تک اپنا سازشی کاروبار جاری رکھے ہوئے تھا، مسٹر اسپینکی (Mr Spankie) کو قرب وجوار میں حملہ کی خبر ملی جس پر انہوں نے زبردست جرأت مندانہ قدم اٹھایا اور اپنے غدار مسلم ماتحت کو ترقی دیکر ضلع کے شمالی مغربی علاقہ نکوڑ کا سب کلکٹر بنادیا۔ جیل گارڈ جن کی وفاداری مشکوک تھی ان کو گورکھا سے بدل دیا اور مزید مدد کے لئے لنڈھورہ سے کچھ برٹش سپاہی بھی بلالئے گئے، جن کی مدد سے مسلمانوں کے محرم کے دس دنوں کی تقریبات کی مدت میں امن وامان قائم رہا۔

مسٹر اسپینکی (Mr Spankie) کے علاج سے ''نواب'' بالکل غافل ہوگیا، دوسرے الفاظ میں تقریباً اندھا ہوگیا اور یہ سوچ کر کہ گینداب اس کے پیروں کے پاس ہے، اس نے دہلی سے اپنی خط وکتابت میں احتیاط کرنی ختم کردی، جس کی وجہ سے مسٹر اسپینکی کو اس کے جرم کا پختہ ثبوت حاصل ہوگیا۔ لیفٹیننٹ ٹی بوئیسراگون (Lt. T Boisragon) نے گورکھا پارٹی کے ساتھ ایک صبح نکوڑ میں اس کے دفتر میں ہی اس کو دھر دبوچا اور سیدھے انبالہ پہنچادیا، جہاں پہلے سے کئے گئے انتظامات کے تحت اس کے مقدمہ کی سنوائی خصوصی اختیارات والے مسٹر بارنیس (Mr Barnes) نے کی اور پھانسی کی سزادی، مقامی ڈرامہ کا یہ آخری سین تھا۔

[متن سے استفادہ بشکریہ: لائبریری یونیورسٹی آف کیلی فورنیا۔ امریکہ]

(۳)

تاریخ سہارنپور

لالہ نند کشور۔ (ڈپٹی کلکٹر میرٹھ۔ مطبوعہ باندا ۱۸۷۷ء)

نواب محمد اسماعیل خاں منصف شہر سہارنپور خلف سعد اللہ خاں، جو خاندان نواب محمود خان نجیب آبادی سے تھے، باشتباہ سازش نواب محمود خاں باغی عہدہ سے موقوف ہوئے اور تا ایام غدر زیر نگاہ رکھے گئے، اشتباہ کا سبب یہ ہوا کہ ان کے گھر سے ایک قاصد ایک خط لایا تھا اور گرفتار ہوا۔ نقل خط:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط الحمد للہ علی کل حال و دیگر حال مفسدہ زبانی حال معلوم ہوگا، اور باقی خیال حفظ ننگ و ناموس ہے زیادہ کہنا فضول ہے، العاقل تکفیہ الاشارۃ اور جو کچھ حال کہے اس پر اعتماد کرنا چاہئے، اور سے مضمون واحد سمجھنا چاہئے، باقی خیریت۔

وقائع دیگر مقام روڑکی بتاریخ ۱۴؍ ماہ مئی کہ میرٹھ میں فساد ہوا اور مقام میرٹھ سے درخواست اس مضمون کی گئی کہ چھ کمپنی سپر مانیٹر کی، منجملہ آٹھ کمپنی موجودہ روڑکی، برائے کار ضروری مقام مذکور میں روانہ کریں اور یہ کمپنیاں اسی روز براہ تری (دریا کے راستہ سے) کشتیوں پر روانہ ہوئیں۔ تاریخ ۱۳؍ وقت شب بارگ چھاؤنی گورہ واقع احاطہ مدرسہ (۱) میں آگ لگ گئی اور ایسا معلوم ہوا کہ جیسے کسی نے لگائی ہو، یہ شبہ نسبت کمپنی سپر مانیٹر کے عائد ہوا اور ان کے انداز و اطوار مشتبہ سے تدابیر حفاظت مقام مذکور کی ضروری متصور ہوئی، باشندگان مقام مذکور پٹرول (۲) بنے اور کارخانہ جات کو ایسا درست کیا کہ وقت ضرورت تمام آدمی اس میں آکر جمع ہوسکیں۔

رڑکی میں جو فوجی مقابلہ پر آئے اور مارے گئے چھ کمپنی سپر مانیٹر کی بتاریخ ۱۴؍ مقام میرٹھ میں رڑکی سے آئیں، اور جب ان کو حکم ہوا کہ سب اپنے ہتھیار حسب الحکم جنرل صاحب کے سپرد کردو، تب شاہ مذکور نے انکار کیا اور اپنے کمان افسر کپتان فریڈر صاحب کو گولی سے ہلاک کیا اور بھاگ کر میدان میں قیام پذیر

(۱) مدرسہ، یعنی تھامسن کالج رڑکی جو اب (II-T) کالج ہے۔

(۲) پٹرول۔ رات میں گشت کرنے والی گارڈ۔ (PATROL)

ہوئے، مگر توپ خانہ ایسی گارڈ ڈریگون نے ان کا تعاقب کیا، اور پچاس نفر سپاہی مفسدین قتل ہوئے اور اکثر گرفتار آئے، بعد ازاں سپاہی گرفتار شدہ نے ارادہ فرار کا کیا اور اس ارادہ میں ۵۹ نفر اور مقتول ہوئے، دو کمپنی نے ہتھیار سپرد سرکار کردئے، اور میرٹھ میں مقیم رہیں۔ اور کمپنیاں سپر مانیٹر نے جو قریب تین سو نفر کے تھیں بتاریخ ۱۸/۱۹ وقت شب فساد شروع کیا، مگر قطرۂ خون بھی اس فساد میں زمین پر نہ گرا۔ ایک کمپنی کو حکم واسطے شامل ہونے کا، کالم کمانڈر انچیف کے [ص ۹۶] ہوا تھا، وہ روانہ ہوکر نصف راہ سہارنپور تک پہونچی تھی کہ ان کو خبر فساد میرٹھ کی پہونچی، جس میں کپتان فریڈر صاحب مارے گئے تھے، یہ خبر سن کر انہوں نے آگے جانے سے انکار کیا، اور اپنے افسروں کو ساتھ لیکر واپس اپنی چھاؤنی رڑکی میں آئے، اور اثناء میں اپنے افسروں کی عزت و توقیر میں فرق نہ کیا۔

جب وہ واپس آئی تو معلوم ہوا کہ لفٹنٹ ڈریمنڈ صاحب اور لفٹنٹ بیگھام صاحب اور لفٹنٹ ملفورڈ صاحب کو افسران ہندوستان چھاؤنی سے لیجا کر مدرسہ میں پہونچا آئے تھے، اور ان کے شریک ایک جماعت پرانے سپاہیوں کی تھی، جنہوں نے ایک گروہ قلیل کا جو انہیں سپاہیوں میں سے تھا اور جنہوں نے قتل انگریزاں کا ارادہ کیا تھا اور اسکی سب صلاح دیتے تھے، بمقابلہ ہوکر فسخ ارادہ کرادیا تھا۔

تین عہدہ دار جن میں ایک ملکی تھا اور دو غیر متعہد اور پانچ عورتیں اور چھ لڑکے بوقت نصف شب کارخانے میں پہونچائے گئے، ایک گھنٹہ کے بعد لفٹنٹ پمیرٹن صاحب، اور لفٹنٹ جعفری صاحب مع اکمنڈکٹر اور چار عہدہ داران غیر متعہد کے صحیح و سالم آکر ان کے شامل ہوئے، بلکہ تمام انگریز متعلقہ فوج مذکور محفوظ اور امن میں تھے، بوقت صبح ایک جماعت مضبوط کو حکم ہوا کہ بسرکردگی کپتان میگ لیگن صاحب جاکر، چھاؤنی پر اپنا قبضہ کرکے اسباب سرکاری اپنے قبضہ میں کرلیں، وہاں پہنچ کر دریافت ہوا کہ سب سپاہی شب کو ایک گروہ باندھ کر چلے گئے اور صرف دو عہدہ دار ہندوستان اور قریب چالیس سپاہی کے چھاؤنی میں موجود تھے۔

سپاہیان موجودہ کی زبانی معلوم ہوا کہ سپاہی بخوف اس کے بھاگ گئے کہ شاید سپاہ کارخانہ جات جنہوں نے تین توپیں چھ پنی تیار کی تھیں اور جن کے پاس گولہ ہائے گراپ و کاسٹر موجود تھے ان پر حملہ آور ہوں۔ جو گیرسن یعنی فوج قلعہ کارخانہ میں تھا، ان میں سے قریب سو نفر کے لشکری اور غیر متعہد آدمی تھے، اور پچاس عورات تینتالیس لڑکے بچے بعد از حفاظت کامل کرلی گیرسن کے گروہ سپاہ بطور پترول دیہات گرد نواح

میں بھیجے گئے تاکہ بدنظمی رفع ہو، جو گوجروں اور بنجاروں نے غارت گری اسباب و اتلاف جاں شروع کی تھی اور نیز گوجر وغیرہ نے دزدی بتعدی اور قتل اور آتش زنی پر کمر باندھی تھی، اس گروہ پٹرول نے بڑا کام بیچ دوبارہ قائم کرنے انتظام کے اور تسلی دینے باشندوں کے کیا اور قریب پندرہ بیس میل تک بایام بلوہ آئندہ امن و امان رہا، گویا چند خفیف وارداتیں بھی ہوئیں تھیں مگر کوئی صورت بلوہ کی نمودار نہ ہوئی۔

بتاریخ ۱۱ر جون ایک جماعت ملکی اور غیر متعہد باشندگان بجنور نے روڑکی میں آ کر پناہ لی، اور ان کو فوراً آرام و آسائش ہر طور کی دی گئی، بتاریخ ۱۳ر جون روز شنبہ سنیت مقام ہذا میں کچھ تخلل بباعث اس کے واقع ہوا تھا کہ سواران مذکور ہردوار جانے سے انکار کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ کچھ تنخواہ پیشگی دو تو جاویں اور چونکہ ایسے امر ہیں میں بہوشیاری تمام عمل کرنا ضروری تھا، اس واسطے ایک جماعت انگریزوں کی مع ایک ضرب توپ ان کے قیام گاہ میں گئی اور ان کو گرفتار کر لیا۔

اسی شب کو ایک جماعت بمقام ہردوار روانہ ہوئی کہ سب کنڈکٹر سیٹھوں صاحب اور ان کی میم اور کورپورل بروس صاحب کو جو روہیلکھنڈ سے بچکر بھاگے تھے اور صرف یہی بچے تھے اور اب نجیب آباد سے آتے تھے لاویں اور دوسرے روز صاحبان مذکورین کو لے آئے۔ کارخانہ میں اب کام شروع ہوا اور گولہ و سیل اور توپیں ڈھلنے لگیں، تین تین پنی، اتواپ اور ایک غبارہ ڈھل کر تیار ہوا، چار پنی، نو پنی کی، ۱۸ر پنی جو کارخانہ میں واسطے دوبارہ ڈھلنے کے بھیجی گئی تھیں، اب ان کو بھڑ پر چڑھایا، اور ایک ان میں کی، دیوار پر چڑھائی گئی، تاکہ دروازہ کلاں کی حفاظت رہے اور تین باقی ماندہ اس دمدمہ پر جو باہر واسطے حفاظت جانب شرقی مذکور کے تیار ہوا تھا، چڑھائی گئیں، اس ہیبت جنگی نے ان تمام آدمیوں کو جو نزدیک اس مقام کے آ کر اس کی تیاری دیکھتی تھی ارادہ بلدہ پردازی سے روک رکھا۔

تیسرا وقایع باغی فوج نواب نجیب آباد

جب ضلع بجنور میں سرکشی زیادہ ہوگئی، اور محمود خاں اور اس کے ہمراہی سب طرف سے متفکر ہو گئے، تب دلیل سنگھ اور قدم سنگھ گوجران اور رضا حسن عرف چھٹن اور عنایت علی خاں قاضی تھانہ بھون مع اپنے رفیقوں اور ساتھیوں کے اس ضلع میں آئے، اس ضلع کے باغیوں نے ان کو امن دیا، ان کے سوار مرزا الطاف اور مرزا حاجی اور مرزا مبارک شاہ زادگان مفرور دہلی، اس ضلع میں آئے [ص:۹۸] اور محمود خاں نے ان کی بہت عزت اور توقیر کی۔

ان باغیوں نے اس ضلع میں آکرزیادہ فساد مچایا اور محمود خاں اور احمد اللہ خاں اور شفیع اللہ خاں اور ماری کو ورغلانا اور گنگا پار اترنے اور ضلع مظفر نگر اور سہارنپور میں فساد مچانے اور غدر ڈالنے پر ترغیب کی، یہ جاہل ان کے داموں میں آگئے اور پار اترنے پر مستعد ہوگئے اور کئی دفعہ پار اترے اور چند چوکیات سرکاری میں نقصان پہونچایا، چنانچہ رضا حسن عرف چھٹن ساکن موضع سرائے ضلع مظفر نگر نے مع پچاس آدمیوں کے گنگا اتر کر چوکی دھرم پورہ کو پھونک دیا اور چار برقنداز چوکی کے مار ڈالے اور دو گھوڑے وہاں سے چھین کر گنج اسکین میں چلا آیا۔ سردار خاں ساکن علاقہ ٹھاکر دوارہ اور دلیل سنگھ گوجر اپنے ساتھ بہت سے گوجر لیکر رات کو وقت سونے کے ناگل سے اترے، اور سرکاری بگٹ سے مقابلہ کیا، اور کچھ گھوڑے لوٹ لایا۔

انہیں گوجروں اور پار کے باغیوں نے چوکی الہ آباد اور تھانہ بھوکر یڑی کو روالی کے گھاٹ سے اتر کر لوٹ لیا، عنایت علی خاں قاضی کھیڑ مجاہد پور کے چوکی پر آپڑا اور دو ہندو برقنداز پکڑ لایا، ایک کو مار ڈالا، اور ایک کو مسلمان کرلیا، اسی طرح قاضی عنایت علی خاں اور دلیل سنگھ گوجر اور رضا حسن عرف چھٹن دو ضرب توپ، اور دو ہزار آدمی کی جمعیت سے میران پور اتر آئے اور میران پور کے تھانہ کو اور کچھ دو کانوں کو لوٹ لیا اور کئی آدمیوں کو قتل کیا اور محمود خاں کے نام کی منادی پٹوائی اور پھر بھاگ آیا۔

ان وارداتوں کے بعد باغیوں کو اور زیادہ حوصلہ ہوا اور شفیع اللہ خاں نے روڑکی پر حملہ کرنے کا ارادہ کیا، چنانچہ نجف خاں ساکن نجیب آباد ایک گروہ فوج کا افسر کل مقرر ہوا، اور جنگ باز خاں جو سابق میں برقنداز کوتوالی جوالا پور کا تھا، اور پھر کول میں رہا تھا، اور کفایت اللہ ساکن نجیب آباد جو پہلے کمپوڈر شفاخانہ روڑکی تھا اور پھر ریڈ صاحب کے محکمہ میں بھی پندرہ روپیہ مشاہرہ کا نوکر تھا اور عمر خاں رسالہ دار اور علی خاں افسران ماتحت مقرر ہوئے اور ساتویں جنوری ۱۸۵۸ء وہ فوج سوار اور پیادہ کی مع اپنے افسروں کے پایاب گنگا اتری، اور کچھ پیدل میناپور کی گرام نہر پر ہوکر اتر آئے۔ اور چوکی مینار پور پر حملہ کیا، چھ نفر سواران نہر جو اس چوکی پر متعین تھے، ان کے پانچ گھوڑے لئے اور [ص:۹۹] چوکی کا محاصرہ کرکے بارگ کو آگ دیدی۔ اور تجمل حسین خاں لبسن ساکن منگلور اور تفضّل حسین سوار ساکن منگلور، اور نادر علی ساکن منڈ اور اور حیدر علی ساکن پور قاضی اور گنیش سنگھ پوربیہ پانچ لوگوں کو گرفتار کرلیا اور نبی بخش سوار ساکن روڑکی حکمت عملی سے بھاگ گیا۔

بعد اس کے اور ملازمان سرکاری کی تلاش ہوئی اور بیناپور کے گودام سے ایک کرانی صاحب مہتمم تار برقی اور مولانا مستری اور ہولاس ٹھندیل اور پندرہ بیلدار لال ٹوپی والے گرفتار کئے اور کپتان ریڈ صاحب کے دونوں بنگلہ میں آگ دیدی، مولا بخش محرر اور محمد حسن چوکیدار بھی گرفتار ہوئے تھے مگر حکمت عملی سے گرفتاری میں سے بھاگ گئے، بعد اس کے یہ سب باغی کنکھل میں آئے اور تار برقی بیناپور سے کنکھل تک توڑ دیا اور کنکھل میں محمود خاں کے نام کی منادی پٹوائی، اور گیارہ بجے دن کے مع ان لوگوں کے جن کو گرفتار کیا تھا، گنگا کے پار موضع انجی رسن جہاں ان کی اور فوج تھی چلے آئے۔

تین بجے دن کے بعد اس واردات کی خبر روڑکی میں اور وہاں سے منگلور میں جہاں کچھ فوج سرکاری مقیم تھی پہنچی، رات کو حکام انگریزی اور چھ فوج نے کوچ کیا، صبح ہوتے آٹھویں جنوری ۱۸۵۸ء کو افسران اور فوج (۱) بمقام بیناپور پہنچے، اسی وقت مسٹر کپتان، ملول صاحب بہادر اور کپتان ڈریمنڈ صاحب بہادر اور کپتان مارگن صاحب بہادر اور طامسن صاحب بہادر چار سوار اور خادم علی جمعدار سواران نہر ساکن منڈاور کو ساتھ لیکر کہا اور گنگا میں کنارہ گنگا تک بمقابلہ گھاٹ چانڈی کے گئے اور اس پار سے ایک فقیر کو بلا کر حال فوج باغیان کا پوچھا۔

اس نے بیان کیا کہ موضع انجی میں فوج پڑی ہے [ص ۱۰۰] چنانچہ اس کو ہمراہ لیکر مقابلہ گھاٹ انجی جا کر کھڑے ہوئے اور دیکھا کہ کنارہ پر باغیوں کی فوج پڑی ہے ان لوگوں نے جانا کہ یہ لوگ پار اترنے کا ارادہ کرتے ہیں انہوں نے نقارہ بجایا، سب سپاہ پر پیٹ باندھ کر کھڑی ہوئی اور ہتھیار سنبھالنے لگی، یہ صاحب کھڑے دیکھا کئے۔ باغیوں نے اس کنارہ سے فیر بندوقوں کی کی سب صاحب کھڑے نہیں کئے، تھوڑی دیر کے بعد سب صاحبوں نے اپنی خیمہ گاہ پر مراجعت کی، تھوڑی راہ طے کی تھی کہ باغیوں نے ایک توپ فائر کی، اسکا گولہ ریت میں ان صاحبوں سے تھوڑے فاصلہ پر گرا۔

۹ رجنوری ۱۸۵۸ء کو بارہ بجے شیو پرشاد نیٹو ایجنٹ نہر نے خبر دی کہ نواب کی فوج پار اتر رہی ہے، افسران انگریزی نے بگل تیاری کا کیا، اور ڈریمنڈ صاحب بہادر نے ڈرام نہر پر کھڑے ہو کر، دوربین سے

---

(۱) مارگن صاحب بہادر...... کپتان مارگن صاحب بہادر، ڈریمنڈ صاحب بہادر...... فلپ صاحب بہادر سپروائز نہر، ملول صاحب جنٹ مجسٹریٹ سہارنپور، سپاہیان پلٹن سواران رجمٹ اول خا کی ۵ ہم نفر توپ ہم ضرب

دیکھا کہ درحقیقت فوج اتر رہی ہے، کچھ تو اس پار اتر آئی، اور کچھ پایاب پانی میں چلی آئی ہے، یہ نادان اس ارادے سے اترے تھے کہ کنکھل میں مقام کریں گے، کیونکہ سب کے ساتھ آٹا اور مختصر برتن اور اوڑھنا بچھونا بھی تھا۔ کپتان ڈریمنڈ صاحب بہادر نے بمجر دہ دریافت اس بات کے ڈرام نہر کا کھول دیا اور پانی نہر کا گنگا میں چھوڑ دیا اور فلپ صاحب بہادر کو اس پر متعین کر کے خود کنکھل کو تشریف لائے، یہ دانائی اور حکمت کپتان، ڈریمنڈ صاحب بہادر کی بہت قابل تحسین ہے، حقیقت میں اس حکمت سے دشمن کو موت کے چنگل میں پکڑ لیا اور بجائے آب شمشیر، موج آب سے ان کا کام تمام کیا۔

یہ فوج باغیوں کی جو اتری ان میں سب کا سردار شفیع اللہ خاں بھانجہ محمود خاں کا تھا اور عبدالرحمٰن خاں اور عباد اللہ خاں اور وہ سردار جو پہلے اترے تھے سب شریک تھے، اور قریب تین ہزار آدمیوں کے سوار پیادہ تین ہاتھی جن میں سے ایک پر شفیع اللہ خاں سوار تھا، مع تین ضرب توپیں پنتیل دھار اتر آئی تھی اور ان میں سے چار سو ساڑھے چار سو آدمی تخمیناً، سوار و پیادہ ڈرام کے پانی کو اتر کر کنکھل کے متصل مقام وچھ تک آگئے تھے اور کچھ ڈرام کے پانی میں تھے، غرضیکہ وہ لوگ کنکھل میں داخل نہ ہونے پائے تھے کہ افسران انگریزی مع اپنی فوج کے ان کے مقابلہ ہوئے اور حویلی ایکڑی والی پر مورچہ توپ کا قائم کیا۔

باغیوں نے بارہ توپ اور پندرہ قون کی سر کی جب قریب آئے تو سرکاری [ص ۱۰۱] توپوں کا گراپ ان پر مارا، بیسوں آدمی گر پڑے اور مارے گئے باغیوں کا منھ پھر گیا، اور بھاگ گئے، سرکاری فوج نے دفعتاً دھاوا کر دیا اور مارے بندوقوں کے جس قدر آدمی کہ ڈرام کے پانی کو.......... آئے تھے اور جس قدر پانی کے بیچ میں تھے اور جس قدر کہ اس کنارہ ڈرام کے کھڑے تھے۔ سب کو مار دیا اور بیسوں آدمی ڈرام کے پانی میں جو بسبب چھوٹ جانے آب نہر کے گہرا ہو گیا تھا، ڈوب گئے اور مقام وچھ غنیم سے چھین لیا۔

اس معرکہ میں کپتان مارگن صاحب بہادر نے کمال دلاوری سے تنہا اپنا گھوڑا شفیع اللہ خاں کے ہاتھی کے پیچھے ڈالا اور بندوق فائر کی، کفایت اللہ خاں جو خواصی میں بیٹھا تھا، اس کے گولی لگی، وہ مر کر گر پڑا۔ جب صاحب بہادر نے دوسرا فائر شفیع اللہ خاں پر کیا، اس کو قضا نہ تھی، وہ خالی گیا اور شفیع اللہ خاں ہاتھی دوڑا کر بھاگ گیا، بہت سے ہتھیار اور گھوڑے سواران کے جو مارے گئے تھے اور تھیلہ میگزین کا جو ہاتھی پر سے گرا تھا، فوج سرکاری کے ہاتھ آیا اور فتح و نصرت نصیب شجاعان سرکار ہوئی، اس معرکہ میں چار سو آدمی تخمیناً باغیوں کا مارا گیا، حسن رضا خاں جو کہ آب ڈرام پر سر ننگے زخمی ہو کر بیٹھ گیا تھا، اس کا سر تلوار سے کاٹ لیا، سرکاری فوج میں کسی

شخص کے بھول کے بھی چوٹ نہیں آئی، باقی آدمیوں باغیوں کے جو کنارہ نیل دھارا پر تھے، مع توپوں کے بھاگ گئے۔ شیو پرساد نیٹو ایجنٹ ہنر کو بھی جلا دے؟ اس خبر رسانی کے سو روپیہ انعام ملے۔ [ص:۱۰۱]

فہرست مفسدوں کی جو ازروئے کورٹ مارشل سزایاب ہوئے

دیوبند	پھانسی ہوئی	[چوالیس لوگوں کو] ۴۴
	عمر قید ہوئی	[آٹھ لوگوں کو] ۸
	قید کی سزا ہوئی بائیس سال کی	[اٹھارہ لوگوں] ۱۸
	قید کی سزا ہوئی چودہ سال کی	[دو لوگوں کو] ۲
	قید کی سزا ہوئی سات سال کی	[دس لوگوں کو] ۱۰
	قید کی سزا ہوئی پانچ سال کی	[انتیس لوگوں کو] ۲۹
	قید کی سزا ہوئی تین سال کی	[بیس لوگوں کو] ۲۰
	قید کی سزا ہوئی چار سال کی	[ایک شخص کو] ۱
	قید کی سزا ہوئی چھ سال کی	[نو لوگوں کو] ۹
	جرمانہ ہوا	[دس لوگوں کو] ۱۰
	ضمانت ہوئی	[اسّی لوگوں کو] ۸۰
	بید لگے	[بیاسی لوگوں کو] ۸۲
		کل میزان ۳۱۳
روڑکی	پھانسی ہوئی	[بیس لوگوں کو] ۲۰
	قید ہوئی	[ایک شخص کو] ۱
	جرمانہ ہوا	[ایک شخص کو] ۱
	ضمانت ہوئی	[دو شخص کو] ۲
	بید لگائے گئے	[اٹھائیس لوگوں کو] ۲۸
		کل میزان ۵۲

تعداد دیہات جو پھونکے گئے

نام تحصیل	نام دیہات
تحصیل سہارنپور	لندہورہ، موتی خورد، طاہر پور
تحصیل دیوبند	نکلی، بابوپور، سانپلہ
تحصیل نکوڑ	ٹاہر، احمد پور، ماجری، اغوان مڑہ، قادر گڈھ، کونڈہ، سندولی، بودہ کٹھیرہ، نوگانوہ، بین پورہ
تحصیل روڑکی	مانک پور

صاحب مجسٹریٹ سہارنپور نمبر: ۳۹ مرقومہ ۱۳ر فروری ۱۸۵۸ء بتوسل رپورٹ مورخہ ۲۶ر ستمبر ۱۸۵۷ نمبر: ۸۴ نقل مسٹر پلوڈن صاحب بابت کارروائی ضلع ہذا بایام غدر جو آج کے روز پہنچی ہم بھیجتے ہیں۔

دفعہ! اس رپورٹ میں مختصر حال کارروائی کا بھی درج ہے جو ہم پہلے تحریر کر چکے ہیں۔ اور مسٹر پلوڈن صاحب نے جس قدر امداد دہی ہماری کی ہے، اپنی ممنونی کا حال بھی اس میں کہہ چکے ہیں۔ مسٹر پلوڈن صاحب اسسٹنٹ کمشنر بنام صاحب مجسٹریٹ بہادر سہارنپور مرقومہ ۲۶ ۷ فروری ۱۸۵۸ء وقت شب ۱۹ر مئی کو ہم کو معلوم ہوا کہ غدر ضلع سہارنپور میں ہوا، اسی شام کو انبالہ سے مع کچھ فوج ہندوستانی رسالہ کی اور دو کمپنی پلٹن کی واسطے رکھنے امن وامان غرب کی جانب دریائے جمن کے انبالہ سے میں روانہ ہوا چھٹی آپ کی بنام صاحب کمشنر ضلع آنروی ستلج جو کہ میں نے کھولی، اس سے معلوم ہوا کہ آپ کو مدد درکار ہے۔ لہذا میں نے آپ کو اس بات میں تحریر کیا، اور ۲۷ کو مع رسالہ سرساوہ میں پہونچا، وہاں جا کر دیکھا کہ چوری سڑک پر ہوئی تھی، کہ آپ کو یہ بات یاد آ گئی، اور اندیشہ تھا جرائم کی سنگین ہونے میں اسی وقت ہم نے گارشٹن صاحب سے کہا کہ ایک کمپنی ہندوستان۔۔۔۔۔۔۔

تاریخی دستاویز

قدیم دہلی کالج کی ایک قدیم اور نادر ترین دستاویز اور یادگار سند

جو کالج کے ایک طالب علم، مولانا نور الحسن کاندھلویؒ کو عطا کی گئی تھی

(مکتوبہ جنوری ۱۸۳۰ء / رجب ۱۲۴۵ھ)

نور الحسن راشد کاندھلوی

مغلوں کے آخری عہد میں دہلی میں انگریزوں کا قائم کیا ہوا علمی تعلیمی تصنیفی ادارہ، جو دہلی کالج کے نام سے موسوم ہوا، اس دور کے تاریخ تعلیمی ترقی اور اشاعت وتصنیف اور طلبہ کی لیاقت وصلاحیت اور اس دور کے علمی تعلیمی تہذیبی کو سنبھالنے، قوت دینے، آگے بڑھانے اور پورے برصغیر پر نہ مٹنے والے نہایت گہرے اثرات چھوڑنے میں ممتاز و منفرد ہے۔ اس دور میں بھی اور اس کے بعد بھی علوم وفنون کی جامعیت، بلند قامت استادوں کے اجتماع اور مردم گری میں اس کی مثال نہیں، اسی ادارہ سے وہ اکثر اصحاب نکلے تھے جنھوں نے اگر ایک جانب سنہ ۱۸۵۷ء کے بعد کے سخت حالات میں ملت اور ملک کو ایک راہ دکھائی اور یہیں سے اہل دل، اہل نظر علمائے کرام کی وہ جماعت بھی جلوہ نما ہوئی تھی جس نے اگر ایک طرف سنہ ۱۸۵۷ء میں انگریز کے خلاف علم بغاوت بلند کیا، اپنے ملک کے حال اور مستقبل کے لئے ایک راہ عمل مقرر کی۔ اسی جماعت نے برصغیر ہند بلکہ عالم اسلام کے وہ ممتاز منفرد دینی تعلیمی ادارے قائم کئے جو حوادث کی آندھیوں میں مینارۂ نور اور ظلمات کے طوفان میں سفینۂ نوح ثابت ہوئے۔

بہر حال دہلی کالج برصغیر کی کی تاریخ کا ایک غیر معمولی سنگ میل ہے، مردم گیری و شخصیت سازی ہو،

ادب وثقافت کی نمو دو ترقی ہو یا اپنے عہد اور مستقبل پر اثر اندازی، ہر ایک میں اس کا ایک خاص حصہ ہے، لیکن یہ عجیب المیہ ہے کہ دہلی کالج جس اہمیت کا ادارہ تھا، اس کی تاسیس کی معلومات، اس کے استادوں کا تعارف، اس میں پڑھنے والوں اور شاگردوں کے نام اور فہرستیں، اس کے احاطہ میں برپا تصنیف وتالیف اور ترجموں کی روداد اور اس کے مطابع سے شائع کتابوں اور مقالوں ورسائل کی سرگزشت، کوئی موضوع ایسا نہیں جس کا اطمینان بخش مفصل احوال معلوم ہو، جو کچھ ہے وہ اجمال ہے، اشارات ہیں، ایسی کوئی کتاب اور ریکارڈ موجود نہیں جس کو جامع جائزہ اور مفصل تاریخ کہا جا سکے۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ سنہ ۱۸۵۷ء کی جدوجہد میں جہاں بہت سی اہم تاریخی قومی عمارتیں، آثار، مدرسے، خانقاہیں اور اثاثے برباد وتاراج ہوئے، دہلی کالج بھی اس کا شکار ہوا، اس کو لوٹا جلایا گیا، اس کے پرنسپل اور منیجر کو قتل کیا گیا اور اس کی نہایت قیمتی لائبریری اور اس کا کل اثاثہ اس طرح تاخت وتاراج ہوا کہ ایک پرزہ بھی سلامت نہ رہا۔ بعد میں اہل علم وقلم نے جستجو کی اور جو کچھ نشانات ومعلومات دستیاب ہوئے، ان کو اپنی اپنی ترتیب پر مرتب کر کے محفوظ کر دیا ہے مگر جہاں تک راقم سطور کو معلوم ہے کہ کالج کے اہتمام سے مرتب یا کالج کے مطابع سے شائع، کالج کے اخبارات ورسائل کے چند شمارے اور کالج کی مطبوعات میں سے معدودے چند کتابیں ہی اس وقت معلوم اور دریافت ہیں، کالج کے اس دور کا کوئی قابل ذکر کاغذ یا تحریر وسند وغیرہ اب تک سامنے نہیں آئی، زیر نظر صفحات میں پہلی مرتبہ کالج کی ایک قدیم ترین معلوم دستاویز اور تحریری یادگار کا تعارف اور عکس پیش کیا جا رہا ہے۔

یہ کالج کے ابتدائی دور (جنوری سنہ ۱۸۳۰ء/ رجب ۱۲۴۵ھ) کی لکھی ہوئی اور اسی وقت عطا کی گئی ایک سند یا سارٹیفکٹ ہے، جو کاندھلہ کے (ایک مشہور عالم) مولانا نورالحسن کو کالج میں اصول وفقہ کی مشہور درسی کتاب "نور الانوار" کے امتحان میں اعلیٰ کامیابی پر عطا کیا گیا تھا۔

مولانا نورالحسن خلف مولانا ابوالحسن بن مولانا مفتی الٰہی بخش کاندھلوی کا، کاندھلہ کے معروف صدیقی خاندان سے تعلق ہے، ان کے والد اور دادا بھی بڑے عالم، مربی مصنف، مدرس اور صاحب کلام، نامور شاعر ہونے کے علاوہ اپنے عہد کی برگزیدہ شخصیات میں گنے جاتے ہیں۔

مولانا نورالحسن کی ربیع الثانی ۱۲۲۷ھ/مئی ۱۸۱۲ء میں ولادت ہوئی، سات سال کی عمر میں قرآن مجید کا حفظ مکمل کر لیا تھا والد ماجد اور دادا صاحب سے ابتدائی درسیات پڑھیں، متوسطات تک تعلیم کے بعد تعلیم کے

لئے دہلی پہنچے۔ دہلی جانے کی صحیح تاریخ نہیں معلوم، لیکن کالج کی زیر تعارف سند سے معلوم ہورہا ہے کہ مولانا نورالحسن سنہ ۱۲۴۵ھ/۱۸۳۰ء میں دہلی میں تھے، نیز مولانا کے قلم سے لکھی ایک کتاب سے (جو محفوظ ہے) معلوم ہورہا ہے کہ مولانا کا سنہ (۱۲۴۶ھ ۳۱-۱۸۳۰ء) میں حضرت شاہ محمد اسحاق کے مدرسہ میں قیام تھا۔ اس کے بعد آخر تک تعلیم کا اکثر حصہ حضرت شاہ محمد اسحاق کے حلقۂ درس میں مکمل کیا مولانا مفتی صدرالدین آزردہ اور مولانا فضل حق خیرآبادی سے بھی اعلیٰ ترین کتابوں میں تلمذ رہا، تعلیم کی تکمیل کے بعد کاندھلہ واپس آگئے تھے، کچھ دنوں کے بعد دوبارہ حضرت شاہ محمد اسحاق کی خدمت میں حاضر ہوئے اور دوبارہ دورۂ حدیث شریف پڑھا۔ مولانا نے اپنے اساتذہ خصوصاً مفتی صدرالدین آزردہ اور مولانا خیرآبادی کے نہایت محبوب اور (غالب کے بھی دوست) مکتوب الیہ تھے مولانا کے نام مولانا خیرآبادی اور مفتی صاحب کے مکتوبات کا ایک مجموعہ محفوظ ہے۔

تعلیم کے بعد آگرہ کالج میں عربی کے اعلیٰ پروفیسر نامزد کئے گئے، کالج کی پروفیسری سے استعفیٰ دے کر اور ملازمتیں کیں، آخر میں دس سال تک ریاست الور میں اعزاز واحترام سے ملازمت کی، اس کے بعد وطن آگئے تھے۔ درس کا معمول ہمیشہ سے جاری تھا وطن آکر تمام وقت اسی میں صرف کیا، دور دراز سے طلبہ آتے تھے اور فائدہ اٹھاتے تھے، مولانا کے شاگردوں میں ہندوستان کے دسیوں بڑے عالم شامل ہیں۔ ایک ممتاز شاگرد سرسید احمد ہیں(۱) (جو اگرچہ عالم نہیں مگر ہندوستان کے ایک بڑے علمی تعلیمی سلسلہ کے موسس اور بہت بڑے رہنما ہیں) مولانا نورالحسن کی چند تالیفات بھی دریافت ہیں۔

مولانا کی اٹھاون سال کی عمر میں، دو محرم الحرام ۱۲۸۵ھ (۵ مئی ۱۸۶۸ء) کو کاندھلہ میں وفات ہوئی، کاندھلہ میں خاندانی قبرستان میں دفن کئے گئے۔ رحمۃ اللہ علیہ

یہ سند یا سارٹیفکٹ ۳۰ر جنوری ۱۸۳۰ء کو لکھا گیا تھا، اس میں سب کے اوپر عربی رسم الخط میں کامیاب طالب علم (مولانا) نورالحسن کا نام درج ہے، پھر اس کتاب (نورالانوار) کا تذکرہ ہے، جس میں طالب علم کو امتیاز حاصل ہوا ہے، نیچے کمیٹی کے کارکنان کا اور پرنسپل یا منیجر کے دستخط ہیں، آخری کونہ پر تاریخ درج ہے۔ ترتیب یہ ہے:

(۱) سرسید احمد کے مولانا سے تلمذ کی سرسید کی اپنی تحریرات سے توثیق اور مولانا کے نام سرسید احمد کے ایک مکتوب کے لئے ملاحظہ ہو۔ راقم سطور کا مضمون:

نور الحسن

بہجۃ العطایا

الحسنی

و

نور الانوار

مدرسہ دہلی

جنوری ۱۸۴۳

دہلی کالج (مدرسہ دہلی) کی ایک نادر وقدیم ترین یادگار، سنہ تصنیف بمائے

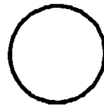
مولانا نورالحسن کاندھلوی (جنوری ۱۸۴۳ء)

آئی جو اُن کی یاد تو آتی چلی گئی

نَفُحَاتِ نَفیس

شہرۂ آفاق خطاط اور نامور مرشد

حضرت سید شاہ نفیس الحسینی صاحبؒ



حالات و کمالات اور سیرت و کردار کے چند نقوش

بھولیں ہیں نہ بھولیں گے، نفیس اہل محبت
کچھ اہل ودل و اہل نظر یاد رہیں گے

ہند پاکستان میں سلوک و تربیت اور ارشاد و معرفت کے جو کارواں اب تک سرگرم عمل اور مثمر ثمرات و برکات ہیں، ان میں سے ایک بڑا نہایت بافیض و متحرک سلسلہ وہ ہے، جس کا رشتہ حضرت شاہ عبدالقادر رائے پوری کے ذریعہ سے حضرت شاہ عبدالرحیم رائے پوریؒ سے جڑا ہوا ہے۔ حضرت شاہ عبدالقادر کے فیض صحبت سے جن حضرات میں محبت و ایقان کی روشنی اور تعلق اللہ کا نور پیدا ہوا اور پھر ان کے توسط سے ایک دنیا کو خدا آگاہی اور عرفان ذات کا سبق ملا، ان میں سے ایک بڑا اور خاصا معروف نام، حضرت سید شاہ نفیس الحسینی صاحب کا بھی ہے۔

شاہ نفیس صاحب اپنے روحانی کمالات کے علاوہ، ہندوستان اور دنیا کے ایک بڑے حصہ میں، اس عہد میں فن خطاطی کے بے تاج بادشاہ کے نام سے مشہور تھے، شاہ صاحب کو ہر اک اسلامی خط کی کتابت پر فنی دسترس حاصل تھی مگر شاہ صاحب کے روحانی کمالات اور ارشاد و تربیت کا فیضان پیشتر پاکستان میں مثمر و بار آور تھا، ہندوستان میں شاہ صاحب کی روحانی حیثیت کا اس قدر تذکرہ نہیں تھا، جس قدر ان کے کمال فن (خطاطی) کا تعارف اور پذیرائی تھی۔

گزشتہ سال ۲۶/محرم الحرام ۱۴۲۹ھ۔۵/فروری ۲۰۰۸ء کو لمبی بیماری کے بعد حضرت شاہ صاحب کی وفات ہوگئی تھی، ناچیز مرتب احوال و آثار کی تحریرات سے شاہ صاحب کا جو گہرا تعلق تھا اور شاہ صاحب اس پر جو کرم فرماتے تھے، اس کا مطالبہ اور تقاضا تھا کہ شاہ صاحب پر احوال و آثار کا ایک خاص شمارہ شائع کیا جائے، مگر اس سے پہلے کہ اس کا موقع آتا، معلوم ہوا کہ ادھر پاکستان میں کئی ادارے اور مجلات و رسائل شاہ صاحب پر چھوٹے بڑے خاص شمارے شائع کرنے کا اعلان کر چکے ہیں۔ چند اور انتظامات میں مصروف ہیں اور وہ بھی بڑے نمبر شائع کریں گے، اس لئے اس خیال کی تکمیل نہ ہو سکی، اسی دوران دو متوسط مگر خوبصورت شمارے، ہفت روزہ ختم نبوت کراچی اور ماہ نامہ الاحرار لاہور کے ربیع الاول ۱۴۲۹ھ فروری، مارچ ۲۰۰۹ء کے چھپے ہوئے، شاہ صاحب کے خادم خاص، محترم جناب محمد رضوان صاحب کی عنایت سے موصول ہوئے [فجزاہ اللہ تعالیٰ]۔

یہاں ان ہی دونوں میں سے چند مضامین شائع کئے جا رہے ہیں، صرف راقم سطور نور الحسن راشد کاندھلوی کی تحریر، ایسی ہے جو پہلی مرتبہ چھپ رہی ہے۔

مذکورہ دونوں خاص اشاعتوں کے تقریباً ایک سال بعد، ماہ نامہ الحق لاہور کا حضرت شاہ صاحب پر نہایت وقیع، بہت ضخیم اور شاندار بلکہ تاریخی خاص نمبر چھپا ہے۔ اس کو دیکھ بلا تکلف کہا جا سکتا ہے کہ الحسن اور ان کے منتظمین نے شاہ صاحب سے تعلق کا حق ادا کر دیا، اعلیٰ درجہ کی کمپوزنگ، نہایت عمدہ باریک کاغذ، صاف طباعت، بہت مضبوط جلد اور دلکش ٹائٹل، ہر اک لائق تعریف اور قابل دید ہے، ڈیڑھ ہزار صفحات [۱۴۶۴] پر مشتمل، اس قیمتی مجموعہ میں ایسے دسیوں مضامین ہیں، جن کو احوال و آثار میں بھی آنا چاہئے تھا، مگر افسوس کہ یہ تحفہ اس وقت ملا، جب اس شمارہ کے مضامین اور اوراق ترتیب صفحات مکمل ہو چکی تھی، اضافہ کی گنجائش نہیں تھی، اس لئے یہی بضاعت مزجات اپنی کم مائیگی کے اعتراف کے ساتھ حاضر ہے۔

گر قبول افتد زہے عز و شرف

(نور)

حضرت شاہ سید نفیس الحسینی

عصر حاضر کی ایک عظیم روحانی و علمی شخصیت

مولانا عیسیٰ منصوری صاحب (لندن)

حضرت سید نفیس الحسینی قدس اللہ سرہٗ عصر حاضر کی عظیم روحانی و دینی اور علمی شخصیت تھے، آپ برصغیر کے اہل اللہ کے اس سلسلۃ الذہب کی آخری کڑی تھے، جنہوں نے مسلمانان برصغیر کے دلوں میں دینی زندگی اللہ کے تعلق ومحبت اور ایمان وایقان کی شمعیں روشن رکھیں۔ آپ کی عظیم شخصیت پر گذشتہ چھ ماہ میں بہت کچھ لکھا گیا اور لکھا جاتا رہے گا، کیونکہ دور حاضر کی ظلمتوں عذلتوں اور خدا فراموشی کی فضا میں ایسے نقوش قدسیہ کا وجود امت مسلمہ پر اللہ تعالیٰ کا خاص انعام واحسان ہوتا ہے، جو اپنی ایمانی حرارت، تعلق مع اللہ اور اخلاق فاضلہ کی بدولت خاموشی سے لاکھوں دلوں میں اللہ کی یاد اور ایمان وایقان کے چراغ روشن کرجاتے ہیں۔

حضرت شاہ صاحب پر متعدد دینی وعلمی رسالے وادارے خاص نمبر شائع کررہے ہیں، اس سیہ کار کے پاس تقریباً ۵-۶ ماہ پہلے حضرت مولانا فضل رحیم صاحب دامت برکاتہم (جامعہ اشرفیہ لاہور) کی طرف سے لکھنے کا تقاضا آیا تھا، بندہ نے یہ سوچ کر معذرت کردی تھی کہ پاکستان میں ماشاء اللہ بہت سے ایسے حضرات موجود ہیں، جنہوں نے حضرت شاہ صاحب کو بہت قریب سے دیکھا اور عرصہ تک استفادہ کیا، یہ ان کا حق ہے، مجھ جیسا دور افتادہ شخص (جسے حضرت شاہ صاحب کی خدمت میں حاضری کے بہت کم مواقع مل سکے) کا کچھ لکھنا بے جا جسارت ہوگا، اس لئے عذر کرکے دامن بچالیا کہ اب اگست ۲۰۰۸ء کے اواخر میں اچانک دوبارہ لکھنے کے تقاضے نے شدت اختیار کی، پے در پے متعدد فون ان حضرات کی طرف سے لاہور سے آئے، جس نے بندہ کے لئے جائے فرار کی گنجائش نہیں چھوڑی، تو سوچا کہ حضرت کے برطانیہ کے سفر کی چند یادیں آپ کا اعلیٰ علمی ذوق آپ کی خصوصیات پر اپنے تأثرات کا اظہار کرکے، حضرت اقدس پر لکھنے والوں کی آخری صف میں شمولیت کی سعادت حاصل کرلوں۔

حضرتؒ کا اسم گرامی پڑھنے کے زمانہ ہی میں حضرت رائے پوریؒ سے تعلق رکھنے والے بزرگوں کی زبان سے آپ کے پاکستان کے سب سے بڑے خطاط کی حیثیت سے سنا تھا، بندہ جب ۱۹۷۵ء میں برطانیہ منتقل ہوا تو پاکستان کے اہل علم اور اہل اللہ سے واقفیت اور ملنے کے مواقع مزید بڑھے، یہاں پاکستان کے بہت سے اہل علم سے حضرت کی باغ و بہار شخصیت کے بارے میں باتیں سننے میں آتی رہیں اور آپ کے کلام (شاعری) کے اعلیٰ نمونے نظر سے گزرتے رہے، لیکن عرصہ تک زیارت نہ ہو پائی، حتی کہ ۱۹۸۸ء میں پاکستان کا پہلا سفر ہوا لاہور میں میرے خاص کرم فرما، مولانا عبدالرشید ارشد (مصنف بیس بڑے مسلمان) اور مولانا محمود میاں دامت برکاتہم (مہتمم جامعہ مدنیہ لاہور) حضرت سے بہت قریبی تعلق رکھنے والوں میں نکلے۔ لاہور میں میرا قیام ہمیشہ مولانا محمود میاں مدظلہ العالی کے پاس جامعہ مدنیہ میں رہا اور حضرت شاہ صاحب کا قیام بھی جامعہ مدنیہ کے متصل ہی تھا، پہلی بار حضرت شاہ صاحب کی خدمت میں صبح کی مجلس میں حاضری کے وقت ہوتا رہا اور دل پر ویسا ہی اثر ہوا جیسا کہ ماضی میں اللہ کے خاص الخاص بندوں، حضرت جی مولانا یوسفؒ، حضرت شیخ الحدیث مولانا زکریاؒ، حضرت شاہ وصی اللہ فتحپوری ثم الہ آبادی کی زیارت کے وقت ہوتا رہا۔ بندہ سمجھتا تھا کہ اب شاید ایسی دلی کیفیت نصیب نہ ہو سکے۔ حضرتؒ کی شخصیت میں ایک خاص جذب و کشش کی کیفیت محسوس ہوئی، انتہائی سادگی تواضع، مسکنت اور ہر ایک پر بے پایاں شفقت والطاف وعنایات، عرصہ سے یہ باتیں عنقا ہوتی جا رہی ہیں۔

غالباً ۱۹۹۸ء میں اچانک لندن کے ختم نبوت سینٹر سے فون آیا کہ ختم نبوت کی سالانہ کانفرنس کے سلسلہ میں حضرت شاہ صاحب تشریف لائے ہیں، بندہ فوراً حاضر خدمت ہوا تو فرمایا: میں ختم نبوت کے عنوان سے ایک ایسے علمی کام کے لئے آیا ہوں جس کے لئے چالیس سال سے تڑپ رہا ہوں، جو میرے دل کا زخم ہے، بہت سوں کو کہا مگر کسی نے کر کے نہ دیا، اس لئے خود آنا پڑا۔ بندہ نے عرض کیا حضرت حکم فرمائے وہ کیا کام ہے، فرمایا میرے جد امجد حضرت خواجہ محمد الحسینی الملقب بندہ نواز گیسو دراز (گلبرگہ) کی تحریر فرمودہ تفسیر قرآن مجید اور متعدد کتب کے قلمی مخطوطات، یہاں انڈیا آفس لائبریری میں محفوظ ہیں، مجھے ان تک رسائی، استفادہ اور انکی نقول چاہئیں (حضرت خواجہ گیسو درازؒ حضرت خواجہ نصیر الدین دہلوی خلیفہ حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے خلیفہ ہیں، چشتی سلسلہ میں آپ واحد شخصیت ہیں جو کثیر التصانیف ہیں، خوش قسمتی سے آپ کی تحریر کردہ تفسیر

قرآن اور متعدد کتب کے قلمی نسخے، یہاں انڈیا آفس لائبریری میں محفوظ ہیں) حضرت شاہ صاحب حضرت خواجہ کی نسبی اولاد میں ہیں، اس لئے آپ پر بھی مطالعہ وتحقیق کا رنگ غالب تھا، انڈیا آفس لائبریری مشہور عالم برٹش لائبریری کا حصہ ہے، یہاں برصغیر کا عظیم علمی خزانہ جمع ہے۔ میرا خیال ہے برصغیر کے ۸۰/۷۰ فیصد کے قریب قلمی نسخے ومخطوطات یہاں ہوں گے، بقول اقبال:

مگر وہ علم کے موتی کتابیں اپنے آبا کی
جو دیکھیں ان کو یورپ میں تو دل ہوتا ہے سی پارہ

پہلے جن اکابر علماء کو یہاں آنے کا موقع ملتا ان کی پہلی خواہش وترجیح انڈیا آفس لائبریری ہوتی، جیسے حکیم الاسلام حضرت قاری محمد طیب صاحب مفکر اسلام حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی حضرت مولانا مجاہد الاسلام قاسمی وغیرہ وغیرہ، اب عرصہ سے ہمارے علمائے کرام کے شیڈول سے انڈیا آفس لائبریری خارج ہے۔ شاید اسی کا نام علم کا زوال یا رفع علم ہے۔

بندہ نے محسوس کیا کہ حضرت شاہ صاحب انڈیا آفس لائبریری کے لئے بہت بے کل ومضطرب ہیں، تو اسی وقت سلیم قریشی صاحب کو فون پر صورت حال بتائی (جو ان دنوں لائبریری میں اردو فارسی عربی شعبہ کے انچارج تھے) انہوں نے فرمایا ابھی لے آیئے، میں نے عرض کیا پہنچنے تک لائبریری بند ہونے کا وقت نہ ہو جائے فرمایا حضرت کے لئے کھلی رہے گی۔ انڈیا آفس لائبریری میں داخلہ کے لئے اس کا باقاعدہ ممبر ہونا بھی ضروری ہے، حضرت کے لئے اس شرط سے بھی استثناء ہوگیا، یہ لائبریری سٹی سینٹر میں ہے سہولت اور وقت کی بچت اسی میں تھی کہ انڈر گراؤنڈ ٹرین سے جائیں، بندہ اور مفتی برکت اللہ صاحب حضرت کو لیکر روانہ ہوئے، رش اور ازدہام کا وقت تھا، ٹرین میں ایک عجیب منظر سامنے آیا، دو تین تعلیم یافتہ گورے (انگریز) نوجوان حضرت کے وجیہ نورانی چہرہ مبارک کو ٹکٹکی باندھے دیکھ رہے تھے، وہ اچانک اٹھ کر حضرت کے سامنے ہندوؤں کی طرح ہاتھ جوڑ کر کھڑے ہوگئے اور دعا کے ملتجی ہوئے، ہم لوگ جو برسہا برس سے لندن میں رہتے آئے ہیں، ہمارے لئے یہ اس قسم کا پہلا تجربہ تھا (شاید جہاں گھٹا ٹوپ اندھیرا ہو تو جگنو کی روشنی بھی محسوس ہو جاتی ہے)

یہاں کے فحش وبے حیائی معصیت ومنکرات کے ماحول میں، اللہ کا ایک ولی جو اکابر اسلاف کی روحانی دولت کا امین ہے، سفر کر رہا تھا اور برطانیہ کے متعدد اعلیٰ تعلیم یافتہ انگریز دعا کے ملتجی! حضرت پورے ڈبہ

کے توجہ کا مرکز بن گئے اور لوگ بھی حضرت کی جانب متوجہ ہوگئے، بندہ نے عرض کیا حضرت یہ سب لوگ دعا کے ملتجی ہیں، سب کی ہدایت کے لئے دعا فرمادیجئے۔ اس وقت پہلی بار خیال پیدا ہوا ہمارے بہت سے خانقاہی بزرگوں اور دوستوں کی یہاں مسلسل تشریف آوری ہوتی رہتی ہے، کاش وہ یہاں اپنا کام (ذکر وشغل اورادووظائف) بند کمروں میں کرنے کے بجائے کسی ایسی کھلی جگہ پر کیا کریں، جہاں لوگوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ ہوتے ہیں، جیسے پارک تفریح گاہیں وغیرہ وغیرہ، تو شاید بہتوں کو روحانی خلاء کا احساس ہو۔

بہرحال ٹرین کے ذریعہ انڈیا آفس لائبریری پہنچے جو اس وقت بلیک فائر (BLACK FRIARS) کے علاقہ میں تھی، اب اس سے ہی اہم جگہ عین سٹی سینٹر کے مشہور کینگ کراس اور یوسٹن اسٹیشن کے درمیان کئی ملین (ارب) پاؤنڈ کی لاگت سے نہایت خوبصورت نئی اور عظیم الشان عمارت میں منتقل ہوگئی، یہاں جب بھی جایئے دنیا بھر کے مختلف ملکوں سے تعلق رکھنے والے بے شمار اسکالرز کتب بینی ومطالعہ، ریسرچ وتحقیق میں مصروف نظر آئیں گے جن میں یہودی، عیسائی، بڈھسٹ ہندو، ہر مذہب ونسل کے لوگ ہوں گے، اگر نہیں نظر آئیں گے تو مسلمان!! (خاص طور پر دینی طبقہ) جبکہ برصغیر کی پوری تاریخ، ہمارے اکثر اکابر اہل اللہ اور اہل علم کے قلمی مخطوطے، سلطان ٹیپو شہید کا پورا کتب خانہ مغل دور کے علمی نوادرات، حضرت اورنگ زیب عالمگیر سمیت بہت سے مغل حکمرانوں کے نکاح نامے تک اور دور صحابہؓ (مصحف عثمانیؓ وحضرت حسن بن علیؓ) سے اب تک، ہر دور کے قرآن کے قلمی نسخے وغیرہ وغیرہ بیش بہا خزانہ یہاں ہے۔

۱۹۷۹ء میں جب بندہ لندن منتقل ہوا تھا عبدالحق صاحب (جو ان دنوں اردو فارسی عربی شعبہ کے انچارج تھے) نے کئی بار تمنا ظاہر کی اگر ۴-۵ مولوی صاحبان ہفتہ میں ۲-۳ بار گھنٹہ گھنٹہ کے لئے تشریف لے آیا کریں، تو ہم ان کے نام سے دنیا بھر میں شائع ہونے والی اردو عربی فارسی کی جدید مطبوعات ورسائل (سالانہ ہزاروں لاکھوں پاؤنڈ مالیت کی) منگواسکتے ہیں۔ بندہ نے ان دنوں متعدد علمائے کرام کی خدمت میں گذارش کی مگر صدائے برنخواست! اب بھی یہی حال ہے، جب کہ صرف لندن شہر میں درجن بھر دارالعلوم اور سینکڑوں علمائے کرام موجود ہیں، بہرحال حضرت جس دن لندن پہنچے اسی دن پہلی فرصت میں لائبریری میں تھے، سلیم قریشی صاحب نے نہایت احترام سے حضرت کو ایک کرسی پر بٹھا کر، ایک تجربہ کار لائبریرین کی ڈیوٹی لگادی کہ جو کتاب حضرت طلب فرمائیں پیش کردی جائے۔ بندہ ذرا ایک طرف ہٹ کر بیٹھ گیا، بندہ زندگی بھر اس

بات کو فراموش نہیں کر سکتا حضرت شاہ صاحبؒ ایک مخطوطہ طلب فرماتے اور آدھ پون گھنٹہ اس طرح ملاحظہ فرما لیتے جیسے کوئی بار بار پڑھی ہوئی کسی کتاب کو دیکھ رہا ہو، اور نوٹ کروا دیتے تھے کہ یہ پوری کتاب یا اس کے کچھ حصہ کی فلم چاہئے۔ بندہ بغور دیکھتا رہا میرے لئے یہ بات بڑی حیرانی کی تھی کہ ایک شخص زندگی میں پہلی بار کوئی مخطوطہ یا قلمی نسخہ دیکھ رہا ہے اور اس طرح گویا اس پر پہلے ہی عبور حاصل ہے، چند گھنٹوں میں بہت سے مخطوطات دیکھ ڈالے اور جو چاہئیں تھے اس کے آرڈر دے دیئے۔

ان گوروں کی علم نوازی کی داد دیجئے، ایسے بیش بہا مخطوطوں کی میکروفلم بغیر پیسوں کے مفت فراہم کر رہے ہیں، اور ان ہزار ہا بیش قیمت مخطوطات کی حفاظت کے لئے سالانہ لاکھوں پاؤنڈ خرچ کر رہے ہیں، انہیں اس طرح سنبھال کر رکھا ہے کہ موسم کی خشکی و گرمی یا سردی و نمی کاغذ اور روشنائی پر اثر انداز نہ ہو۔ کس قسم کے کاغذ اور روشنائی کے لئے سائنسی طور پر کس درجہ کا ٹمپریچر (درجۂ حرارت) چاہئے سب کا اعلیٰ انتظام ہم کہتے تو یہی ہیں کہ یہ لٹیرے ہمارا علمی خزانہ اور ہمارے اسلاف اور بزرگوں کی زندگی بھر کی علمی محنت لوٹ کر لے آئے، مگر یہ سوچنے کی بات ہے کہ یہ بیش بہا خزانہ اور اس سے ہمارے ملکوں میں ہوتا تو کیا اب تک اس طرح محفوظ رہ پاتا اور اتنی آسانی سے استفادہ ہو پاتا، بہر حال جب حضرت فارغ ہوئے مجھ سے فرمایا، آج میری برسوں کی پیاس بجھی ہے اور چالیس سالہ بے قراری کو قرار ملا ہے، آپ کی وجہ سے یہ سخت مرحلہ اتنی آسانی سے طے ہو گیا، غرض بڑی دعاؤں سے نوازا۔ میں نے حضرت کے چہرۂ مبارک پر بڑی بشاشت و طمانیت محسوس کی، یہ چیز بھی میرے لئے نئی دریافت تھی، کیا آج کے دور میں ہمارا وہ طبقہ جو خانقاہی نظام یا تصوف وسلوک سے تعلق رکھتا ہے، وہ علم کا ایسا شائق وجویا ہے۔ حضرتؒ کی علمی جستجو وطلب اور ذوق آگہی دیکھ کر، میں نے فیصلہ کیا حضرت جب تک یہاں رہیں گے، جس قدر ممکن ہو سکا حضرت کی خدمت میں حاضری دوں گا۔

رفیق محترم مولانا زاہد الراشدی صاحب بھی اتفاق سے ان دنوں یہیں تھے، میں نے حضرت کے علمی ذوق وشوق کا تذکرہ کیا تو فرمایا، پاکستان میں ہمارے حلقہ میں، اس وقت میری نظر میں حضرت شاہ صاحب سے زیادہ وسیع مطالعہ دوسرا شخص نہیں ہے۔ اس لئے آپ حضرات کی تشریف آوری کو اپنے لئے غنیمت سمجھیں اور جس قدر علمی استفادہ کر سکتے ہوں دریغ نہ کریں۔ جب بھی موقع ملتا میں استفادہ کے لئے حاضر ہو کر کوئی سوال پوچھ لیتا، پھر کیا تھا حضرت کیطرف سے گویا دریا کا بند کھل جاتا، وہ حقائق ومعلومات سامنے آئیں، جو

شاید کتب خانے کھنگالنے سے بھی نہ مل سکتے ،موضوع خواہ کوئی ہو تاریخ، سیرت، مشائخ چشت وخاندان مجددی کے احوال، جنگ آزادی کی تاریخ، قرامطی ملاحدہ کی تاریخ، سکھوں کی تاریخ وغیرہ یعنی مولانا راشدی صاحب کی بات کا خوب خوب تجربہ ہوا۔ بیسویں صدی کے برصغیر کے اکابر ومشائخ کے متعلق تو گویا آپ انسائیکلو پیڈیا تھے، خاص طور سے آپ کے شیخ حضرت رائے پوری سے ایسا والہانہ وعاشقانہ تعلق اگر حضرت کا تذکرہ چھڑ جاتا تو ایک خاص کیفیت سے بولتے جاتے ،دونوں حضرت رائے پوری (حضرت شاہ عبدالرحیم اور حضرت شاہ عبدالقادرؒ) کے متعلق چھوٹی سے چھوٹی چیز حافظہ میں محفوظ، حالانکہ آپ کو اپنے شیخ کے ساتھ بمشکل چند سالہ رفاقت ملی ہوگی، مگر یہ خبر یہ صادق اور محبت وعشق کی جادوگری، گویا ہر وقت سامنے ہوں۔

حضرت شاہ صاحب کا ختم نبوت کے سلسلہ میں برطانیہ کے متعدد شہروں کا سفر بھی ہوا، عمومی بیانات سے تو حتی الامکان مجتنب رہے، البتہ خصوصی مجالس میں بیش بہا گفتگو فرماتے ،جس مجلس میں ہوتے گویا مجلس کو رحمت وسکینت ڈھانپ لیتی، حضرت کے وجیہ پر شکوہ نورانی چہرے سے نظریں نہیں ہٹتیں، حاضرین کے دل ذکر الٰہی کی طرف متوجہ رہتے ،لندن کے قیام کے دوران ختم نبوت سینٹر میں زیادہ تر ایک حجرے میں عزلت نشین رہتے ،یہی وقت حضرت سے بھرپور علمی استفادہ کا ہوتا تھا۔

حضرت شاہ صاحب کے علمی ذوق کا ایک اور نمونہ

حضرتؒ کے علمی وتحقیقی ذوق کا یہ عالم تھا کہ ۲۰۰۶ء کے پاکستان کے سفر میں، ایک بار بندہ نے اثنائے گفتگو عرض کیا حضرت مولانا گل کا کاخیلی (اسیر مالٹا) کی اہلیہ کا تعلق برطانیہ کے شاہی خاندان سے تھا، وہ انگریزی زبان وادب میں خاص مقام رکھتی تھیں، ان کا انگریزی ترجمہ وتفسیر آپ کی توجہ سے چھپ جائے تو بہت اچھا ہو۔ تو فرمایا میں اس ترجمہ وتفسیر کے حصول کے لئے برسہا برس سے سرگرداں ہوں تلاش میں حضرت مولانا عزیز گلؒ کے پاس بھی آدمی دوڑایا، مگر وہ کسی کو طباعت کے لئے دے چکے تھے، ان کے پاس کوئی کاپی بھی نہیں تھی، میں نے عرض کیا حضرت اس ترجمہ کا ایک نسخہ جدہ ایک کراچی اور ایک برطانیہ میں مولانا فاروق ملانی (لیسٹر) کے پاس ہے، بآسانی فراہم ہوسکتا ہے۔ یہ سن کر حضرت حصول کے لئے مضطرب ہوگئے، حضرت کا ذوق وشوق اور اضطراب دیکھ کر میں نے مولانا فاروق صاحب سے کہا، بھائی ہمارے حضرت اس انگریزی ترجمہ کے لئے بہت بے چین ہیں، جلد حضرت کو پہنچایئے، چنانچہ جب مولوی فاروق صاحب نے حضرت کو پہنچایا (آخری علالت سے کچھ پہلے) تو وفور شوق سے حضرت کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

حضرت اگر صحت کی حالت میں ہوتے تو آناً فاناً چھپ چکی ہوتی اور حضرت کو اس کے چھپنے سے جو مسرت ہوتی وہ بیان نہیں کی جا سکتی، اب وہ لاہور میں حضرت کے ایک خاص مرید و معتقد، مکتبہ المصابیح کے مالک وبانی کے پاس ہے۔ پتہ نہیں طباعت کے کس مرحلہ میں ہے، خدا کرے جلد طبع ہو جائے تو اس میں حضرت مولانا عزیز گل اور حضرت شیخ الہند کے علوم کی جھلک اور برطانیہ کے شاہی خاندان کی انگریزی زبان وادب کا حسین امتزاج ہوگا (حضرت مولانا عزیز گل حضرت شیخ الہند کے خادم خاص اور معتمد تھے، طویل زندگی پائی، غالباً ساتویں دہائی میں وفات پائی۔ ساری زندگی فقر وفاقہ اور زہد وجفاکشی کے مجاہدے میں رہے، ان کا قیام ایسی جگہ تھا جو گویا جنگل تھا، وہ شاہی خاندان کی خاتون بھی، آخرت کی فکر میں زندگی بھر بخوشی ہر قسم کے مجاہدے جھیل کر، مولانا عزیز گل کی خدمت میں کوشاں رہی۔

حضرت مولانا عزیز گل کی اہلیہ محترمہ کے حالات زندگی اور خصوصیات پر مشتمل مبسوط تذکرہ مولانا عدنان کا کاخیل (استاذ جامعہ بنوری ٹاؤن کراچی) نے لکھا ہے، جو حضرت مولانا عزیز گل کے بھائی، حضرت مولانا نافع گل (شاگرد رشید مولانا انور شاہ کشمیریؒ) کے پوتے ہیں، آپ پاکستان کے واحد نوجوان ہیں، جنہوں نے بھری اسمبلی میں جنرل مشرف کے روبرو سخت ترین الفاظ میں ان کے خلاف تقریر کر کے ہنگامہ برپا کر دیا تھا، یہ تقریر ویب سائٹ پر اب بھی دیکھی اور سنی جا سکتی ہے۔ مولانا فاروق ملّان صاحب کے بقول، بڑی کاوش کے باوجود مولانا عدنان گل صاحب سے اب تک ان کی دادی صاحبہ کے حالات زندگی وتذکرہ حاصل نہیں کیا جا سکا، خدا کرے وہ بھی ساتھ ہی چھپ جائے۔

برطانیہ میں حضرت شاہ صاحب کی دوسری بار تشریف آوری غالباً ۲۰۰۱ء میں ختم نبوت کے قافلہ کے ساتھ ہوئی، اس موقع کو غنیمت سمجھتے ہوئے میں حضرت کی خدمت میں کثرت سے حاضری دیتا رہا۔ لندن میں میرا گھر (فلیٹ) ساتویں فلور پر ہے، اتفاق سے ان دنوں اکثر لفٹ خراب رہتی تھی، اس لئے حضرت کو غریب خانہ پر مدعو کرنے کی جرأت نہ کر سکا، کہ کہیں لفٹ بند ہو تو حضرت کو بڑی دقت ہوگی، لیکن حضرت متعدد بار غریب خانہ پر تشریف لائے، میں شرمندہ ہوتا تو فرماتے دوستوں کی دلجوئی ودلداری سے اللہ کی طرف سے بڑے انعامات ملتے ہیں۔

حضرت شاہ صاحب کے چند امتیازات وخصوصیات

ہمارے حضرت پر اپنے جد امجد حضرت

سید محمد الحسینی گیسودرازؒ کا رنگ وذوق غالب تھا، وہی علمی شغف وہی شاعری کا ذوق، وہی اللہ کے عشق ومحبت کی سرمستی، وہی خدمت خلق، وہی عصری تقاضوں کی رعایت، گویا آپ موجودہ دور کے خواجہ گیسودراز تھے۔ حضرت سید محمد الحسینی (خواجہ گیسودراز) کی تصانیف کی تعداد ایک سو پانچ بتائی جاتی ہے، سیر محمدی میں اکتیس کتابوں کے نام گنائے گئے ہیں، جو زیادہ تر تصوف میں ہیں، قرآن مجید کی تفسیر بھی سلوک کے رنگ میں ہے۔ آپ نے کشاف کے طرز پر ایک اور تفسیر شروع کی تھی، جو پانچ سپاروں سے آگے نہ جاسکی، کشاف پر آپ کے حواشی بھی ہیں، آپ کے مکتوبات بھی شائع ہوگئے ہیں، آپ کی زیادہ تر تصانیف فارسی میں ہیں، لیکن عوام کی تبلیغ وتلقین کے لئے بعض رسالے مقامی دکنی زبان میں بھی ہیں، ان میں سے معراج العاشقین چھپ چکی ہے، جو قدیم اردو یا دکنی زبان کی سب سے پہلی مطبوعہ کتاب سمجھی جاتی ہے۔ آپ شاعر بھی تھے آپ کا دیوان شائع ہوچکا ہے، زیادہ تر غزلیں ہیں، جن میں عام عاشقانہ رنگ میں خیالات وجزیات کا اظہار کیا گیا ہے، حتی کہ مرشد (حضرت چراغ دہلیؒ) کی تعریف میں بھی یہی پیرایہ استعمال ہوا ہے۔ ایک قطعہ میں علم اور کتابوں کے یہ عاشق، کسی کتاب کی خواہش کو بحسن وخوبی اس طرح ٹالتے ہیں:

معشوقۂ من کتاب من شد　　بستہ دل من بدو کشادہ است

گوئی مرا بعاریت دہ　　معشوقہ بعاریت کہ دادہ است

[آب کوثر ص: ۴۷۱]

حضرت کو اپنے سلسلہ کے بزرگوں اہل بیت کرام اور خاص طور سے ریحانۃ الجنۃ سیدنا حضرت حسنؓ وسیدنا حضرت حسینؓ سے ایسا والہانہ وعاشقانہ تعلق تھا، جو ہر وقت چھلکتا تھا۔ آخری عمر میں ان حضرات کے فضائل ومناقب اور خصوصیات پر ضخیم ضخیم کتب شائع فرمائیں، چونکہ خود نسباً سید تھے اس لئے حسنی وحسینی سلسلہ کے ہر کہ ومہ پر مرمٹتے تھے، خاص طور پر امیر المؤمنین حضرت سید احمد شہید بریلوی کی ذات مبارک سے تعلق دیدنی تھا، آپ کے نام سے لاہور میں مکتبہ سید احمد شہید اپنے خاص مرید متعلق کے ذریعہ قائم فرما کر سرپرستی فرمائی اور حضرت سید صاحب کے ہی نام پر خانقاہ سید احمد شہید بنائی، جو لاہور میں نہایت پرفضا مقام پر ایک باغ کے اندر نہایت وسیع وعریض اور پرسکوں جگہ ہے۔ وقائع احمدی حضرت سید صاحب کے احوال وواقعات کا روزنامچہ، بڑے سائز کی کئی ہزار صفحات پر مشتمل کتاب، حضرت کے حکم پر آناً فاناً چھپ کر دنیا جہاں میں پہنچ گئی۔ بالاکوٹ میں حضرت سید احمد صاحب کے نام پر ایک عظیم دینی وعلمی جامعہ کے قیام کے لئے طویل عرصہ

سے کوشاں تھے، زلزلہ کی تباہی کے بعد یہ عزم مزید پختہ ہوگیا تھا، حضرت کے متعلقین کو حضرت کی اس خواہش پر توجہ کرنے کی ضرورت ہے۔

حضرت شاہ صاحب پاکستان کے مسلمہ طور پر سب سے بڑے خطاط تھے، آپ کا خط انتہائی پاکیزہ نفیس اور خوشنما تھا گویا موتی لڑی میں پروئے گئے ہوں ۲۰۰۰ء میں اسلام آباد کی FAST یونیورسٹی نے عامۃ الناس کے لئے، آپ کے خط کو بغیر کسی حقوق محفوظ کئے ہوئے، اوپن سسٹم انٹرنیٹ پر عام کردیا۔ پاکستان میں تو سب سے مقبول آپ کا خط تھا ہی، اب بیرونی دنیا میں بھی حضرت ہی کے خط کا فیض عام ہے۔ یورپ کی ٹی وی نیوز ریڈنگ سوفٹ ویر بنانے والی، کمپنی جو بی بی سی سمیت اکثر بڑی نیوز چینلوں کو سپلائی کرتی ہے، اس نے حضرت کا خطِ نفیس FAST سے لیکر پورا سسٹم تیار کرلیا (اکثر چینلوں اور ٹی وی نیوز کے نیچے جو خبروں کی پٹی چلتی ہے، وہ حضرت ہی کا نفیس خط ہے) نہ جانے کتنے T.V نیوز ریڈر حضرت کے خط سے آج تک مستفید ہورہے ہیں، یہ سب معلومات انٹرنیٹ Wikipediaorg پر دستیاب ہیں۔

اسی طرح ہمارے حضرت کے خانقاہی حلقہ میں سب سے پہلے انٹرنیٹ اور جدید الیکٹرونک میڈیا کی اہمیت محسوس کی، ۲۰۰۷ء میں حضرت کی خدمت میں رمضان المبارک گذارنے کے لئے یہاں سے، بندہ کے ساتھ ابراہیم کالج کے مولانا شمس الضحیٰ اور مفتی برکت اللہ صاحب نے تیاری کی، اتفاق سے بندہ اور شمس الضحیٰ نہ جاسکے مگر مفتی برکت اللہ صاحب پہنچ گئے، بندہ کو ایک مکتوب میں مفتی برکت اللہ صاحب رمضان المبارک ۲۰۰۷ء اور الیکٹرانک خانقاہ کے عنوان سے لکھتے ہیں۔

"تاریخ تصوف میں غالباً یہ پہلا موقع (میرے علم و تجربہ کی حد تک) تھا کہ انٹرنیٹ اور الیکٹرانک میڈیا کا استعمال بطور عبادت و ریاضت کیا گیا، حضرت کی خانقاہ میں ۲۴ گھنٹہ کوئی نہ کوئی ارادت مند باری باری لگا کر ذخیرہ کتب کو اسکین (Scan) کرکے انٹرنیٹ پر جاری کرنے میں لگا ہوا تھا، تقریباً چالیس کتابیں جن میں چند صفحات سے لے کر ڈھائی ہزار صفحات پر مشتمل کتاب "وقائع سید احمد شہید" تک انٹرنیٹ پر لوڈ کردی گئی جو ہر وقت NAFEES LIBRARY.ORG پر دیکھی جاسکتی ہے اور پرنٹ بھی کی جاسکتی ہے۔ اس انقلابی طریقہ کار سے ہمارے اسلاف کی تمام تر وراثت اور علمی سرمایہ الیکٹرانک شکل میں

محفوظ اور قابل استعمال ہو گیا ہے، امید ہے کہ ہمارے تمام ملی اور قومی ادارے و جامعات حضرت شاہ صاحب کی اس سنت حسنہ پر عمل کر کے اسلاف کے کارناموں کو محفوظ و عام کریں گے، تا کہ کسی چنگیزی یلغار کے نتیجہ میں ہماری آنے والی نسلیں اپنے ماضی اور علمی وثقافتی سرمایہ سے جدا نہ ہو سکیں"

حضرت کی شاعری (جس میں تقریباً تمام اصناف شامل ہیں) اس قدر پر شکوہ، جاذب و دلکش اور عشق و معیت کی سرمستی لئے ہوئے ہے کہ برصغیر کے تمام دینی علمی حلقوں میں گذشتہ پوری صدی میں فرد فرید نظر آتے ہیں۔ ادھر چند سالوں سے آپ کی شخصیت پاکستان کے تمام دینی علمی وفکری حلقوں میں ایک طرح متفقہ سرپرست و مرجع اور مسلمہ بزرگ کی حیثیت اختیار کر گئی تھی، خواہ مجلس ختم نبوت ہو، جمیعۃ علماء ہو، دینی مدارس ہوں جہادی تحریکیں ہوں تبلیغی حلقہ ہو، مدنی تھانوی اور دیگر متوسلین تصوف ہوں دیوبند مظاہر علوم ندوہ سے وابستہ علماء ہوں یا علمی وفکری میدانوں میں سرگرداں حضرات، حضرت شاہ صاحب کی شفقتیں عنایات والطاف سب ہی پر یکساں تھیں اور سب ہی حضرت کو اپنا سرپرست و مربی، دعا گو اور مرجع و ماویٰ سمجھنے لگے تھے۔

حضرت شاہ صاحب سے ملاقات کے وقت میری قلبی کیفیت

۱۹۶۳ء میں جب جامعہ حسینیہ راندیر ضلع سورت (بھارت) میں میری طالب علمی کا دوسرا سال تھا، حضرت شیخ الحدیث مولانا زکریا سے بیعت ہوا تھا، اس وقت حضرت شیخ کے پاس رمضان المبارک میں بمشکل ۲۵-۳۰ حضرات ہوتے تھے۔ میرے والد مرحوم کو چونکہ دینداری تبلیغی جماعت کی بدولت نصیب ہو گئی تھی اور تبلیغ کی ہی برکت سے والد نے میری تعلیم کا رخ عصری تعلیم سے دینی تعلیم کی طرف موڑ دیا تھا میرا بچپن اور شروع جوانی (۱۹۶۲ء سے ۱۹۸۲ء) تک گویا ہمہ تن تبلیغ میں گذرا، حتی کہ مدرسہ کے زمانہ کی تعطیلات بھی حضرت شیخ الحدیث کی خدمت میں ۶۲ء سے ۶۵ء تک رمضان المبارک کا آخری عشرہ گذارنے کا اہتمام رہا، گویا فنا فی التبلیغ تھا۔ حضرت شیخ الحدیث سے کئی بار معمولات پوچھے، ہر بار یہی فرمایا تبلیغ کا کام ہی تمہارے معمولات ہیں، تین تسبیحات اور کچھ تلاوت کا اہتمام رکھو، اس کے بعد ۱۹۷۵ء میں لندن کے شہر کے تبلیغی مرکز کا امام ہو کر برطانیہ آنا ہوا۔

حضرت جی مولانا محمد یوسف کی وفات [۱۹۶۵ء] کے بعد نظام الدین اور تبلیغی کام پر اہل گجرات کا غلبہ ہو رہا تھا، اہل گجرات صاحب ثروت لوگ ہیں، مال کے فتنے بھی اپنا رنگ دکھا رہے تھے، پھر تبلیغی کام

اتنا غالب آیا کہ رمضان المبارک کے چند دن حاضری کا موقع ملتا بندہ اس زمانہ گویا فنافی التبلیغ تھا اب وہ کیفیتیں باقی نہیں رہی تھیں، دس پندرہ سال میرے دل ودماغ کے سخت کشمکش میں گذرے، بچپن اور جوانی تبلیغی اکابرین کے ساتھ گذری تھی، دل میں یہ بات راسخ تھی کہ دعوت وتبلیغ سے بہتر کوئی کام نہیں، دوسری طرف تبلیغ میں مال کا فتنہ بے پناہ حاوی ہورہا تھا، ساری ساری رات بے چینی میں گذرتی، یا اللہ کہاں جاؤں کیا کروں! ان حالات میں مفکر اسلام حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی کی تحریروں نے دل ودماغ کو متاثر کیا اور سہارا دیا، حضرت کی خدمت میں حاضری شروع ہوئی، حضرت کی بے پایاں شفقت وعنایات نے ذہنی کشمکش وعذاب سے نجات دلائی اور طے کیا کہ یکسو ہوکر علمی وفکری کام کروں گا، برطانیہ میں مطالعہ سے نئے افق سامنے آئے ساری دنیا اور ملت اسلامیہ پر صلیبی وصیہونی خونی پنجے گڑے نظر آئے اور دینی حلقے عصر حاضر سے بے تعلق و بے شعور میرے ذہن وفکر کا زاویہ تبدیل ہورہا تھا، اب عالم اسلام پر مغربی فکر وفلسفہ کی یلغار، اسلام پر مغرب کی طرف سے علمی فکری تہذیبی حملوں کا جواب، موجودہ عالمی تناظر میں، عصری فکری سطح کے مطابق، اسلام کے دعوت وپیغام کی ضرورت، اسلام دشمن لابیوں کی نشان دہی وتعاقب وغیرہ وغیرہ، میری سوچ وفکر کا محور وموضوع بنتا گیا، ان دنوں مولانا راشدی کی شکل میں ایک مخلص ہم سفر اور ہم ذوق ساتھی میسر آیا، ہم دونوں کا ذوق وفکر ایک تھا، علماء کرام کو عصری تقاضوں اور چیلنجز کیطرف متوجہ کرنا۔ برسوں تک ہمارے طبقہ میں کوئی ہماری بات سمجھنے کے لئے تیار نظر نہیں آتا تھا، الحمدللہ گذشتہ چند سالوں سے نہ صرف یہاں بلکہ برصغیر کے تینوں ملکوں میں بکثرت علماء کرام متوجہ ہوئے، اب یہ بات کہنے والے بھی بڑھتے جارہے ہیں، میں سمجھتا ہوں یہ سب حضرت شاہ صاحب کی دعاؤں اور توجہات کی برکت ہے۔

بیعت کے سلسلہ میں میری کشش وپنج کی کیفیت اگر چہ میرا موضوع فکری ونظریاتی کام بن گیا تھا مگر دل کے کسی گوشہ میں یہ کسک بار بار اٹھتی کہ کسی اللہ والے کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دیدینا چاہئے لیکن چاہتا تھا جو کام میں کررہا ہوں شیخ سے ان امور میں بھی رہنمائی ملے اور ان امور کی اہمیت بھی ہو۔ غالباً ۱۹۸۶ء کی بات ہے بندہ برطانیہ کے تبلیغی اکابرین کے ساتھ حضرت مولانا سعید احمد خان مکی کے ہمراہ، تبلیغی سفر میں بلجیئم میں تھا، برطانیہ کی تبلیغی مرکزی شوریٰ کے چند دوست اچانک کہنے لگے آپ حضرت جی مولانا انعام الحسن سے بیعت کرلیں، میں نے عرض کیا مجھے حضرت جی سے محبت وعقیدت سب کچھ ہے مگر بیعت کی مناسبت

نہیں پاتا، البتہ دو شخصیات سے بیعت ہونے کے لئے تیار ہوں، جن سے طبعی انسیت ومناسبت پاتا ہوں اول حضرت مولانا سعید احمد خاں مکی دوسرے حضرت مولانا محمد صدیق باندوی۔ شاید ان دوستوں کو فکر تھی کہ میں کسی غیر تبلیغی بزرگ کے حلقہ سے وابستہ نہ ہوجاؤں، انہوں نے حضرت مولانا سعید احمد خاں سے درخواست کی اسے بیعت فرمالیں، کہیں یہ مولانا صدیق احمد یا کسی اور سے وابستہ نہ ہوجائیں، مجھے علم تھا حضرت مولانا سعید احمد خاں پر ہمیشہ انتہائی انکساری، فروتنی، ہیچ مدانی کا غلبہ رہتا تھا، وہ کسی کو بیعت نہیں فرماتے تھے۔ مولانا نے فرمایا میری بھی یہی رائے ہے کہ یہ مولانا صدیق احمد باندوی سے بیعت کرلیں وہ بڑے اہل اللہ ہیں، میرے مخلص دوست ہیں اور تبلیغی کام سے گہرا تعلق رکھتے ہیں، لیکن میں اس کے بعد بھی کسی سے بیعت نہ ہوسکا۔ آخر دل اس بات پر جم گیا جو کام میں کررہا ہوں مناسب ہے، حضرت مفکر اسلام مولانا ابوالحسن علی ندویؒ کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دیدوں، لیکن بدقسمتی سے حضرت سے انتہائی مناسبت، عقیدت وارادت کے باوجود بیعت کی نوبت نہ آئی اور حضرت بھی دنیا سے اٹھ گئے۔

ان حالات میں حضرت شاہ صاحبؒ کی شفقتوں اور عنایتوں نے بندہ کو ڈھانپ لیا، سوچتا اپنے کو حضرت شاہ صاحب کے حوالے کردوں، حتی کہ حضرت کے پاکستان روانہ ہونے کا دن آگیا، میں اور مفتی برکت اللہ حضرت سے الوداعی ملاقات کے لئے ختم نبوت سینٹر جارہے تھے، راستے میں میں نے مفتی صاحب سے کہا کہ اکابرین تیزی سے اٹھ چکے ہیں، میں نے تہیہ کرلیا آج میں اپنا ہاتھ حضرت کو سونپ دوں گا، مفتی صاحب کہنے لگے تب تو میں بھی آج حضرت سے بیعت ہوجاتا ہوں، اس طرح ۲۰۰۱ء میں ہم دونوں حضرت سے بیعت ہوگئے۔

رائے پوری سلسلہ کا ایک خاص امتیاز وخصوصیت میرے ذہن میں حضرت شاہ صاحب سے بیعت کی ایک خاص وجہ یہ تھی کہ رائے پوری سلسلہ میں انتہائی وسعت ظرفی ووسیع القلبی ہے، اس سلسلہ کے اکابرین کی شفقتیں، وتوجہات، دین کے تمام روایتی وغیر روایتی شعبوں میں کام کرنے والوں پر برابر مبذول رہی ہیں، یہ اکابر ہر دینی شعبہ اور کام کی قدر افزائی فرماتے توجہات سے نوازتے آئے ہیں مثلاً مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمن سیوہاروی سے حضرت رائے پوری ہی فرماسکتے تھے کہ تم نے جو چند دنوں (۱۹۴۷ء کے قتل عام وفسادات میں دہلی میں جان کی بازی لگاکر) مسلمانوں کی خدمت کی ہے، اس کے بدلے پوری زندگی

کے مجاہدے اور عبادات و ریاضت دینے کے لئے تیار ہوں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ دین کے مختلف و متنوع میدانوں میں کام کرنے والوں کو اس سلسلہ میں اپنے درد دل کا مداوا اور تسکین ملی۔

حضرت رائے پوریؒ ایسی جگہ (رائے پور) تھے جہاں ان دنوں گھوڑا گاڑی بھی مشکل سے دستیاب ہوتی تھی، جب کہ دوسرے بہت سے اکابر مثلاً حضرت شیخ الحدیث اور حضرت شیخ الاسلام دیو بند و سہارنپور کی مرکزی جگہوں پر فیوض لٹا رہے تھے اور مرجع انام تھے مگر اس صفت (انتہائی وسیع الظرفی) کے سبب حضرت رائے پوری کے خلفاء اور نسبت رکھنے والوں میں بکثرت ایسے لوگ ہیں جن کی زندگی متنوع میدانوں میں گزری، جیسے امیر شریعت حضرت مولانا سید عطاء اللہ بخاری، رئیس الاحرار حضرت مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی، مجاہد ختم نبوت مولانا محمد علی جالندھری، مفکر اسلام حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی اور مناظر اہل سنت مولانا محمد منظور نعمانی وغیرہ وغیرہ، آخر الذکر دو شخصیتیں تو سارے ہی آستانوں کی حاضر باش و مرتبہ داں تھیں، مگر ان کو دوائے دل اسی آستانہ پر ملی۔

میرے دل کے کسی خانہ میں یہ بھی خیال تھا کہ جو کام میں لندن میں اور مولانا راشدی صاحب پاکستان میں کر رہے ہیں، وہ ہمارے دینی حلقوں میں ایک طرح سے غیر روایتی و غیر رسمی ہے، اس لئے اس سلسلہ میں صحیح رہنمائی و قدر افزائی یہیں ملے گی (بندہ بیعت سے پہلے مختلف مجالس میں حضرت شاہ صاحب کی خدمت میں اپنی مصروفیتوں اور کاموں کے بارے میں تفصیل سے بتاتا رہا تھا اور حضرت ان امور اور اس کے متعلق میری تحریروں پر نہایت بلند و بالا الفاظ میں تحسین فرماتے اور دعاؤں سے نوازتے رہے تھے)

حضرت سے بیعت و نسبت کا مجھ پر ایک خاص اثر

حضرت سے نسبت کے بعد میرے معمولات میں ایک خاص اثر یہ ہوا کہ اکابر اولیاء اور بزرگان دین کے مزاروں پر شرک و بدعت کی بھرمار کی وجہ سے جانے کی ہمت نہیں ہوتی تھی، صرف چند مرتبہ حضرت نظام الدین اولیاء کے مزار پر (جو دہلی میں تبلیغی مرکز کے متصل ہی ہے) حاضری دی اور ایک بار گذرتے ہوئے حضرت خواجہ معین الدین چشتی کے مزار پر، حتی کہ بمبئی جو میرے لئے گھر جیسا رہا ہے شیخ علی مہائمی کی تفسیر قرآن دیکھنے کے بعد بہت اشتیاق ہوا مگر بدعات وخرافات کا خیال کر کے راستہ سے لوٹ آیا۔ حضرت شاہ صاحب سے تعلق کے بعد جہاں بھی جانا ہوا وہاں کے اکابر اولیاء اللہ کے مزارات کی زیارت کے لئے دل کھنچنے لگا اور حاضری کے لئے خود کو ایک طرح سے مجبور

پاتا، چنانچہ گذشتہ چند سالوں میں جہاں گیا وہاں کے بزرگان دین اور اکابر اولیاء کے مزار پر ضرور حاضری دی اور حاضری سے دل کو خاص سکون و سرور حاصل ہوا، میں سمجھتا ہوں میرے باطن کی یہ تبدیلی حضرت سے تعلق و نسبت کا طفیل ہے۔

حضرت شاہ صاحب کی ایک تمنا جو پوری نہ ہو سکی

۲۰۰۶ء کے سفر بھارت میں حضرت شاہ صاحب کے جد امجد، حضرت سید محمد الحسینی الملقب بندہ نواز گیسو دراز کے مزار پر حاضری کے لئے گلبرگہ پہنچا۔ پورے بھارت میں دو بزرگوں کے مزار شرک و بدعات سے پاک نظر آئے، ایک حضرت مجدد الف ثانی دوسرے حضرت خواجہ گیسو دراز وہاں کوئی خرافات و رسوم نہیں دیکھی، جگہ جگہ لکھا ہوا پایا شریعت کی اتباع کریں مانگنے والوں کو پیسے نہ دیں، درگاہ کے سجادہ نشین جسمانی معذوری کے باوجود وہیل چیئر پر پابندی سے درگاہ کی مسجد میں نمازوں میں شریک نظر آئے، بندہ نے ان سے ملاقات کر کے حضرت شاہ صاحب کہ حضرت کے توسط سے آپ کے سلسلہ سے وابستہ ہوں۔ انہوں نے حضرت شاہ صاحب سے تعلق و محبت کا اظہار فرمایا اور فرمایا کتب خانہ میں جائیے، حضرت نفیس شاہ صاحب نے حضرت خواجہ کی جو تفسیر لندن سے نقل فرما کر چھاپی ہے وہ اور حضرات خواجہ صاحب کی جو اور کتابیں چھاپی ہیں آپ کو نظر آئیں گی، درگاہ کے کتب خانہ میں ہمارے حضرت کی کتب دیکھ کر بڑی مسرت ہوئی، گلبرگہ کی دوسری خصوصیت یہ نظر آئی کہ یہاں درگاہ کی آمدنی کے لاکھوں روپئے تعلیم پر خرچ ہوئے ہیں، بچوں اور بچیوں کے نہایت معیاری اسکول، انجینئر کالج اور دیگر کالج ہیں، دوسرے درگاہ کی طرف سے دینی و علمی کتب خاص طور پر حضرت خواجہ صاحب کی کتب کی اشاعت بڑے پیمانہ پر ہوتی ہے، گویا حضرت خواجہ گیسو دراز کے مزاج علم سے وابستگی یہاں صاف جھلکتی ہے۔

میں نے سجادہ نشین صاحب سے عرض کیا ہمارے حضرت یہاں آنے کے لئے بے چین ہیں، تو فرمایا ہم لوگ بھی حضرت شاہ صاحب کی زیارت کے لئے مضطرب ہیں، میں نے لاہور فون کر کے حضرت کو گلبرگہ حاضری کی تفصیلات بتائی تو بڑی مسرت کا اظہار فرمایا اور دعاؤں سے نوازا، نیز فرمایا میری تمنا ہے ایک بار گلبرگہ اور اپنے بزرگوں کی سرزمین دیوبند، سہارنپور، نانوتہ، گنگوہ تھانہ بھون وغیرہ وغیرہ اور دہلی لکھنؤ کا سفر ہو جائے، حضرت کی خواہش کے پیش نظر بندہ نے اپنا پاکستان کا سفر ملتوی کر کے، دہلی جا کر دو ہفتہ تک حضرت کے ویزے کے لئے کوشش کرتا رہا، دہلی کے احباب خاص طور پر مولانا یعقوب بلند شہری اور مفتی محفوظ الرحمن

واعبدوا الله ولا تشركوا به شيئا وبالوالدين احسانا

اور تم سب اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ کرو اور ماں باپ کے ساتھ نیک برتاؤ کرو

وبذي القربى واليتامى والمساكين والجار ذي القربى

اور قرابتداروں کے ساتھ بھی اور یتیموں کے ساتھ بھی اور مساکین کے ساتھ بھی اور قریب کے پڑوسی کے ساتھ بھی

والجار الجنب والصاحب بالجنب وابن السبيل وما ملكت

اور دور کے پڑوسی کے ساتھ بھی اور پاس کے بیٹھنے والے کے ساتھ بھی اور مسافر کے ساتھ بھی اور ان کے ساتھ بھی جو تمہارے

ايمانكم ان الله لا يحب من كان مختالا فخورا

مملوک ہیں حسن سلوک سے پیش آؤ یقیناً اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کو پسند نہیں کرتا جو تکبر کرنے والے شیخی مارنے والے ہوں

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مسلماں آں فقیرے کج کلاہے

رمید از سینۂ او سوز آہے

دلش نالد چرا نالد نداند

نگاہے یا رسول اللہ نگاہے

صلی اللہ علیک وسلم دائما ابدا

اقبال

سید انور حسین نفیس رقم

عثانی کو بھی اس کوشش میں لگایا، حکومتی سطح پر بڑی سے بڑی شخصیت سے مل کر کوشش کی وزارت داخلہ تک سے او، کے {Ok} کے کرایا مگر ویزا نہیں مل سکا، اس طرح حضرت کی آخری تمنا پوری نہ ہوسکی، کاش کے بھارت کے علمی اداروں اور بزرگان دین کے مقامات کا یہ سفر حضرت شاہ صاحب کی رفاقت و سرپرستی میں ہوجاتا۔

حضرت کی آخری علالت اور بندہ کی حاضری سے محرومی

حضرت سے بیعت کے بعد مجھے سکون و یکسوئی حاصل ہوگئی تھی اور یہ تسلی رہتی کہ جو کام میں کررہا ہوں اس کی پشت پر ایک اللہ والے کی توجہات اور دعائیں بھی شامل ہیں، حضرت کو مسلسل فون پر میں اپنی دلی کیفیت، احوال و پریشانیاں بتاتا رہتا، حضرت کے چند الفاظ سے تشفی ہوجاتی۔ ۲۰۰۶ء میں لندن کے ابراہیم کالج کے مولانا مشفق الدین، مولانا شمش الضحیٰ مولانا بلال، مولانا عبداللہ اور لیسٹر کے مولانا فاروق ملان ڈیوزبری کے مولانا احسان صاحب وغیرہ کے ہمراہ علماء کے ایک وفد کے ساتھ، ایک ہفتہ کے لئے پاکستان کا سفر ہوا۔ اسلام آباد، گوجرانوالہ کراچی کا ہنگامی سفر تھا، میری کوشش وہی زیادہ سے زیادہ وقت حضرت کی خدمت میں گذرے، چنانچہ ۳-۴ روز اکثر وقت خانقاہ سید احمد شہیدؒ میں حضرت کے پاس گذرا۔

اب دل کا یہ تقاضا بڑھتا جارہا تھا کہ کچھ وقت فارغ کرکے حضرت کی خدمت میں رہوں، جب کبھی فون پر حاضری کا تذکرہ کرتا، فرماتے تم سے ملنے کے لئے بے چین اور سراپا انتظار ہوں مگر وائے محرومی ان دنوں اہلیہ کی شدید علالت کے سبب بار بار سفر ملتوی ہوتا رہا، ۲۰۰۷ء میں مولانا سلمان الحسینی نے فون پر فرمایا نصاب تعلیم پر جامعہ سید احمد شہید (کٹولی ملیح آباد) کی طرح ایک بڑا سیمینار حضرت کی سرپرستی میں پاکستان میں کرنا ہے، جس میں پاکستان بھر کے علماء ہوں گے، آپ کو ضرور آنا ہے، میں نے فون پر حضرت کو اطلاع دی حضرت باغ باغ ہوگئے فرمایا جلدی آؤ اور قیام خانقاہ ہی میں رہے گا، بندہ اور مولوی شمش الضحیٰ نے ٹکٹ بک کرالی، مگر وائے محرومی لاہور و کراچی میں ایسے واقعات پیش آئے کہ سیمینار ملتوی ہوگیا اور نہ جاسکا۔ اس کے بعد حضرت کی علالت کی خبریں آنے لگیں ادھر اہلیہ کی بیماری، کئی بار ٹکٹ بک کرکے سفر ملتوی کرنا پڑا، مولانا سلمان الحسینی صاحب کو فون کیا، آپ ہر حال میں پہنچیں اور دعا کریں میں بھی آسکوں، مولانا سلمان خوش نصیب رہے اور میں نہ جاپایا۔ آخری دنوں میں فون پر حضرت سے بار بار بات ہوئی، کبھی معلوم ہوتا صحت سنبھل رہی ہے، پھر علالت بڑھنے کی خبر آجاتی، کئی بار ایسا بھی ہوا بات کرتے کرتے آواز بند ہوگئی، حضرت کے

خادم خاص رضوان صاحب نے بتایا حضرت بات کرتے کرتے بے ہوش ہو گئے تھے۔ بھائی رضوان صاحب نے بتایا جب آپ سے بات ہوتی ہے تو حضرت کے چہرہ مبارک پر خوشی وبشاشت صاف جھلکتی ہے، حضرت کو آپ کا بہت انتظار ہے جلدی آیئے میں پروگرام بناتا رہا جو ٹوٹتے رہے، ایک دن خبر آئی آفتاب علم وعمل غروب ہو گیا، اناللّٰہ وانا الیہ راجعون!

کاش میں آخری دنوں میں کچھ دنوں کے لئے پہنچ جاتا حضرت کے بعد تو روحانی دنیا میں گھٹا ٹوپ اندھیارا ہے۔

اب درد دل کی دوا لینے کہاں جائیں

میرے نزدیک حضرت شاہ صاحب کی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ وہ طالبین کے دل میں محبت الٰہی کی ایسی چنگاری بھڑکا دیتے کہ ان کی راہ سلوک خود بخود طے ہو جاتی، یہ خصوصیت آپ کو اپنے جد امجد حضرت سید گیسو دراز سے ورثہ میں ملی تھی۔ حضرت سید گیسو دراز کے متعلق ان کے شیخ حضرت نصیر الدین چراغ دہلوی، خلیفہ وجانشین محبوب الٰہی حضرت نظام الدین اولیاء دہلوی قسم کھا کر فرماتے ہیں:

ہرکو مرید سید گیسو دراز شد

واللہ خلاف نیست کہ او عشق باز شد

حضرت سید انور حسین نفیس رقمؒ
تختِ کتابت سے مسندِ طریقت و خلافت تک

از: مولانا مجاہد الحسینی

برصغیر پاک و ہند میں لاہور اور دہلی دو شہر ایسے ہیں جن میں مختلف النوع فنی ماہرین گذرے ہیں، لاہور میں فن خطاطی و خوشنویسی کی نشأۃ ثانیہ امام ویروی سے ہوئی، وہ خط نستعلیق کے استاد اور اپنے عہد کے بے مثل خطاط تھے، ان کی کتابت کردہ گلستاں سعدی آج بھی نیشنل میوزیم کراچی میں موجود ہے۔ شیخ الاسلام عبداللہ ہروی کی خطاطی کا نمونہ شاہی قلعہ کے نوادرات میں محفوظ ہے۔ نامور علماء و مشائخ میں سے مفتی اعظم ہند مولانا مفتی کفایت اللہ دہلوی، شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد، مولانا اشتیاق احمد دیوبندی، مولانا عماد الدین انصاری شیرکوٹی ثم جالندھری، مولانا محمد قاسم لدھیانوی، مولانا سردار محمد جالندھری اور دیگر بہت سے علماء و مشائخ فن خطاطی میں بھی خوب مہارت رکھتے تھے۔ مولانا مفتی کفایت اللہ کی عام تحریر بھی فن خطاطی کی شاہکار تھی، ان کے فتاوی کی از سر نو کتابت کی ضرورت نہ ہوتی تھی، چونکہ ان دنوں فوٹو اسٹیٹ کا موجودہ نظام موجود نہ تھا، اس لئے مجبوراً کتابت کرانا پڑتی تھی، مفتی صاحب کے ساتھ منشی محمد شفیع بھی اعلیٰ خطاط تھے۔

سنہ ۱۹۳۱ء میں جب تحریک آزادی کشمیر کا آغاز ہوا تھا اور ڈوگرہ شاہی حکومت کے جبر و استبداد کے بعد مجلس احرار اسلام اور حکومت کشمیر کے مابین جو خط و کتابت ہوئی تھی اور حضرت مفتی کفایت اللہ صاحب نے جمعیۃ علماء ہند کے صدر کی حیثیت سے اس سلسلے میں جو مذاکرات کئے تھے اس کی اصل کاپی راقم کے پاس محفوظ ہے، اس پر مفتی صاحب کے تصدیقی دستخط بھی ثبت ہیں۔ علاوہ ازیں مفتی صاحب کی قادیانیوں کے خلاف تحریک کی تائید میں مختصر تحریر کا عکس بھی راقم کے پاس موجود ہے۔

لاہور کے نامور خطاط بہر نوع امام ویروی کے بعد لاہور کے نامور خطاط عبدالمجید پرویں رقم ایک ایسی شخصیت تھے، جنہوں نے فارسی طرز کے دہلوی رسم الخط کو نئے سانچے میں ڈھالا اور خط نستعلیق میں دل کشا اور جاذب نظر تبدیلی کے ساتھ نئے طرز کتابت کی طرح ڈالی۔انہوں نے حکیم الامت علامہ اقبال کے کلام کی کتابت کر کے خوب داد تحسین وصول کی تھی، ان کے معاصرین میں حاجی دین محمد کی خطاطی کا نمونہ کتب خانہ دین محمدی کی عمارت سابقہ (بل روڈ لاہور) پر نظر نواز ہے، انہی کے ہم عصر منشی تاج الدین زریں رقم اندرون لوہاری گیٹ لاہور نے خطاطی کو عروج اور ترقی عطا کی اور نستعلیق میں مزید حسن اور بانکپن ہویدا کر کے، جدید خطوط پر استوار کیا تھا، انہی کے معاصرین میں سے حافظ محمد یوسف سدیدی (روزنامہ امروز لاہور) صوفی خورشید عالم کپورتھلوی (روزنامہ آفاق لاہور) اور محمد صدیق الماس رقم اور دیگر خطاطین حضرات کے اسماء گرامی خصوصاً قابل ذکر ہیں۔ان میں سے حافظ محمد یوسف سدیدی، خط نستعلیق و نسخ دونوں میں استاد فن اور خوب مہارت رکھتے تھے، انہوں نے وزیر اعظم چین مسٹر چواین لائی کی لاہور میں آمد پر، روزنامہ امروز کی اردو زبان کی سرخی کو چینی رسم الخط میں کتابت کر کے قارئین کو ورطۂ حیرت میں ڈال کر خوب خوب داد تبریک و تحسین وصول کی تھی۔سعودی عرب میں ان کی خطاطی کا شاہکار مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی دیوار مبارک پر اور منصورہ لاہور کی مسجد میں ملاحظہ کیا جا سکتا ہے، صوفی خورشید عالم کپورتھلی میرے ہم وطن اور تاج زریں کے جانشین تھے۔

حضرت شاہ صاحب سے ملاقات کا تاریخی واقعہ پاکستان کی سب سے بڑی دینی تحریک ختم نبوت کے دوران، راقم الحروف مجلس ختم نبوت کے ترجمان روزنامہ ''آزاد'' لاہور کی ادارت پر مامور تھا، ۱۹۵۱-۵۶ کو تحریک کے ابتدائی ایام میں روزنامہ ''آزاد'' کے دفتر، واقع بیرون دہلی دروازے کے قریب ہی روزنامہ ''احسان'' لاہور کا دفتر تھا۔یہ اخبار کب ملک احسان الٰہی (والد ماجد ملک مقبول الٰہی، سابق ایڈوکیٹ جنرل پنجاب اور موجودہ نگراں وزیر برائے حقوق انسانی و جیل خانہ جات حکومت پنجاب) اس اخبار کے مالک تھے، ابوسعید بزمی چیف ایڈیٹر اور شریف فارق (مدیر اعلی روزنامہ ''جہاد'' پشاور) اس کے مدیر معاون تھے، اخبار احسان کی بڑی سرخی خطاطی کا اعلیٰ نمونہ اور جاذب نظر ہوتی تھی، مجھے چونکہ خطاطی و خوشنویسی سے خاصی دلچسپی ہے، اس لئے اپنے اخبار روزنامہ ''آزاد'' کو تزئین و ترتیب کے اعتبار سے ایک معیاری اخبار بنانے کے لئے

ہمیشہ کوشاں رہتا تھا، روزنامہ ''احسان'' کی کتابت سے متاثر ہوکر ایک روز دفتر احسان میں گیا، تو شریف فاروق صاحب نے استقبال کیا ان کی رفاقت میں ابوسعید بزمی صاحب سے ملاقات ہوئی۔ اس اثناء میں احسان کی حسن کتابت کا تذکرہ ہوا، میں نے ہیڈ کاتب کی بابت دریافت کیا تو انہوں نے سامنے تخت کاتباں پر بیٹھے محو کتابت ''انور حسین'' کا حوالہ دیا میں اور شریف فاروق صاحب سید انور حسین صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے، ان دنوں بے ریش تھے، منحنی جسم، کم گو اور سلیقہ شعار خطاط کی چابکدستی اور مہارت دیکھ کر حیرت میں ڈوب گئے تھے، میں نے انور شاہ صاحب سے رہائش وغیرہ کی معلومات کیں تو انہوں نے فرمایا کہ میں اپنے ایک دوست کے ہمراہ دہلی دروازے سے اگلے گیٹ میں ایک کرائے کے کمرے میں رہائش پذیر ہوں، میں نے کہا کہ آپ میرے میرے دفتر میں اگر تشریف لے آئیں، تو ہماری خوش نصیبی اور آپ کو کرائے کی پریشانی نہ ہوگی، انور شاہ صاحب آمادہ ہوگئے، شام کو میں نے اپنے دفتر کے ملازم کی رفاقت میں شاہ صاحب کا سامان اپنے دفتر میں منتقل کر دیا اور ایک الماری ان کے سپرد کر دی۔

میں نے انور شاہ صاحب کی خدمت میں آزاد کی صرف ایک بڑی سرخی لکھنے کی فرمائش کی، جسے انہوں نے قبول کر لیا، چنانچہ ان کی خوشنما سرخی سے آزاد اخبار کو چار چاند لگ گئے، قارئین نے بہت پسند کیا۔ اسی اثنا میں حضرت امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ اپنے فرزند ارجمند مولانا سید ابوذر بخاریؒ کے ہمراہ لاہور میں رونق افروز ہوئے، تو ان سے شرف ملاقات کی خاطر حاجی دین محمد صاحب کے کارخانے واقع بادامی باغ لاہور میں حاضر ہوا اور سید انور حسین شاہ صاحب کا تعارف کرایا۔ حضرت امیر شریعت اور مولانا سید ابوذر بخاری دونوں نے آزاد کی خوشنما کتابت کی بہت تعریف و تحسین کی، حضرت امیر شریعت نے سید انور حسین شاہ صاحب سے خاندانی حالات معلوم کیے، تو انور حسین صاحب نے سیالکوٹ کے زیدی خاندان کا حوالہ دیتے ہوئے بتایا کہ والد صاحب تو ان دنوں لائلپور کے غلام محمد آباد میں رہائش پذیر ہیں، اور چند رشتہ دار امین پور بازار کے باہر گجر بستی میں آباد ہیں سیالکوٹ میں چند رشتہ دار شیعہ مسلک کے ہیں، اکثر زیدی سنی ہیں اس مجلس میں مولانا حافظ عطاء المنعم (سید ابوذر بخاری) نے فن خطاطی پر خوب گفتگو کی، بعد ازاں چند روز کے بعد لاہور میں حضرت مولانا شیخ المشائخ شاہ عبدالقادر رائے پوریؒ رونق افروز ہوئے تو سید انور حسین شاہ صاحب کے ساتھ لے کر ان کی خدمت میں حاضری دی۔ اس اثناء میں سید انور حسین روزنامہ ''احسان'' سے روزنامہ

''نوائے وقت'' لاہور میں منتقل ہو گئے تھے، جب سنہ ۱۹۵۳ء کی تحریک نے شدت اختیار کی تو حکومت نے روزنامہ ''آزاد'' سال کے لئے جبراً بند کر دیا اور مجھے جیل بھیج دیا گیا تھا، ایک سال بعد رہائی ملی، تو آزاد کی جگہ روزنامہ ''نوائے پاکستان'' ختم نبوت کا ترجمان بنا تو مولانا سید نفیس شاہ صاحب اس میں بھی لکھتے رہے۔

چنانچہ حضرت شاہ عبدالقادر رائے پوریؒ کی مجلس میں سید انور حسین زیدی تو اکثر حاضر رہتے رہتے تھے، حضرت رائے پوریؒ کی مجلس میں بڑے بڑی علماء و مشائخ کا مجمع دیکھ کر انہوں نے بھی داڑھی رکھ لی، ایک روز میں نے حضرت رائے پوری سے بیعت کرنے کا مشورہ دیا تو فوراً آمادہ ہو گئے، چنانچہ حضرت کے دست مبارک پر بیعت کر کے حلقہ زیاد و اتقیاء میں داخل ہو گئے، اور رات دن صوفی عبدالحمید سابق صوبائی وزیر زراعت پنجاب کی رہائش گاہ وارث روڈ یا حاجی عبدالمتین صاحب کی کوٹھی، واقع نزد شملہ پہاڑی میں جہاں بھی حضرت شیخ رائے پوریؒ اپنے مریدوں کی بڑی تعداد کے ساتھ قیام فرما ہوتے تھے۔ سید انور حسین شاہ صاحب بھی شب و روز وہیں بسر کرنے لگے، اس اثنا میں ان کی خطاطی کو مزید نکھار پیدا ہو گیا تھا اور وہ انور حسین کے ساتھ نفیس رقم بھی لکھنے لگے تھے، نفیس صاحب اگرچہ پہلے ہی نفیس طبع زہد شب زندہ دار تھے مگر حضرت رائے پوریؒ کی ایمان افروز صحبت کا آپ پر ایسا اثر ہوا اور رنگ چڑھا کہ سید انور حسین کی دنیا ہی بدل گئی تھی بعد ازاں جوہر شناس حضرت شاہ عبدالقادر رائے پوریؒ نے، حضرت انور حسین نفیس رقم کو خلافت کے اعزاز سے سرفراز کر دیا اور یوں نفیس شاہ صاحب تخت کتابت سے مسند ولایت تک کا سفر چند برس میں طے کر کے، اولیاء و اتقیاء کی فہرست میں شامل اور نمایاں مقام پر فائز ہو گئے تھے۔

حضرت شیخ پیر طریقت سید انور حسین شاہ صاحب کی ذات گرامی کے ساتھ میرا تعلق خاطر اتنا گہرا اور ناقابل اظہار و بیان ہے کہ الفاظ اس کی نقشہ کشی سے قاصر ہیں، ان کی ذات گرامی کو اپنی نجات کے وسیلے کے درجے میں سمجھتا ہوں اور اس کا متعدد مرتبہ ان کی زندگی اور ان کے روبرو اظہار بھی کر چکا ہوں، خصوصاً ان کی کتاب ''گلہائے نفیس'' کی تقریب رونمائی منعقدہ دارالاطفال متصل کلمہ چوک لاہور میں مذکورہ بالا تمام معلومات فراہم کر دی تھیں، جب کہ تقریب کا اہتمام مولانا مفتی جمیل احمد خاں شہید مبلغ مجلس تحفظ ختم نبوت کراچی نے کیا تھا، صدارت مولانا عبدالغفور حیدری ایم این اے کی، مہمان خصوصی راقم الحروف تھا۔ اس میں محترم مجیب الرحمٰن شامی، مدیر اعلیٰ پاکستان، جناب عطاء الحق قاسمی روزنامہ جنگ، مولانا عبدالرشید ارشد

ایڈیٹر الرشید لاہور اور مولانا فضل الرحیم جامعہ اشرفیہ لاہور نے خطاب فرمایا تھا، ان معلومات پر مشتمل مولانا عبدالرشید ارشدؒ نے حضرت شیخ نفیس الحسینی صاحبؒ کی خدمت میں مسودہ پیش کر کے اشاعت کی منظوری حاصل کی تھی، بعدازاں روزنامہ ''اسلام'' کی ایک اشاعت میں بھی اس کا تذکرہ اشاعت پذیر ہوگیا ہے، بہرنوع حضرت سید نفیس شاہ صاحب بلند پایہ خطاط، ادیب، شاعر اور کئی کتابوں کے مصنف تھے، فن خطاطی میں ان کی تصنیف نفائس القلم ایک منفرد شاہکار ہے۔

پاکستان کا شاید ہی کوئی روزنامہ ہفت روزہ اور ماہنامہ ایسا ہوگا جس کی پیشانی حضرت نفیس شاہ کی معجز نما خطاطی سے مزین نہ ہو، اہل علم وقلم کی تصانیف خصوصاً پاکستانی مشائخ ومفسرین ومحدثین کی علمی وتحقیقی عرق ریزیوں کے سرورق حضرت شیخ المشائخ سید انور حسین نفیس رقم کی خطاطی وخوشنویسی کے درہائے گرانمایہ کا درجہ رکھتے ہیں۔ حضرت نفیس شاہ صاحب کو یہ بھی شرف اولیت حاصل ہے کہ راقم الحروف کی ادارت میں اشاعت پذیر روزنامہ ''نوائے پاکستان'' کے صفحہ اول پر علامہ اقبال کی ایک ایسی نظم بعنوان ''اے کہ بعداز تو نبوت شد بہر مفہوم شرک'' شائع ہوئی تھی، جو علامہ اقبال کے موجودہ مطبوعہ کلام میں شامل نہیں ہے، یہ نظم راقم نے انجمن حمایت اسلام لاہور کے شمارے سے لے کر شائع کی تھی، جو علامہ صاحب نے انجمن کے سالانہ جلسہ میں پڑھی تھی۔

بہرنوع حضرت پیر طریقت مولانا سید انور حسین نفیس رقم اگرچہ کسی دینی مدرسہ کے فارغ التحصیل اور مستند عالم دین نہ تھے، لیکن خداداد صلاحیتوں اور ممتاز علماء ومشائخ کی مجلس سے اکتساب علم ودانش کے باعث وعلم وفنون کی مہارت نامہ سے سرفراز تھے، ان کی ذات گرامی چشمۂ فیض رساں کی مانند تھی۔

آپ سے جہاں بے شمار بندگان خدا نے روحانی فیوض وبرکات سے دامن بھرے، وہاں وہ جامعہ مدینہ لاہور کے طلبا کو فن خطاطی سے آراستہ کر کے اسلامی فن وثقافت وکتابت احیاء اور فروغ کے لئے سرگرم عمل رہتے تھے، ان کی ذات ایک اکیڈمی کا درجہ رکھتی تھی، اکثر حضرات استفسار کرتے رہتے تھے کہ شیخ المشائخ حضرت شاہ عبدالقادر رائے پوریؒ کے مریدوں میں، حضرت امیر شریعت مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری خطیب پاکستان، مولانا قاضی احسان احمد شجاع آبادیؒ، مولانا محمد علی جالندھریؒ، مولانا لال حسینؒ اختر، مولانا محمد حیات فاتح قادیان، مولانا عبدالرحمٰن میانویؒ، ماسٹر تاج الدینؒ انصاری، صدر مجلس احرار اسلام مولانا حبیب الرحمٰن

لدھیانویؒ، شیخ حسام الدین، اور دیگر ممتاز نابغہ روزگار عظیم شخصیات شامل ہیں، لیکن جانشینی و خلافت کے مسند پر حضرت شیخ سید نفیس شاہؒ صاحب جیسی شخصیات فائز ہیں؟ اس سوال کی صحیح وضاحت تو حضرت شیخ رائے پوریؒ ہی کر سکتے تھے مگر ارباب فہم و فراست کا خیال یہ ہے کہ مختلف تحریکوں اور انقلابی سرگرمیوں میں سرگرم عمل شخصیات کے لئے تصوف و سلوک کی منازل تک رسائی کا مرحلہ چونکہ سدراہ بن سکتا تھا، اس لئے ان شخصیات کا انتخاب کیا گیا جو انقلابی تحریکوں سے دامن کش اور گوشہ نشینی اختیار کئے ہوئے ہیں۔ وہ تحریکوں کے لئے رجال کار تیار کرنے اور ان کی روحانی تطہیر اور باطنی اصلاح پر ہی اپنی توجہات اور توانائیاں صرف کرنے پر مامور ہوتی ہیں، چنانچہ حضرت مولانا سید نفیس شاہ صاحبؒ اسی قافلے کے سرخیل اور قائد کارواں تھے۔ مطلع تصوف و سلوک کا یہ روشن ستارہ ۵ فروری ۲۰۰۸ء کو غروب ہو گیا انا للہ وانا الیہ راجعون۔ آپ کی آخری آرام گاہ دریائے راوی کے کنارے پر واقع موضع فیض پور (متصل راول ٹول پلازہ) میں مرجع خلائق بنی ہوئی ہے۔

خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را

چند حسین یادیں

مفتی عبدالقیوم دین پوری

مرشد العلماء، سید الخطاطین اور عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت کے نائب امیر حضرت اقدس مولانا سید انور حسین نفیس شاہ الحسینی قدس سرہ کی زیارت باسعادت کئی بار ہوئی، اپنے نانا جان حضرت اقدس حافظ الحدیث مولانا محمد عبداللہ درخواستی رحمہ اللہ کے ہاں خان پور میں دو تین بار ملاقات کا شرف حاصل ہوا اور خدمت کی سعادت بھی نصیب ہوئی۔ تقریباً سات سال قبل دوران سفر حج حضرت شاہ صاحب کی زیارت میدان عرفات میں ہوئی، آپ کے ساتھ آپ کے بیٹے سید انیس الحسینی مرحوم بھی تھے، حضرت موصوف ختم نبوت حج گروپ کی سرپرستی فرمارہے تھے، وقوف عرفات سے فراغت کے بعد حضرت اقدس شاہ صاحب قدس سرہ کو حضرت قاری عبدالملک صاحب مدظلہ استاذ القرأ جامعہ دارالعلوم کراچی، حضرت شاہ صاحب قدس سرہ ہی کا نعتیہ کلام سنارہے تھے، حضرت شاہ صاحب قدس سرہ اور سامعین بچشم تر سماعت فرمارہے تھے، تھوڑی دیر بعد حضرت شاہ صاحب وضو کے لئے تشریف لے گئے تو حضرت شاہ صاحب کے صاحبزادہ نے لوٹا لے لیا، میں بھی پیچھے پیچھے چل پڑا اور حضرت شاہ صاحب کے صاحبزادہ سے لوٹا مانگنے لگا تاکہ پانی بھر کر لاؤں، تو حضرت شاہ صاحب نے دیکھ لیا اور فرمایا: "نہیں بھائی" میں نے کہا: "حضرت مجھے بھی خدمت کا موقع عنایت ہو؟" تو فرمایا: "آپ کا تعارف؟" میں نے کہا کہ میں آپ کے ایک شاگرد مولانا عبدالسمیع دین پوری کا بیٹا ہوں، کراچی ختم نبوت دفتر میں خادم ہوں، تو فرمایا: اب، بالکل بھی نہیں اس لئے کہ ایک تو آپ نجیب الطرفین ہیں، دوسرے آپ ختم نبوت کا کام کررہے ہیں، بہر حال جب میں نے اصرار کیا تو حضرت نے اجازت دے دی اور میں پانی لے آیا، پانی سے وضو فرمایا پھر واپس پنڈال میں تشریف لے آئے۔

گزشتہ سال کا واقعہ ہے کہ میرے ماموں مولانا فضل الرحمٰن درخواستی مقیم مکہ مکرمہ حضرت شاہ صاحب کے ہاں تشریف لے گئے اور یہ ارادہ کرکے گئے تھے کہ کچھ دن حضرت شاہ صاحبؒ کی خدمت میں رہوں گا اور

خوب اپنے دل کی صفائی کراؤں گا، تو ماموں جان نے فرمایا کہ "میں تقریباً بیس دن حضرت شاہ صاحب کی خدمت میں خانقاہ میں رہا، حضرت شاہ صاحب نے خوب دعائیں دیں اور نہایت ہی شفقت کا برتاؤ کیا اور آخر میں جب رخصت کیا تو اپنی تقریباً تمام مطبوعات ہدیۃً عنایت فرمائیں اور ان پر اپنے قلم مبارک سے تحریر بھی رقم کردی۔"

آخری ملاقات حضرت شاہ صاحب سے چند ماہ قبل والد صاحب اور بھائی مولانا عبدالجلیل صاحب کی معیت میں لاہور جا کر کی، ملاقات کے دوران والد صاحب نے اپنا نام بتایا، حضرت نے اشارہ سے فرمایا: ہاں یعنی پہچان گیا ہوں پھر والد صاحب مدظلہ نے مختصراً ہمارا بھی تعارف کرایا تو حضرت شاہ صاحب نے صرف اتنا فرمایا کہ گفتگو پر قدرت نہیں ہے ہم تھوڑی دیر حضرت شاہ صاحب کی خدمت میں بیٹھے رہے، پھر والد صاحب مدظلہ نے دعا کی درخواست کی اور حضرت نے دعا فرمائی اور ہم مصافحہ کر کے اپنی قیام گاہ جامعہ مدنیہ آ گئے۔

یہ چند ٹوٹی پھوٹی یادیں تھیں جو قارئین کی نذر کی جا رہی ہیں، دعا فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ ہمارے حضرت شاہ صاحبؒ کے درجات کو بلند تر فرمائے اور ہمیں ان کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے اور ان کے پسماندگان کو صبر جمیل اور فلاح دارین عطا فرمائے۔ آمین۔

کچھ اہل دل و اہل نظر یاد رہیں گے

محمد وسیم غزالی صاحب

حضرت سید نفیس الحسینی شاہ صاحب سے میری پہلی ملاقات حضرت مفتی محمد جمیل خان شہیدؒ کے توسط سے ہوئی، وہ کچھ اس طرح کہ جب حضرت مفتی محمد جمیل خان شہید نے اقراُ ڈائجسٹ شروع کیا تو طے ہوا کہ اس کی ''لوح'' حضرت سید نفیس شاہ سے لکھوائی جائے۔ راقم الحروف حضرت نفیس شاہ صاحب کو صرف ایک ماہر خطاط کی حیثیت سے جانتا تھا۔

جب میں حضرت مفتی احمد الرحمٰن، حضرت مفتی محمد جمیل خان شہید کے ہمراہ حضرت شاہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا تو میں نے دیکھا ایک وجیہہ چہرہ، روشن پیشانی، لبوں پر مسکراہٹ، تواضع اور انکساری، پر مغز بیان، سراپا خلوص، گفتگو میں سلامت اور لباس میں سادگی، سو فیصد سنت کے پیروکار، ایک سادے سے کمرے اور کتابوں کے درمیان، ایک چھوٹے سے گدے پر تشریف فرما اپنے زیر مشق پر کچھ کتابت کر رہے ہیں۔

حضرت مفتی احمد الرحمٰن نے شاہ صاحب سے کہا کہ حضرت! یہ جمیل ایک اسلامی ڈائجسٹ نکال رہے ہیں آپ کے پاس دعا کرانے اور اپنے ڈائجسٹ کی لوح لکھوانے آئے ہیں، آپ ان پر شفقت فرمائیں۔ حضرت شاہ صاحب نے شفقت فرماتے ہوئے اقراُ ڈائجسٹ کی ترقی اور کامیابی کے لئے دعا کی اور ہمارے ڈائجسٹ کی لوح کی بہت ہی خوبصورت انداز خطاطی کر کے دی، اس کے ساتھ ہی میں نے حضرت مفتی محمد جمیل خان شہید سے کہا کہ حضرت سے اپنا اور میرا نام بھی لکھوالیں۔ اس پر حضرت مفتی محمد جمیل صاحبؒ نے حضرت شاہ سے درخواست کی کہ یہ غزالی وزیٹنگ کارڈ کے لئے آپ سے نام لکھوانا چاہتے ہیں، اس کا نام لکھ دیجئے، حضرت شاہ صاحب نے شفقت فرماتے ہوئے میرا اور مفتی محمد جمیل خاں کا نام اسی وقت لکھ کر دے دیا۔ یہ میری حضرت سید نفیس الحسینی شاہ صاحب سے پہلے ملاقات تھی، میں نے شاہ صاحب کے بارے میں جیسا سنا تھا اس سے بڑھ کر پایا، حضرت شاہ صاحب تواضع کے پیکر مجسم تھے، میں نے دیکھا کہ ان کی خانقاہ میں ان کے

شاگردوں کے علاوہ ملنے والوں کا ایک بڑا حلقہ ہے۔ میرے علم میں یہ نہیں تھا کہ حضرت شاہ صاحب ایک ماہر خطاط، عمدہ مضمون نگار، قادر الکلام شاعر کے علاوہ ایک بلند پایہ صوفی بزرگ اور شیخ طریقت بھی ہیں۔

اس ملاقات کے بعد تو جب بھی مفتی جمیل خان شہید کے ساتھ لاہور جانا ہوا، حضرت شاہ صاحبؒ کے پاس ضرور سلام کے لئے حاضری ہوئی۔ حضرت شاہ صاحب کے ساتھ ہمارا ایک سفر ختم نبوت کانفرنس کے لئے انگلینڈ کا ہوا، یہ ایک روزہ انگلینڈ کی ختم نبوت کانفرنس ہوتی ہے، اس کانفرنس کی تیاری کے لئے ختم نبوت کے مبلغین اور بزرگ حضرات انگلینڈ کے ایک ایک شہر جا کر وہاں کی مسجدوں میں ختم نبوت کانفرنس میں شرکت کی دعوت دیتے ہیں، اسی مقصد کے لئے حضرت مولانا محمد یوسف لدھیانوی شہید، حضرت سید نفیس شاہ صاحبؒ، حضرت مفتی محمد جمیل خاں شہید، حضرت مفتی خالد محمود، صاحبزادہ مولانا محمد طیب لدھیانوی، مولانا قاری عبدالملک، حافظ محمد ایوب، کارڈیف کے بھائی نعمان اور راقم الحروف شامل تھا۔ بھائی نعمان صاحب کی بڑی گاڑی میں تقریباً پورے انگلینڈ کا سفر ہوا، یہ سفر لندن سے شروع ہوا، ہم نے تقریباً ایک ہفتے میں اولڈھم، شیفیلڈ، لیسٹر، راچڈیل، بلیک برن، پریسٹن، لنکاسٹر، گلاسکو، کارڈیف، بری، ڈیوزبری اور کئی شہروں کے دورے کئے، ان شہروں میں اکثر و بیشتر شہید اسلام حضرت مولانا محمد یوسف لدھیانوی، حضرت مفتی محمد جمیل خان بیان کرتے اور حضرت نفیس شاہ صاحب سے حضرت شہید دعا کرایا کرتے تھے۔ ہمارا یہ سفر برمنگھم ختم نبوت کانفرنس سے ایک دن پہلے مکمل ہوا۔ اس کی تفصیلات تو بہت ہیں مگر یہ چونکہ مضمون حضرت شاہ صاحب کی نسبت سے لکھا جا رہا ہے، اس لئے یہ بتلانا مقصود ہے کہ اس سفر میں حضرت سے کسی قدر ساتھ رہنے کی وجہ سے تعارف مزید گہرا ہوگیا اور حضرت کی شخصیت کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔

اس سفر میں حضرت شہید اسلام اور حضرت شاہ صاحب کی معیت سے ہم نے بہت ہی لطف اٹھایا، ہے اس لئے ہمارے یہ بزرگ سفر میں حضر کی نسبت مختلف ہوتے ہیں، چنانچہ ان حضرات کا ایک دوسرے کے لئے ایثار و محبت اور دوسرے ہم سفروں کے لئے ایک سبق ہوتا ہے۔ مجھے یاد ہے کہ اس سفر میں حضرت شاہ صاحب کے پاؤں میں ایک کیل سے زخم ہوگیا تھا، جو شوگر کی وجہ سے ٹھیک نہیں ہو رہا تھا بلکہ تکلیف دہ تھا مگر اس کے باوجود حضرت شاہ صاحب پورے سفر میں زبان پر کسی قسم کا کوئی حرف شکایت نہیں لائے کانفرنس مکمل ہونے کے بعد اس کا علاج کرایا۔ ہمارا یہ سفر بہت طویل تھا مگر حضرت شاہ صاحب کے مزاج میں ذرا بھر خشونت، درشتی

تنگی نام کو بھی نہیں آئی، جب کہ اکثر طویل سفر اور بیماری سے انسان بیزار ہو جاتا ہے۔ ختم نبوت کانفرنس کی تکمیل کے بعد حضرت شاہ صاحب اور ہم نے عمرے کے لئے حرمین کا سفر کیا۔

اس سفر کے بعد حضرت شاہ صاحب سے جب بھی ملاقات ہوئی حضرت شاہ صاحب مجھ سے بہت ہی بہت محبت اور شفقت سے پیش آتے، فرماتے کہ غزالی صاحب تو ہمارے سفر کے ساتھی ہیں، حضرت مفتی محمد جمیل خان شہید کے ساتھ حضرت شاہ صاحب کے پاس جب بھی جانا ہوا تو حضرت شاہ صاحب اقراء روضۃ الاطفال اور اقرأ ڈائجسٹ کا پوچھتے اور اسی سلسلہ میں اپنی رائے بھی دیتے، بلکہ اس کی تعریف و تنقید بھی کرتے۔ میں حضرت شاہ صاحب سے اپنے بچوں کے حافظ ہونے کے لئے خصوصی دعاؤں کی درخواست کرتا حضرت شاہ صاحب بہت خشوع و محبت سے دعا فرماتے۔ حضرت شاہ صاحب سے جو ایک بار ملتا وہ آپ کا گرویدہ ہو جاتا، آپ کی شخصیت میں نورانی کشش تھی۔

مولانا ضیاء القاسمی صاحبؒ کے انتقال کے موقع پر تعزیتی پروگرام کے سلسلہ میں فیصل آباد جانا ہوا، وہاں حضرت شاہ صاحب بھی تشریف فرما تھے، پروگرام ختم ہونے کے بعد حضرت شاہ صاحب کو آرام کے لئے کسی دوسری جگہ جانا تھا، مگر حضرت مفتی محمد جمیل خاں بہت مصروف تھے، انہوں نے مجھے کہا کہ تم حضرت شاہ صاحب کو وہاں گاڑی میں لے جاؤ، میں حضرت شاہ صاحب کو اس دوسرے گھر لے گیا۔ حضرت شاہ صاحب نے میری خیریت لینے کے بعد، وہاں موجود حضرات سے کہا کہ: غزالی صاحب ہمارے پرانے ہم سفر ہیں اس کے بعد حضرت نے فرمایا: غزالی صاحب آپ کے لئے ایک شعر ہے۔ میں نے کہا، حضرت ارشاد:

یادِ غزال چشمہ ذکرِ سمن آزاراں
جب چاہا کر لیا ہے کنج قفس بہاراں

بلاشبہ اس وقت میں بہت ہی منفعل ہو گیا کہ حضرت اس ناکارہ سے اتنی توجہ اور محبت سے پیش آ رہے ہیں! شاہ صاحب ہمیشہ اس ناکارہ کے ساتھ نہایت خندہ پیشانی اور محبت کا برتاؤ کرتے، آپ کی شخصیت میں قدرت نے ایک جاذبیت اور کشش رکھی تھی وہ متحمل مزاجی اور نرم کلامی میں اپنا کوئی ثانی نہیں رکھتے تھے۔

انسان کی فطری خواہش ہوتی ہے کہ وہ اپنا آخری وقت اپنے عزیزوں اور پیاروں کے درمیان گزارے ویسے تو ہر صاحب ایمان مسلمان کے پیارے اور جان سے عزیز ہمارے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، مگر

حضرت شاہ صاحب کے نسبی عزیز اور پیارے آخری نبی الزماں صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اس لئے ہمیشہ ان کی خواہش اور آرزو تھی کہ وہ مدینہ منورہ میں زیادہ سے زیادہ وقت گزاریں۔

حضرت شاہ صاحب نجیب الطرفین تھے یعنی آپ ماں، باپ دونوں کے اعتبار سے سید تھے، اس لئے آپ کا نسب خانوادہ رسالت سے جاملتا ہے، اسی لئے وہ عشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور محبت حسین سے سرشار تھے، آپ نے ایک مرتبہ مفتی محمد جمیل خاں شہید سے کہا کہ:

آخری بات کہنے کو جی چاہتا ہے
مدینے میں رہنے کو جی چاہتا ہے

اس وقت تو حضرت مفتی محمد جمیل خان شہید نے کچھ نہ کہا مگر اس ملاقات کے بعد جب رمضان المبارک میں حرمین کا سفر ہوا، تو حضرت مفتی محمد جمیل خان شہید نے سب سے پہلے حضرت شاہ صاحب کے قیام مدینہ کے لئے مقامات مقدسہ پر خصوصی دعائیں کیں، اس کے بعد مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کے اپنے سعودی دوستوں سے حضرت شاہ صاحب کی قیام مدینہ منورہ کی آرزو کی تکمیل کے لئے درخواست اور بھرپور کوششیں شروع کردیں۔ اسی سال حضرت شاہ صاحب سے مدینہ منورہ میں ملاقات ہوئی حضرت اعتکاف میں تھے، مفتی صاحب نے حضرت شاہ صاحب سے کہا کہ حضرت امید ہے کہ جلد ہی آپ کی تمنا پوری ہوجائے۔

اے بادصبا راہ تیری دیکھ رہا ہوں
اب آکے سنا جو بھی وہ ارشا کرے ہے

شاید اللہ کو اور ہی منظور تھا کہ اس کے بعد حضرت شاہ صاحب پر امراض وآلام کا ایسا حملہ ہوا کہ وہ خواہش پوری نہ ہوسکی، اس کے بعد اگرچہ آپ کے حرمین کے اسفار تو رہے مگر ان کی وہ تمنا کہ آخری ایام مدینہ منورہ میں روضہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر بسر ہوں، پوری نہ ہوسکی:

یہ عشق تو ہر حال میں راضی برضا ہے
اب جو بھی ترا حسن خداداد کرے ہے

حضرت مفتی محمد جمیل خان شہید کا ایک خاص وصف یہ تھا کہ ان کو علمائے حق اور بزرگان دین سے اور بزرگان دین کو ان سے خصوصی اور قلبی تعلق تھا، حضرت مولانا محمد یوسف لدھیانوی شہید کے بعد مفتی صاحب

کا حضرت شاہ صاحب سے تعلق زیادہ ہوگیا تھا، وہ اپنے معمولات کے بارے میں حضرت شاہ صاحب سے خصوصی دعائیں کراتے اور مشورہ لیتے تھے۔ جب مفتی صاحب نے حضرت شہید اسلام نمبر نکالنے کا پروگرام بنایا تو ان کی خواہش ہوئی کہ اس کے ٹائٹل پر "بیاد شہید اسلام حکیم العصر حضرت مولانا محمد یوسف لدھیانوی نور اللہ مرقدہٗ" حضرت شاہ صاحب سے لکھوایا جائے، انہوں نے اس بارے میں حضرت سے درخواست کی تو حضرت شاہ صاحب نے معذرت کی کہ اب مجھ سے لکھا نہیں جاتا کمزوری کے باعث لکھنے سے معذور ہوں۔ حضرت مفتی صاحب، مولانا محمد طیب لدھیانوی اور ہم کچھ ساتھی خصوصی طور پر شہید اسلام نمبر کی تیاری کے لئے حضرت شاہ صاحب کے پاس کئی دن مسلسل جاتے رہے، حضرت نے کئی مفید مشوروں سے بھی نوازا، جو شہید نمبر کے لئے کارآمد ثابت ہوئے۔

حضرت شاہ صاحب سے حضرت مفتی محمد جمیل خان شہید کی شہادت تک سال میں کئی مرتبہ مسلسل ملنا رہا اور مفتی محمد جمیل خان شہید جب بھی شاہ صاحب سے ملے، انہوں نے اس ناکارہ کا سلام حضرت کی خدمت میں ضرور پیش کیا اور مجھے کہا بھی کہ میں حضرت شاہ صاحب کے پاس ہوں آپ کا سلام اور دعاؤں کی درخواست کردی ہے۔ حضرت مفتی محمد جمیل خان شہید کی شہادت کے بعد بھی بزرگوں سے ملنے کا یہ سلسلہ کچھ اس طرح جاری رہا کہ حضرت مولانا سعید احمد جلالپوری، حضرت مفتی خالد محمود صاحب کے توسط سے حضرت نفیس شاہ صاحب، محدث اعظم، شیخ الحدیث حضرت مولانا سرفراز خاں صفدر دامت برکاتہم العالیہ، خواجہ خواجگان حضرت اقدس مولانا خان محمد دامت برکاتہم کی سال میں ایک دو مرتبہ زیارت ہوجاتی ہے، اللہ جزائے خیر عطا فرمائے ان حضرات کو کہ انہوں نے اس ناکارہ پر شفقت فرمائی۔ میری حضرت شاہ صاحب سے آخری ملاقات ابھی شوال میں ختم نبوت کانفرنس کے موقع پر جناب نگر جاتے ہوئے لاہور میں حضرت مولانا سعید احمد جلالپوری صاحب، مولانا امان اللہ خالدی صاحب، مولانا محمد طیب لدھیانوی، بھائی ریاض اور مفتی محمد بن جمیل کی ہمراہی میں ہوئی، حضرتؒ بیماری کے باعث خاصے کمزور تھے، لوگوں سے ملنے پر پابندی تھی مگر آپ نے شفقت فرماتے ہوئے ملاقات کی اجازت دی، حسب معمول بڑی محبت وشفقت سے پیش آئے، سب سے معانقہ اور مصافحہ کیا حضرت شاہ صاحب سے حضرت مفتی سعید احمد صاحب نے جب بھی ملاقات کی تو شاہ صاحبؒ بڑی توجہ فرماتے اور مفتی سعید احمد صاحب، شاہ صاحب کے ذوق کے مطابق گفتگو کرتے، جس سے حضرت شاہ صاحب

کی طبیعت میں نشاط آجاتا اور حضرت کافی دیر تک بلاتکلف گفتگو فرماتے تھے۔ بھائی طیب لدھیانوی کے بارے میں مفتی سعید احمد صاحب نے حضرت شاہ صاحب سے پوچھا حضرت آپ نے مولانا طیب صاحب کو خلافت دی ہے نا؟ حضرت شاہ صاحب نے فرمایا: ہاں، ہاں! مولانا طیب صاحب کو خلافت دی ہوئی ہے۔ یہ میرے خلیفہ ہیں اور بھائی طیب کو اپنے قریب بلاکر بٹھایا اور فرمایا کہ آپ اپنی مسجد میں ذکر کرایا کریں، اس ملاقات میں ہم کافی دیر حضرت کے پاس رہے، جب ہم نے حضرت شاہ صاحب سے اجازت چاہی تو حسب معمول آپ نے اپنے خدام سے فرمایا کہ ان حضرات کو کھانا کھلائیں، اور پھر ہم حضرت سید نفیس الحسینی شاہ صاحب سے اجازت لے کر رخصت ہوئے، مجھے کیا معلوم تھا کہ یہ میری آخری ملاقات ہے، اس کے بعد اس عظیم ہستی کے دیدار سے ہم ہمیشہ کے لئے محروم ہو جائیں گے:

مے کدے کی بہار بیت گئی
بند اب وہ صلائے عام ہوئی

موت برحق ہے کوئی بھی اس سے مستثنیٰ نہیں اور اپنے وقت پر سب کو ہی جانا ہے، لیکن جانے والوں میں کچھ ایسے خوش بخت ہوتے ہیں کہ زندگی ان کے نقش پا سے راستے ڈھونڈتی ہے۔ حضرت شاہ صاحب کو حق تعالیٰ نے ظاہری و باطنی کمالات اور کئی خوبیوں سے نوازا تھا، آپ فن خطاطی کی تاریخ میں سنگ میل کی حیثیت رکھتے تھے، آپ سلسلہ قادریہ کے پیر طریقت، شیخ و رہنما، فاضل ادیب، محقق، متعدد دینی مدارس کے سرپرست اور تاریخ اسلامی کے اسکالر کے علاوہ عشق حقیقی سے سرشار خوش کلام شاعر اور محبِّ وطن اور سنت جہاد کے علم بردار تھے۔

بھولے ہیں نہ بھولیں گے نفیس اہل محبت
کچھ اہل دل و اہل نظر یاد رہیں گے

قال الله فی القرآن المجید

بسم الله الرحمن الرحیم

الحمد لله رب العلمین الرحمن الرحیم مالک یوم الدین

ایاک نعبد و ایاک نستعین اهدنا الصراط المستقیم

صراط الذین انعمت علیهم غیر المغضوب علیهم ولا الضالین آمین

سید نفیس الحسینی ۱۳۹۷ ہجری

بسم الله الرحمن الرحيم

إقرأ باسم ربك الذي خلق

خلق الإنسان من علق

إقرأ وربك الأكرم الذي علم بالقلم

علم الإنسان ما لم يعلم

القرآن الحكيم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

[illegible] رمضان [illegible] کتبہ نفیس الحسینی الپاکستانی [illegible]

لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم

بسم اللہ الرحمن الرحیم

صلی اللہ علیہ وآلہٖ

اُمیدیں لاکھوں ہیں لیکن بڑی اُمید ہے یہ

کہ ہو سگانِ مدینہ میں میرا نام شُمار

جیوں تو ساتھ سگانِ حرم کے تیرے پھروں

مروں تو کھائیں مدینے کے مجھ کو مور و مار

اُڑا کے باد مری مُشتِ خاک کو پسِ مرگ

کرے حُضُور کے روضے کے آس پاس نثار

اقتباس قصیدۂ بہاریہ حُجۃ الاسلام نانوتوی

ماخوذ فضائل درود شریف از شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا مُہاجر مدنی نوّر اللہ مرقدہٗ

مدفون جنت البقیع المتوفی ۲۹ رجب المرجب ۱۴۰۲ھ ۲۴ مئی ۱۹۸۲ء دوشنبہ بعد عصر

کتبہ الفقیر نفیس الحسینی ۱۴۰۲ھ

سراپا شفقت

جناب الحاج عتیق انور، لاہور

ہوس نے کردیا ہے ٹکڑے ٹکڑے نوع انساں کو
اخوت کا بیاں ہوجا، محبت کی زبان ہوجا

جب بھی عمرہ یا حج کا ارادہ ہوتا اور حرم نبوی میں حاضری ہوتی تو دوسری خواہش حضرت مولانا مفتی عاشق الٰہی سے ملاقات کی ہوتی۔ مفتی عاشق الٰہی بلند شہری بالکل ایک باغ و بہار شخصیت، مصلح اور اپنی مثال آپ تھے، جس کی وجہ سے میری طبیعت میں کشش پیدا ہوئی اور میں نے حضرت مفتی صاحب سے بیعت کی درخواست کرڈالی، مفتی صاحب یہ بات سنتے ہی بہت سنجیدہ اور کچھ دیر خاموش ہوگئے اور فرمایا کہ: ''بیٹا مجھے اجازت نہیں ہے'' اور پھر اپنے لہجے سے ہی یہ تأثر دیا کہ: ''آپ تو بہت صاحب ذوق ہیں اور میں تو بالکل سادہ سا انسان ہوں اور آپ تو لاہور میں ہے نا سید نفیس الحسینی! ان کے پاس چلے جانا!''

دل بینا بھی کر خدا سے طلب
آنکھ کا نور دل کا نور نہیں

یہ بات وہیں ختم ہوگئی، بعد میں راقم کا اصلاحی تعلق حضرت مولانا محمد یوسف لدھیانوی شہید سے ہوگیا، بلکہ حضرت لدھیانوی کا لاہور کا پروگرام اور میزبانی مجھ نا اہل کے ذمہ ہوتی۔ حضرت لدھیانوی جب لاہور پہنچتے تو مسکراتے ہوئے اپنے شیریں لہجے میں پوچھتے: ''مجھ سے کیا کروانا ہے؟'' میں پورا پروگرام بتاتا تو شروع شروع میں حضرت لدھیانوی پوری بات سن کر پوچھتے شاہ جی (حضرت سید نفیس شاہ رحمہ اللہ) کے پاس کب چلنا ہے؟ گویا یہ میری ضرورت ہے اور دیگر پروگرام اپنی جگہ۔ ایک دو مرتبہ کے بعد ہمیں اندازہ ہوگیا کہ حضرت لدھیانوی کے لاہور کے پروگرام میں شاہ صاحب سے ملاقات کو شامل کرنا بھی ضروری ہے، مجھے یاد ہے کہ کئی بار رات گئے بھی جانا ہوا، گویا کم از کم ایک ملاقات تو لازم تھی، ادھر حضرت نفیس شاہ صاحب کو بھی

انتظار رہا کرتا تھا، یوں بندہ کو حضرت سید نفیس شاہ الحسینی سے نہ صرف تعارف ہوا بلکہ حضرت شاہ صاحب کی شخصیت ہمارے لئے بڑی پرکشش بنتی گئی اور حضرت شاہ صاحب بالکل دوستوں کی طرح اور بہت ہی غیر محسوس انداز میں انتہائی شفقت فرماتے، اسی طرح ہمیں یہ بھی تجسس ہوا کہ حضرت رائے پوری کیا ہوں گے؟ چنانچہ میں نے ایک مرتبہ (جب میرے شیخ حضرت لدھیانوی، حضرت شاہ صاحب کے گھر سے نکلنے لگے تو) حضرت لدھیانوی شہید سے پوچھا: حضرت رائے پوری کیسے تھے؟ حضرت نے مسکرا کر میری طرف دیکھا اور فرمایا: "بالکل ایسے ہی تھے جیسے شاہ صاحب ہیں۔"

حضرت شاہ صاحب کی اپنے ایک ایک اکابر پر فنائیت اپنی جگہ، مگر حضرت شاہ صاحب کو حضرت زید بن علی رضی اللہ عنہ، حضرت خواجہ گیسودرازؒ، حضرت سید احمد شہیدؒ اور حضرت شاعبدالقادر رائے پوریؒ سے عشق کی حد تک محبت تھی، ایسا محسوس ہوتا جیسے ہر باب اور ہر مضمون میں یہ آپ کے محورِ عشق تھے، کوئی بھی موضوع ہوتا، حضرت ہمیشہ انہیں چار اکابر کی حیات طیبہ کا حوالہ دیا کرتے اور یہ حوالے اور واقعات حضرت شاہ صاحبؒ کو ازبر تھے، چنانچہ ایک مرتبہ حضرت شاہ صاحب کے ساتھ دارالعلوم کراچی جانا ہوا، حضرت مولانا شمس الحق صاحب رحمہ اللہ اور حضرت مولانا تقی عثمانی صاحب حضرت کو اچانک (بغیر اطلاع کے) مسجد میں دیکھ کر بیحد خوش ہوئے اور حضرت مولانا تقی عثمانی مدظلہ چائے کے لئے اپنے گھر لے گئے۔ وہاں مولانا تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم نے اکابر میں سے کسی کا کوئی واقعہ نقل کیا، جس میں ایک جگہ غالباً کا لفظ استعمال کیا، جب بات مکمل کر کے مولانا خاموش ہوئے تو حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ نے تمام تاریخی کتب کے حوالوں اور دیگر خاص مناسبتوں کے ساتھ وہ واقعہ نقل فرمادیا، اس پر مولانا محمد تقی عثمانی دامت برکاتہم فرمانے لگے: "حضرت! علم تو یہ ہے کہ جو ہم آپ سے حاصل کرتے ہیں"...... حضرت مولانا شمس الحق اکثر فرمایا کرتے تھے کہ "میں نے حضرت مولانا محمد ادریس کاندھلوی جیسا استاد اور مولانا مسیح اللہ خان جیسا پیر نہیں دیکھا۔" حضرت مولانا شمس الحق کی وفات سے کچھ عرصہ قبل حضرت کے بیٹے نے ان سے (شمس الحق) سے کہا: "اب تو مولانا مسیح اللہ خان اس دنیا میں نہیں رہے تو اب میں کیا کروں؟ اور کس کے ہاتھ پر بیعت کروں؟" اس پر مولانا نے کہا کہ "لاہور جا کر سید نفیس الحسینیؒ کے ہاتھ پر بیعت کرو۔"

حیات جاوداں عشق کو مل گئی حفیظ
مرکر ہوس کو کیا ملا، مرگ دوام کے سوا

اسی طرح چند سال قبل جب جامعہ فاروقیہ کراچی کے اساتذہ کی وین پر فائرنگ ہوئی اور کئی اساتذہ شہید ہوگئے، تو حضرت سید نفیس شاہ جامعہ فاروقیہ تعزیت کے لئے تشریف لے گئے۔ حضرت مولانا سلیم اللہ خاں مدظلہ سے دریافت کیا: حضرت تعزیت کا سنت طریقہ کیا ہے؟...... حضرت مولانا سلیم اللہ خان مدظلہ نے فرمایا کہ ہاتھ اٹھائے بغیر تعزیت کی تعلیم کی گئی ہے، حضرت شاہ صاحب نے فرمایا: میں نے بھی اکابر سے یہی سنا ہے، مگر ہمارے کچھ حضرات کے یہاں پتہ نہیں ہاتھ اٹھا کر تعزیت کا رواج کہاں سے آیا ہے؟ اسی طرح میرے شیخ حضرت نفیس شاہ گکھڑ حضرت شیخ مولانا سرفراز خان صفدر مدظلہ نے جوس کے وہ پیکٹ منگوالئے اس کا حضرت شاہ صاحبؒ کی طبیعت پر بڑا اثر ہوا ہوگا بعد میں فرمایا: ہم تو تعزیت کے لئے گئے تھے، افسوس کہ حضرت شیخ مدظلہ کو تواضع کا تکلف کرنا پڑا، پھر فرمایا: ''یہ دو روپئے کا تو آیا ہوا'' حالانکہ اس وقت وہ تقریباً ۱۰ روپئے کا تھا، حضرت کی دنیا سے لاتعلقی کا یہ حال تھا۔ دوسری طرف حضرت شاہ صاحب کی دینی معلومات کا یہ حال تھا کہ اسی ملاقات میں حضرت مولانا شبیر احمد خان (ناظم اعلی اقرأ روضۃ الاطفال ٹرسٹ پاکستان) نے دریافت کیا نماز میں تشہد پر سبابہ (شہادت کی انگلی کے اشارہ) کا کیا حکم ہے؟ حضرت شاہ صاحب نے فرمایا: یہ سوال حضرت اقدس حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی نور اللہ مرقدہٗ نے قطب الاقطاب مولانا رشید احمد گنگوہیؒ سے کیا تھا، اس کا انہوں نے یہ جواب دیا تھا:

> ''تشہد میں جو رفع سبابہ کیا جاتا ہے، اس میں تردد تھا کہ اس اشارہ کا بقاء کس وقت تک کسی حدیث میں منقول ہے یا نہیں؟ حضرت قدس سرہٗ کی حضور میں پیش کیا گیا، فوراً ارشاد فرمایا کہ ترمذی کی کتاب الدعوات میں حدیث ہے کہ آپ نے تشہد کے بعد فلاں دعا پڑھی اور اس میں سبابہ سے اشارہ فرمارہے تھے اور ظاہر ہے کہ دعا قریب سلام کے پڑھی جاتی ہے، پس ثابت ہوگیا کہ اخیر تک اس کا باقی رکھنا حدیث میں منقول ہے۔ اس سے سرعت انتقال ذہنی اور ملکۂ استنباط بخوبی روشن ہے اور یہ بھی فرمایا کہ لوگ اس مسئلہ کو ''باب التشہد'' میں ڈھونڈتے ہیں اور وہاں ملتا نہیں، اس سے سمجھتے ہیں کہ حدیث میں نہیں ہے۔

میرے شیخ حضرت مولانا محمد یوسف لدھیانوی کا حضرت شاہ صاحب سے جیسا تعلق تھا، وہ پہلے لکھ چکا ہوں، اسی طرح حضرت شاہ صاحب کا بھی یہ حال تھا کہ حضرت مولانا محمد یوسف صاحب لدھیانوی کی

تصانیف کے منتظر رہتے، ایک مرتبہ راقم حضرت لدھیانوی کی کوئی کتاب لے گیا حضرت شاہ صاحب اس کے مطالعہ میں ایسے محو ہوئے کہ تقریباً ۳۰ یا ۴۰ منٹ تک اس کتاب کو دیکھتے رہے۔ حضرت شاہ صاحبؒ نے جب کتاب بند کی تو میری طرف دیکھا اور فرمایا: ''اوہ!'' آپ ابھی بیٹھے ہیں، میں سمجھا کہ آپ چلے گئے......'' اسی طرح ایک کتاب میں حضرت لدھیانوی کا اصل خط مع کمپوزنگ کے لگا ہوا تھا تو حضرت شاہ صاحب دیر تک عدسہ سے اصل خط کا عکس دیکھتے اور محظوظ ہوتے رہے اور پھر فرمایا کہ: ''مولانا محمد یوسف لدھیانوی کا خط بڑا عمدہ اور پختہ تھا......''

ایک مرتبہ سفر میں راقم الحروف حضرت لدھیانوی اور حضرت شاہ صاحب کے ساتھ تھا اور ہر دو حضرات کی باتوں اور بزرگوں کے واقعات سے محظوظ ہو رہا تھا، اسی دوران حضرت لدھیانوی نے فرمایا: ''شاہ جی جب کوئی داڑھی منڈا میرے پاس آتا ہے، اول تو میں اس کی منت کرتا ہوں اور درخواست کرتا ہوں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کا احساس/خیال کرو لیکن جب کبھی میری بات بے اثر محسوس ہوتی ہے، تو مجھ سے برداشت نہیں ہوتا......'' حضرت شاہ صاحب نے فرمایا: ''آپ یہ گمان رکھا کریں کہ بعض داڑھی منڈے ایسے ہوتے ہیں کہ ان کو اکابر کی روایات سنائیں تو دل موم ہو جائے گا اور بعض داڑھی والے ایسے ہوتے ہیں کہ آپ ان کو پوری تفسیر پڑھ کر سنائیں تو ان کی اصلاح کی توفیق نہیں ہوتی، حضرت لدھیانوی بہت خوش ہوئے اور فرمایا: شاہ جی! میرے لئے دعا کریں:

ایک مرتبہ ایک صاحب ہاتھ میں خط اٹھائے حضرت شاہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ حضرت کو خط دیا اور دوزانوں ہو کر بیٹھ گئے۔ سائل کی طبعیت میں عجیب سی بے چینی محسوس ہوئی۔ حضرت کے پاس حضرت کے احباب میں سے ایک صاحب کو وہ خط پڑھنے کو دے دیا، جس کا مضمون کچھ اس طرح تھا کہ: ''سائل نے رات حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی اللہ والے سے تعلق جوڑنے کو کہا، تو میں (سائل) نے عرض کیا کہ میرا فلاں شخص سے اصلاحی تعلق ہے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ضروری نہیں کہ پیروں کے بیٹے بھی پیر ہوں، تم سید نفیس الحسینی کے پاس چلے جاؤ'' اس پر حضرت دیر تک روتے رہے۔

اسی طرح ایک شخص حضرت کے پاس حاضر ہوا وہ حرمین کے سفر پر جا رہا تھا، حضرت نے کہا: بھئی! ہمارا

سلام بھی عرض کر دینا، اس شخص کا اصلاحی تعلق چونکہ حضرت شاہ صاحبؒ سے تھا، اس لئے اس کا کہنا ہے کہ دل میں خیال آیا کہ حضرت کا نام کیسے لکھوں ویسے ہی یاد رکھوں گا، جب مدینہ شریف سے واپسی ہونے لگی تو رات کو خواب دیکھتا ہوں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت ہوئی، دریافت کیا وہ فہرست کہاں ہے؟ پیش کی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس میں تو نفیس الحسینی کا نام نہیں اور پھر سب سے اوپر حضرت کا نام لکھ دیا، جب خواب سے بیدار ہوا تو فہرست میں سب سے اوپر حضرت کا نام لکھا دیکھا اور واپسی پر حضرت کو خواب بیان کیا۔

حضرت نے فہرست چوم لی، چومی اور آنکھوں سے لگائی اور فرمایا: اب یہ فہرست کسی کو نہ دکھانا۔

نگاہ برق نہیں، چہرہ آفتاب نہیں
وہ آدمی ہے، مگر دیکھنے کی تاب نہیں

حضرۃ مولانا نور الحسن راشد زید مجدہم
نفیس
۲۸ جمادی الاولیٰ
۱۴۲۶ھ

محب گرامی قدر
حضرۃ مولانا نور الحسن راشد زید مجدہم
نفیس
۲۸ جمادی الاخریٰ
۱۴۲۶ھ

حضرت شاہ سید نفیس الحسینیؒ کی تحریر کے دو نمونے، معہ دستخط بطور تبرک نذر قارئین ہیں۔ مرتب

ہمہ جہت شخصیت سید نفیس الحسینیؒ

محمد راشد شیخ صاحب کراچی

یوں تو شاہ صاحب نے متعدد کتابوں کی پاکیزہ کتاب اپنے خوبصورت خط میں کتابت کی ہے مگر آج کل شدید مصروفیات، مسلسل اسفار اور دیگر کاموں کی وجہ سے صرف ٹائٹل سازی کا کام ہی کرتے ہیں، آپ اب تک بے شمار کتب ورسائل کے ٹائٹل تیار کر چکے ہیں، اس شعبے میں بھی آپ نے کئی اجتہادی تبدیلیاں کی ہیں، یوں تو آپ تمام مروجہ خطوط یکساں عبور رکھتے مگر ٹائٹل میں عموماً سب سے زیادہ خط نستعلیق ہی استعمال کرتے ہیں، اس کی بڑی وجہ ہمارے ہاں خط نستعلیق سے سب سے زیادہ مانوسیت ہے، نستعلیق کے علاوہ آپ ثلث، نسخ، دیوانی، رقعہ کوفی وغیرہ میں بھی بڑی مہارت سے لکھتے ہیں اور ٹائٹل پر ان خطوط کا مناسب جگہ پر خوبصورتی سے استعمال کرتے ہیں، شاہ صاحب کے ہر کام سے ذہانت کا اظہار ہوتا ہے، مثلاً عبارت کے مطابق خط کا استعمال اور ہر خط کے لئے مناسب قط کا استعمال، تاکہ عبارت واضح اور دلکش نظر آئے۔ ٹائٹل کی تیاری میں آپ مناسب رنگوں (Colour Scheme) کا بھی خوب استعمال کرتے ہیں، جس سے اس کی جاذبیت اور حسن میں بے خدا اضافہ ہو جاتا ہے، ایک اندازے کے مطابق گزشتہ پچاس برسوں میں برصغیر پاک وہند میں آپ سے زیادہ کسی دوسرے خطاط نے ٹائٹل تیار نہیں کئے، دنیا کی ہر ایسی لائبریری میں، جہاں اردو زبان کی دینی، علمی وادبی کتب رکھی جاتی ہوں، آپ کے خط کا کوئی نہ کوئی نمونہ ضرور ملے گا۔ اس کا اندازہ راقم کو بعض بیرونی ممالک کے اسفار میں ہوا، اب تک پاکستان کے جن معروف علمی، دینی اداروں کے ٹائٹل آپ نے تیار کئے ہیں ان میں سے چند یہ ہیں: پنجاب یونیورسٹی، مجلس ترقی ادب، مرکزی اردو بورڈ، (موجودہ اردو سائنس بورڈ) اقبال اکیڈمی، مرکز تحقیقات فارسی ایران وپاکستان، ادارہ القرآن والعلوم الاسلامیہ، ادارۂ اسلامیات، مکتبہ مدنیہ، مکتبۂ رشیدیہ، مکتبہ سید احمد شہید، ادارۂ ادب وتنقید، مرکزی انجمن خدام القرآن، مکتبہ بینات، مکتبہ اہل سنت وجماعت دارالاشاعت اور مجلس نشریات اسلام وغیرہ۔

شاہ صاحب کے فنی سفر کا اگر مطالعہ کیا جائے تو یہ حقیقت سامنے آئے گی کہ ہر بڑے خطاط کی طرح،

آپ کے خط کے مختلف ادوار ہیں، جو رنگ آج سے تقریباً تیس برس قبل تھا وہ آج نہیں۔ آپ کا خط مسلسل ارتقائی منازل طے کرتا رہا ہے، آج کل آپ کے خط نستعلیق میں ایرانی نستعلیق کی جھلک واضح ہے، جب کہ پہلے جس طرح آپ نستعلیق لکھتے تھے اس میں ''پرویزی نستعلیق'' کا رنگ زیادہ گہرا تھا، ایک موقع پر آپ نے اس بارے میں راقم سے فرمایا کہ آپ نے ہر دور میں خوب سے خوب تر کی تلاش جاری رکھی ہے، اسی لئے آپ کے خط میں زمانے کے ساتھ ساتھ تبدیلیاں نظر آتی ہیں، اب جس طرح آپ نستعلیق لکھتے ہیں اس کے جوڑ اور پیوند ''پرویزی نستعلیق'' کے جوڑ اور پیوندوں سے پتلے اور نازک ہیں۔

مرد کامل

حضرت سید نفیس الحسینی صاحبؒ

از: مولانا عابد لاہور

حدیث شریف میں آتا ہے:

عِشْ ماشِئتَ فَانَّکَ میتٌ واحبب مَنْ شِئتَ فَانَّکَ مفارِقَہٗ

جتنا چاہو جی لو مگر تمہیں بہر حال مرنا ہے اور جس سے چاہو جی لگا لو مگر تمہیں اس سے جدا ہونا ہی ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد عالی کے مطابق اس دنیائے فانی میں چل چلاؤ کا سلسلہ شروع ہے جو شخص یہاں آرہا ہے، وہ جانے ہی کے لئے آرہا ہے روزانہ سینکڑوں ہزاروں لوگ اس دنیا میں آرہے ہیں اور جارہے ہیں، لیکن کچھ شخصیات ایسی ہوتی ہیں کہ ان کا جانا معمولی نہیں ہوتا، انہی شخصیات میں سے ایک شخصیت ۲۶ رمحرم الحرام ۱۴۲۹ھ م/ ۵ رفروری ۲۰۰۸ء بروز منگل صبح پانچ بج کر پچیس منٹ پر، دار فانی سے دار بقا کو رحلت فرما گئی۔ میری مراد علم وعرفان کے بحر بیکراں مجسمہ زہد وایثار، پیکر تقدس وتقویٰ، کوہ استقامت، نابغۂ روزگار، سلف صالحین کی چلتی پھرتی یادگار، حامی توحید وسنت، ماحی شرک وبدعت، منبع فضائل وکمالات، مرجع خلائق، صبر ورضا اور توکل کی جیتی جاگتی تصویر، معرفت وعرفان کا دریا وجود وسخا کا چشمہ، صافی مجاہد وزاہد، عارف کامل، عاشق صادق، حضرت سید انور حسین نفیس الحسینی شاہ صاحب رحمۃ اللہ ہیں (انا للہ وانا الیہ راجعون)۔

مشہور مقولہ ہے۔

عند ذکر الصالحین تتنزل الرحمات

صالحین کے تذکرہ کے وقت اللہ تعالیٰ کی رحمتوں کا نزول ہوتا ہے، ہم اللہ تعالیٰ کی رحمتوں کے حصول کے لئے یادگار سلف صالحین حضرت شاہ صاحبؒ کا کچھ تذکرہ نذر قائین کرتے ہیں:

داستان عہد گل را از نظیری می شنو

عندلیب آشفتہ تر می گوید ایں افسانہ را

خاندان حضرت شاہ صاحبؒ کا نسبی تعلق سادات سے ہے، آپ نجیب الطرفین سید تھے۔ ہندوستان میں سادات کی ایک شاخ میں، حضرت صدرالدین ابوالفتح سید محمد الحسینی گیسودرازؒ جیسے نامور چشتی بزرگ گزرے ہیں، حضرت شاہ صاحبؒ کا نسب پندرہ واسطوں سے حضرت خواجہ گیسودرازؒ تک پہنچتا ہے۔ حضرت خواجہ گیسو درازؒ کی بارہویں پشت کے جدامجد حضرت ابوالحسن زید الجندیؒ پہلے بزرگ ہیں، جو برصغیر ہندوپاک میں وارد ہوئے، آپ ایک لشکر کے ساتھ علم جہاد بلند کئے ہوئے فتح دہلی کے لئے تشریف لائے اور ایک معرکہ عظیم میں خلعت شہادت سے سرفراز ہوئے۔ یہ ترکوں (غوریوں) کی فتح دہلی سے پہلے کا واقعہ ہے اور غالباً چوتھی صدی ہجری کا زمانہ ہے۔

حضرت شاہ صاحبؒ کی موارث اعلیٰ شاہ حفیظ اللہ گلبرگوی ۱۱۳۴ھ میں، دکن سے نقل مکانی کر کے پنجاب میں تشریف لائے۔

والدین مکرمین حضرت شاہ صاحبؒ کے والد محترم سید محمد اشرف علی بن سید بڈھن بن شاہ محمد سید الحسینی سیالکوٹی ۔۱۳۲۲ھ/۱۹۰۷ء میں بمقام گھوڑیالہ پیدا ہوئے، ابھی سات سال کے تھے کہ سایۂ پدری سے محروم ہو گئے، صابرہ وشاکرہ والدہ صاحبہ نے پرورش کی۔

سنہ ۱۳۲۰ھ میں آپ کی شادی اپنے چچازاد بھائی زبدۃ الاولیاء سید السادات حضرت سید محمد عبدالغنی شاہ صاحب قادری نقشبندی کی، سب سے چھوٹی صاحبزادی سے ہوئی۔ آپ حضرت شاہ صاحبؒ کی والدہ محترمہ تھیں، آپ رمضان المبارک ۱۹۰۷ھ/۲رمئی ۱۹۶۸ء کو اپنے خالق حقیقی سے جاملی تھیں۔

محمد اشرف علی صاحبؒ ۱۹۴۸ء سے ۱۹۶۸ء تک فیصل آباد میں قیام پذیر رہے، ستمبر ۱۹۶۹ء میں آپ کا مستقل طور پر لاہور منتقل ہو گئے۔ آپ اپنے دور کے خط نستعلیق اور خط نسخ کے ماہر خوشنویس تھے، آپ کے دست مبارک سے کتابت شدہ کئی کتابیں زیور طبع سے آراستہ ہو چکی ہیں، آخری عمر میں صرف قرآن کریم کی کتابت فرماتے تھے۔ حضرت شاہ صاحب تحریر فرماتے ہیں:

> "والد محترم نے یہاں (لائل پور موجودہ فیصل آباد) لطیف برادرز کے فتح محمد ٹرسٹ کے لئے قرآن مجید تحریر فرمایا، راقم السطور کی تحقیق کے مطابق لائل پور کی تاریخ میں پہلا قرآن پاک ہے جو اس شہر میں ارقام پذیر ہوا (شجرہ الاشراف ص:۲۶۶)

آپ نے اپنے دست مبارک سے بارہ قرآن شریف تحریر فرمانے کے علاوہ، کچھ پارے تاج کمپنی کے لئے، نیز اوپل کمپنی کے لئے پانچ پارے، بہاولپور کے چار پانچ پارے اور دہ سورہ، مترجم مولانا ظفر اقبال مرحوم بھی تحریر فرمائے۔

۳۰ربیع الاول ۱۴۱۶ھ ۲۸اگست ۱۹۹۵ء کو غروب آفتاب سے کچھ دیر پہلے، قلب ذاکر و شاغل کے ساتھ اس جہان فانی سے رخصت ہوئے۔ حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے آیت مبارکہ: ان رحمت اللّٰہ قریب من المحسنین، سے سال وفات ۱۴۱۶ھ نکالا۔

ولادت ۱۳ذوالقعدہ ۱۳۵۱ھ ۱۱مارچ ۱۹۳۳ء بروز ہفتہ موضع کھوڑیالہ ضلع سیالکوٹ میں آپ کی پیدائش ہوئی۔ حضرت شاہ صاحب رحمت اللہ علیہ فرماتے تھے،"جس گھر میں میری پیدائش ہوئی اس گھر میں ایک اینٹ بھی پکی نہیں تھی تمام اینٹیں کچی تھی"

حضرت شاہ صاحب کو پیدائشی گھٹی آپ کے ماموں حضرت مولانا سید اسلم شاہ صاحبؒ نے دی تھی، جو مولانا سید محمد انور شاہ صاحب کشمیریؒ کے شاگرد اور فاضل دیوبند تھے، اس بنا پر حضرت نفیس شاہ صاحبؒ فرماتے تھے:"میں تو پیدائشی دیوبندی ہوں کیونکہ مجھے پیدائشی گھٹی میرے ماموں مولانا محمد اسلم صاحب دیوبندی نے دی تھی جو فاضل دیوبند تھے، قیام پاکستان کے وقت حضرت شاہ صاحبؒ نے اپنے ماموں مولانا محمد اسلم صاحب کے پاس لائل پور (فیصل آباد) میں مقیم تھے۔

ابتدائی تعلیم تعلیم و تربیت کے متعلق حضرت شاہ صاحب تحریر فرماتے ہیں: خطاطی میرا موروثی فن ہے، بچپن ہی سے اس کا شوق ہے اور والد ماجد جناب سید محمد اشرف علی مدظلہ سے خطاطی کی تعلیم و تربیت پائی جو پاکستان کے سربرآوردہ خطاط قرآن اور خط نستعلیق کے ایک ماہر خوشنویس ہیں، اس وقت ان کی عمر تقریباً ۷۶ رسال ہے، پیرانہ سالی کے باوجود قرآن پاک کی خطاطی میں مشغول رہتے ہیں۔

راقم سطور نے آرنیہ ہائی اسکول "بھوپانوالہ ضلع سیالکوٹ" سے (جو آج کل جناح مسلم ہائی سکول کے نام سے موسوم) ہے، ۱۹۴۶ء میں مڈل پاس کیا، ۱۹۴۸ء میں سٹی مسلم ہائی سکول فیصل آباد سے فرسٹ ڈویزن میں میٹرک پاس کیا اور فن خطاطی کا باقاعدہ آغاز کیا۔ ۱۹۴۹ء میں گورنمنٹ کالج فیصل آباد میں داخلہ لیا اور ایف اے تک تعلیم پائی، خطاطی بھی ساتھ ساتھ جاری رہی، والد ماجد سے خاطر خواہ فنی استفادہ کیا اور آج جو کچھ میرے پاس ہے، وہ انہی کا ثمر فیض ہے (قلمی سوانحی خاکہ مرقومہ ۲۶ ربیع الثانی ۱۴۰۱ھ مارچ ۱۹۸۱ء)۔

اس کے علاوہ لاہور آمد کے بعد ۱۹۵۲ء میں اورینٹل کالج، پنجاب یونیورسٹی لاہور میں داخلہ لے کر منشی فاضل کا امتحان پاس کیا، جو بی اے آنرز کے برابر ہے۔

لاہور آمد سنہ ۱۹۵۱ء میں حضرت شاہ صاحبؒ لاہور تشریف لائے، منتقلی سے متعلق آپ تحریر فرماتے ہیں:
"ناچیز کو اچھی طرح یاد ہے کہ جب ۲۳ رستمبر ۱۹۵۱ء کو وارد لاہور ہوا تھا، لاہور میں کچھ جاننے والے لوگ موجود تھے، اس لئے امید تھی کہ کوئی پریشانی نہ آئے گی، لیکن یہ توقع بالکل غلط ثابت ہوئی لہذا کچھ وقت سراسیمگی میں گزرا، مزید برآں اسی عرصہ میں مجھے بخار بھی آنے لگا جس نے طوالت اختیار کرلی، ان دنوں میرا قیام قطب الاقطاب حضرت سیدنا علی ہجویری گنج بخشؒ کی مسجد کے عقب میں تھا، دس روپے ماہوار کرائے پر ایک کمرہ لے رکھا تھا۔ (خطاط الملک تاج الدین زریں رقم، احوال و آثار، ص:۴۰)

راقم الحروف نے وہ کمرہ دیکھا ہے، راعی بلڈنگ میں وہ کمرہ تھا، اب پرانی بلڈنگ گرا کر اس جگہ الراعی ماڈل گرلز اسکول قائم ہے۔

کسب معاش کسب معاش سے متعلق وہ خود حضرت شاہ صاحب تحریر فرماتے ہیں: ۲۳ رستمبر ۱۹۵۱ء کو فیصل آباد سے لاہور منتقل ہوا، یہاں کچھ عرصہ بعد منشی تاج الدین زریں رقم مرحوم سے رسم وراہ ہوئی۔ اگرچہ ان سے سلسلۂ تلمذ اور تعلق مشق و اصلاح نہیں تھا، لیکن میں نے متعدد باران کے قلم کی جولانیاں دیکھی ہیں، وہ صرف خط نستعلیق کے ماہر تھے، والد ماجد کے دیرینہ دوستوں میں سے تھے، انہوں نے بڑی شفقت سے سرپرستی فرمائی تھی اور پہلے روزنامہ "احسان" لاہور اور پھر روزنامہ "نوائے وقت" لاہور میں ملازمت دلائی۔ ۱۹۵۲ء سے ۱۹۵۶ء تک روزنامہ "نوائے وقت" کی ملازمت سے مستعفی ہوکر، آزادانہ فن خطاطی کی خدمات انجام دینے کا آغاز کیا اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل وکرم سے خوب خوب نوازا (قلمی سوانحی خاکہ ص:۱)

سنہ ۱۹۵۶ء کے بعد ایک زمانے تک شورش کاشمیری کے ہفت روزہ "چٹان" میں کام کرتے رہے مولانا سید حامد میاں صاحبؒ نے آپ کو جامعہ مدنیہ کریم پارک میں بلا کر کام کرنے کے لئے ایک کمرہ دے دیا، ۱۹۸۳ء تک آپ یہاں شائقین علم وفن کو خطاطی سکھاتے رہے اور اپنے قلم معجز سے گل و گلزار کھلاتے رہے۔ ۱۹۸۳ء کے بعد آپ نے اپنے دولت کدہ میں فیوضات باطنی و ظاہری کے لئے بیٹھنا شروع کردیا۔

مناصب حضرت شاہ صاحبؒ ایک عظیم المرتبت علمی وروحانی شخصیت تھے۔ خاص و عام ہر دو طبقہ کی علمی

ودینی اصلاح ورہنمائی جس طرح آپ نے فرمائی، اس کے احاطہ کے یہ چند صفحات متحمل نہیں، اس منصب اعلیٰ وحقیقی کے علاوہ جو اللہ تعالیٰ نے آپ کی لئے مقدر فرمایا، مندرجہ ذیل مناصب آپ کی شخصیت کا حصہ بنے:

(۱) عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت کے نائب امیر
(۲) اقرأ روضۃ الاطفال ٹرسٹ پاکستان کے امیر
(۳) پاکستان کے متعدد دینی مدارس کے بانی وسرپرست
(۴) ۲۳ سال کی عمر میں پاکستان خوشنویس یونین لاہور کے نائب صدر ۱۹۵۶ء تا ۱۹۷۲ء
(۵) پاکستان خوشنویس یونین لاہور کی صدارت ۱۹۷۶ء تا ۱۹۷۸ء
(۶) عالمی صحافی خوشنویس یونین کی صدارت ۱۹۷۳ء تا ۱۹۷۸ء
(۷) سیکڈ وتج بورڈ فار نیوز پیپر ایملائز گورنمنٹ آف پاکستان کی رکنیت ۱۹۷۳ء
(۸) آل پاکستان نیوز پیپر ایمپلائز کنفیڈریشن کے سینئر وائس پریذیڈنٹ ۱۹۷۶ء تا ۱۹۷۹ء
(۹) لاہور کمیٹی آف آل پاکستان نیوز پیپر ایملائیز کنفیڈریشن کی صدارت ۱۹۷۷ء تا ۱۹۷۹ء
(۱۰) دائرہ نفائس الخطوط کے بانی ومدیر

اعزازات

(۱) پاکستان نیشنل کونسل آف دی آرٹس کی نمائشی خطاطی منعقدہ ۱۹۸۰ء میں، اول انعام

(۲) قرآنی خطاطی کی کل پاکستان نمائش زیر اہتمام پاکستان پبلک ریلیشنز سوسائٹی لاہور، منعقدہ: ۱۹۸۳ء میں اول انعام

(۳) حکومت پاکستان کی جانب سے پاکستان کے تمام خطاطوں میں پہلا صدارتی ایورڈ برائے حسن کارکردگی (پرائڈ آف پرفارمنس ایوارڈ) اور گولڈ میڈل ۱۹۸۶ء میں پیش کیا گیا۔

(۴) بغداد میں منعقدہ عالمی مقابلہ خطاطی اور نمائش ۱۹۸۸ء میں بطور منصف مدعو کئے گئے۔

(۵) اسلامی ورثہ کے تحفظ کے بین الاقوامی کمیشن (ICIPICH) کے تحت یاقوت المستعصمی کے نام پر استنبول میں منعقدہ دوسرے عالمی مقابلہ خطاطی ۱۹۸۹ء میں بھی بطور منصف مدعو کئے گئے۔

شاعری حضرت شاہ صاحبؒ میں شاعری کا جذبہ پیدائشی اور فطری تھا، آپ ابھی انٹرمیڈیٹ کے طالب علم تھے کہ اس وقت سے آپ نے سید انور زیدی کے نام سے شعر گوئی شروع کر دی تھی۔ آپ کا سب سے پہلا غائبانہ اسلام زوردار اور پرتاثیر ہے، یہ نعتیہ سلام کالج کے ادبی میگزین میں شائع ہوا تھا، چند اشعار ملاحظہ فرمائیں:

سلام اے شمع روشن چشم عبداللہ کی بینائی
زمانہ تجھ پر قربان ہے، فرشتے ترے شیدائی
تیری آمد سے رونق آ گئی گلزار ہستی میں
عنادل چہچہا اٹھے، بہار آئی بہار آئی

شاعری کا رخ ابتدائی دور میں آپ نے غزلیات میں بھی کہیں اور نظمیں بھی ۱۹۷۰ء کے بعد آپ کی شاعری کا وہ دور شروع ہوتا ہے، جس میں آپ نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی منقبت میں ہدیہ ہائے عقیدت اور خدمت اقدس میں سلام پیش کیے۔ نظمیں، غزلیات اور نعتیہ کلام، "برگ گل" اور نفائس النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے نام سے شائع ہو چکے ہیں۔ حضرت شاہ صاحب کے کلام کے بارے میں یہ شعر پوری طرح صادق آتا ہے:

پڑی ہے جان تازہ اس سے مُردوں میں
ترا کلام بھی اعجاز ابن مریم ہے

تصنیف وتالیف اللہ تعالیٰ نے حضرت شاہ صاحبؒ کو تصنیف وتالیف کا ذوق بھی عطا فرمایا تھا، آپ کی تالیف کا رخ اکثر بزرگان دین کے تذکرہ وسوانح کی طرف رہا، آپ کی مطبوعہ تصانیف درج ذیل ہیں:
برگِ گل، نفائس النبی صلی اللہ علیہ وسلم، شجرۃ الاشراف، شمیم گلبرگہ، شمائم گیسودرازؒ، سادات گیسودرازؒ، قطب سواتؒ، حضرت سید احمد شہیدؒ سے حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ کے روحانی رشتے، حکایت مہر وفا، قاسم العلوم والخیرات، شعر الفراق، مقالات خطاطی، نفائس القلوب، تاریخ حبیبی وتذکرہ مرشدی، تلخیص سیدنا حضرت علی رضی اللہ عنہ وحسین رضی اللہ عنہ، ریحان عترت۔

آپ کی مرقعات پر مبنی کتب الاسماء الحسنی، اربعین صلاۃ وسلام، نستعلیق نامہ، نفائس اقبال، ارمغان

نفیس، ان کتب کے علاوہ آپ نے مختلف اخبارات اور رسائل میں متعدد تحقیقی مقالے تحریر فرمائے، جنہیں راقم الحروف نے بڑی محنت اور تگ ودو سے جمع کرلیا ہے ان شاء اللہ تعالیٰ بہت جلد شائع ہوں گے۔

حضرتؒ کی تصانیف انٹرنیٹ پر درج ذیل ویب سائٹ پر بھی موجود ہیں۔

WWW. nafeeslibrary.com

سلوک وطریقت حضرت شاہ صاحبؒ ۱۱رجمادی الاولیٰ ۱۳۷۷ھ ۴؍دسمبر ۱۹۵۷ء کو، برصغیر کے مشہور ومعروف روحانی پیشوا، قطب الاقطاب حضرت مولانا شاہ عبدالقادر رائے پوریؒ کے دست حق پر بیعت ہوئے۔ حضرت شاہ صاحب اپنی بیعت وسلوک کے متعلق خود تحریر فرماتے ہیں:

> ''سنہ ۱۸۵۷ء میں برصغیر کے مشہور ومعروف روحانی پیشوا حضرت مولانا عبدالقادر صاحب رائے پوری کے دست مبارک پر بیعت کا شرف حاصل کیا، جسے میں حاصل زندگی سمجھتا ہوں۔ (قلمی سوانحی خاکہ ص:۱)''

ایک دوسرے مقام پر آپ لکھتے ہیں:

> ''احقر نے سنہ ۱۹۵۶ء میں لاہور میں پہلی مرتبہ حضرت اقدس کی زیارت کی تھی اور کچھ دیر مجلس میں بیٹھنے کا شرف حاصل ہوا، اس کے بعد نومبر ۱۹۵۷ء میں حضرت ہندوستان سے پاکستان تشریف لائے اور لاہور میں صوفی عبدالحمید خاں صاحب کی کوٹھی پر تشریف فرما ہوئے، تو مجھے ایک دوست کی زبانی معلوم ہوا کہ حضرت اقدس رائے پوریؒ تشریف لائے ہیں، یہ سنتے ہی میرے دل میں ایک غیر معمولی کشش پیدا ہوئی، میں نے اسی وقت حمام میں جاکر غسل کیا اور پھر مسجد میں نوافل ادا کر کے حضرت اقدس کی خدمت میں حاضر ہوکر بیعت کی درخواست کی، جسے حضرت نے شرف قبولیت بخشا۔ بیعت کے بعد میرے دل کو بہت سکون حاصل ہوا، پھر ایک روز جب کہ مولانا سید حامد میاں صاحب بھی حضرت کی خدمت میں حاضر تھے انھوں نے حضرت سے مجھے ذکر کی اجازت دلائی اور مولانا موصوف نے حضرت سید محمد گیسودراز سے میرا تعلق نسبی بیان کیا تو حضرت اقدس نے فرمایا کہ وہ تو بڑے بزرگ تھے۔ پھر

فرمایا وہ شعر کس طرح ہے جو حضرت شیخ نصیر الدین چراغ دہلی نے ان کے بارے میں فرمایا تھا، اتفاق سے مجھے اس کا ایک ہی مصرعہ یاد تھا، حضرت سے سید مسعود علی کو آزاد کو بلایا اور پورا شعر دریافت کیا، آزاد صاحب کتاب ''بزم صوفیہ'' اٹھالائے اور پورا شعر پڑھ کر سنایا:

ہرکو مرید سید گیسودراز شد
واللہ خلاف نیست کہ او عشق باز شد

فرمایا کہ حضرت چراغ دہلی نے یہ بات قسم کھا کر فرمائی ہے۔

ایک رات نماز عشاء کے بعد حضرت مولانا عبدالوحید کی معیت میں احقر حضرت کی خدمت میں حاضر ہوا اور کیفیت ذکر عرض کی حضرت اقدس نے اس وقت میرے بارے میں ایسے الفاظ فرمائے جن کا تعلق مبشرات سے ہے اور جن کا بیان کرنا ضروری نہیں لیکن میں اس کیفیت کو تازیست محسوس کرتا رہوں گا۔ (حیات طیبہ ص: ۵۵۷۔۵۵۶)

اس حوالے سے حضرت شاہ صاحبؒ کا اپنے شیخ سے تعلق واضح ہوتا ہے کہ اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت رائے پوریؒ کو آپ سے کتنا تعلق تھا اور آپ پر کتنی شفقت فرماتے تھے، بہر حال حضرت رائے پوریؒ کی کمال مہربانی شامل حال ہوئی اور آپ نے اجازت بیعت سے مشرف فرمایا۔

بیعت وارشاد حضرت شاہ صاحبؒ نے اپنے شیخ کی ہدایت کے مطابق بیعت وارشاد کا سلسلہ بھی قائم فرمایا، لاکھوں فرزندان توحید نے اپ کے دست حق پر بیعت کا شرف حاصل کیا، اور صدہا افراد آپ کے دست مبارک پر اسلام قبول کر کے حلقہ اسلام کی زنجیر میں شامل ہوئے۔ یہ بات انتہائی قابل ذکر ہے کہ آپ نے اس سلسلہ میں عام مشائخ اور پیروں کی روش سے ہٹ کر خالصتاً اپنے شیخ کے طریقہ کو اپنایا۔ آپ بیعت برائے اصلاح وتربیت فرماتے تھے، آپ کے یہاں پیری مریدی کے مروجہ لوازمات نظر نہیں آتے تھے اور نہ ہی آپ کے یہاں مروجہ مجالس ذکر کر کے حلقے لگتے تھے، بلکہ آپ اسلام کرام کے طریقہ کے مطابق بیعت وارشاد کا مقصد سالک کے عقائد ونظریات کی اصلاح، سنت کے مطابق اعمال کا اہتمام اور تزکیہ نفس سمجھتے تھے، اور اسی کی ترغیب دیتے تھے اور اسی میں کوشاں رہتے تھے۔

جدائی کا بہانہ

اٹھے جاتے ہیں اس بزم سے ارباب نظر
گھٹتے جاتے ہیں میرے دل کے بڑھانے والے

جولائی سنہ ۲۰۰۷ء میں حضرت شاہ صاحبؒ کا ازبکستان جانا ہوا، سفر سے واپسی پر کان میں درد ہو گیا، جس کی ابتدائی وجہ ایک معمولی سی پھنسی تھی اور وہ مذکورہ بالا سفر سے پہلے ہی تھی، علاج معالجہ ہوتا رہا، حضرت شاہ صاحب کے معالج خصوصی ڈاکٹر شہر یار صاحب بہت خصوصی توجہ دیتے رہے، بعد ازاں کان میں موجودہ رطوبت کان کے اندرونی حصے مین چلی گئی آپریشن بھی ہوا جس سے طبیعت کچھ سنبھل گئی اور حضرت گھر تشریف لے آئے۔ رمضان شریف کے بعد طبیعت میں نقاہت بہت زیادہ تھی اور کان کی تکلیف بھی شدت اختیار کر گئی تھی، جس کی وجہ سے دوبارہ اسپتال جانا پڑا، عیدالاضحیٰ پر چندروز کے لئے گھر تشریف لے گئے، اس کے بعد ایک دفعہ مزید طبیعت بحال ہونے پر گھر تشریف لے آئے، چند دن گذرے تھے کہ پھر ہسپتال جانا ہو گیا، ڈاکٹر جمیل صاحب، بھائی زید الحسینی شاہ صاحب، بھائی احمد علی صاحب، محمد محسن صاحب، بھائی محمد نعیم صاحب نے، اس دوران حضرت شاہ صاحبؒ کی خدمت کی سعادت حاصل کی۔

وفات حسرت آیات

ڈاکٹر حضرات سرتوڑ کوشش کرتے رہے لیکن قضاوقدر کا فیصلہ غالب آیا اور حضرت شاہ صاحبؒ نے داعی اجل کو لبیک کہا اور اپنی جان جاں آفریں کے سپرد کر دی اور ایک عالم کو یتیم کر گئے (انا اللہ وانا الیہ راجعون)

اس طرح وہ آفتاب جو ۱۳/ذی قعدہ ۱۳۵۱ھ/۱۱/مارچ ۱۹۳۳ء کو ضلع سیالکوٹ کی بستی گھوڑیالہ میں طلوع ہوا تھا ۲۶ محرم الحرام ۱۴۲۹ھ/ ۵/فروی ۲۰۰۸ء کو بروز منگل صبح پانچ بجکر پچیس منٹ پر بوقت تہجد، اپنے مولیٰ کے آگے سجدہ ریز ہو گیا۔

حضرت کے انتقال کی خبر عشاق وخدام پر بجلی بن گری، حضرتؒ کی وصیت کے مطابق خدام و متعلقین نے انتہائی صبر وضبط سے کام لیا اور آہ وبکا اور گریہ و نامہ کے بجائے تسلیم و رضا کا مظاہرہ کیا۔

یہ روح فرسا خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی، پاکستان کے کونے کونے سے قافلے چلنے لگے، لاہور کے اطراف واکناف سے ہزاروں عقیدت مند، متعلقین، اقرباء اور اعزاء اور روحانی اولاد حضرت شاہ صاحبؒ کے گھر جمع ہونی شروع ہو گئی۔

بسم الله الرحمن الرحيم

اللهم صل على محمد وعلى آل محمد

كما صليت على ابراهيم وعلى آل ابراهيم

انك حميد مجيد

اللهم بارك على محمد وعلى آل محمد

كما باركت على ابراهيم وعلى آل ابراهيم

انك حميد مجيد

كتبه الفقير نفيس الحسيني اللاهوري غفر الله ذنوبه وستر عيوبه في رمضان المبارك سنة ١٤١٢

غسل وتکفین حضرت شاہ صاحبؒ نے اپنے کفن کا کپڑا پہلے سے تیار رکھا ہوا تھا، اسی سے حضرت مولانا نعیم الدین صاحب مدظلہم نے آپ کا کفن تیار کیا۔

حضرت شاہ صاحبؒ نے چند حضرات کے نام لے کر فرمایا تھا کہ یہ حضرات مجھے غسل دیں، چنانچہ آپ کی وصیت کے مطابق ان حضرات اور چند دیگر حضرات نے مل کر غسل دیا، شرکائے غسل کے نام درج ذیل ہیں:

بھائی سید زید الحسینی شاہ صاحب، بھائی محمد رضوان نفیس صاحب، حضرت مولانا محمد نعیم الدین صاحب، حضرت مولانا قاری سیف اللہ اختر صاحب، حضرت مولانا محمد حسن صاحب، حضرت مولانا عبدالرحمٰن صاحب، ڈاکٹر محمد جمیل احمد صاحب، بھائی احمد علی صاحب، محمد محسن صاحب، بھائی محمد نعیم صاحب، بھائی محمد سعید صاحب، مولانا حبیب الرحمٰن صاحب، رانا پرویز صاحب، بھائی محمود صادق صاحب اور راقم الحروف محمد عابد۔

گیارہ بجے غسل سے فراغت ہوئی، کچھ دیر کے لئے جنازہ گھر میں مستورات کے پاس رکھا گیا، یہاں اس کا ذکر ضروری ہے کہ حضرت شاہ صاحبؒ اپنی حیات میں خواتین کے سامنے نہیں جاتے تھے، اور نہ ہی خواتین آپ کی مجالس میں شریک ہوتی تھیں، آپ خواتین کو پردہ کے پیچھے ہی سے بیعت فرما لیتے تھے، آپ مستورات کے لئے پردہ کا بہت اہتمام فرماتے تھے اور خیال نہ رکھنے پر سخت ناراضگی کا اظہار فرماتے تھے اسی لئے حضرتؒ کے جنازہ کے ساتھ بھی اسی بات کا خیال رکھا گیا کہ کوئی نامحرم خاتون اندر گھریلو مستورات کے ساتھ نہ ہو کہ حضرت شاہ صاحبؒ کے جنازے کے پاس آئے۔

مستورات کے لئے دوپہر تین بجے جنازہ لے جانے کے بعد کا وقت رکھا گیا کہ وہ اس وقت آ کر حضرتؒ کے گھر والوں سے تعزیت کر لیں، تقریباً بارہ بجے حضرت شاہ صاحبؒ کے جنازہ کی چارپائی جامعہ مدینہ کریم پارک کے صحن میں زیارت عام کے لئے رکھی گئی، عشاق ومتوسلین اور متعلقین ومتبعین کا ازدہام تھا کہ قطار بنوا کر زیارت کروائی گئی، الحمدللہ انتشار کی صورت پیدا نہیں ہوئی، ظہر کی نماز تک زیارت کا سلسلہ چلتا رہا، زیارت اور دیدار کے لئے موقع دیا گیا تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ انتہائی سکون کے عالم میں حضرت نفیس شاہ صاحب آرام فرما رہے ہیں، حسین وجمیل چہرہ اسی آب وتاب اور نور وسرور کے ساتھ ناظرین کے سامنے تھا جس طرح حیات میں چہرہ پر شادابی اور شگفتگی ہوتی تھی۔

نشان مردِ مؤمن باتو گویم
چو مرگ آید تبسم برلب اوست

ظہر کی نماز کے بعد جنازہ اٹھایا گیا اور عتیق سٹیڈیم بینار پاکستان کی طرف روانہ ہوا، جب چار پائی اٹھائی گئی تو لوگوں کی ایک بڑی تعداد نے سڑک کے دنوں اطراف ہاتھوں کی لمبی زنجیر بنا کر راستہ بنایا، ہزاروں افراد جنازے کے ساتھ چلتے رہے، کریم پاک سے ایک بج کر پچاس منٹ پر جنازہ اٹھایا گیا اور دو بجکر پینتالیس منٹ پر عتیق اسٹیدیم پہنچا عتیق اسٹیڈیم میں پہلے ہی ہزاروں افراد موجود تھے، سپیکر کا نظم نہ ہونے کی وجہ سے صفیں بنوانے میں کافی دقت کا سامنا کرنا پڑا، سوا تین بجے کے بعد حضرت شاہ صاحبؒ کی وصیت کے مطابق حضرت مولانا سید جاوید شاہ صاحب مدظلہم (خلیفہ مجاز حضرت مولانا عبیداللہ انور صاحبؒ) نے جنازہ کی امامت کے فرائض سرانجام دیئے۔لوگوں نے عتیق سٹیڈیم میں جگہ ناکافی ہونے کے باعث باہر سڑک پر اور سڑک سے لے کر بینار پاکستان کے اندر تک صفیں بنا کر نماز ادا کی، نماز جنازہ کے بعد جنازہ خانقاہ سید احمد شہیدؒ لے جایا گیا۔ جب جنازہ خانقاہ پہنچا تو پہلے سے ہی سینکڑوں افراد یہاں موجود تھے، چونکہ حضرتؒ کے پوتے اور جانشین زید الحسینی شاہ صاحب نے ابھی جنازہ نہیں پڑھا تھا، اس لئے ان کی اجازت سے شیخ الحدیث حضرت مولانا عبدالمجید صاحب مدظلہم نے نمازہ جنازہ پڑھا، اس جنازہ میں بھی سینکڑوں افراد نے شرکت کی جو عتیق اسٹیڈیم نہیں پہنچ سکے تھے۔

تدفین عصر کی نماز کے بعد جنازہ خانقاہ سے باہر لایا گیا ایک مخصوص احاطہ میں حضرت شاہ صاحبؒ کی آخری آرام گاہ تیار کی گئی تھی۔ پانچ بجے حضرت شاہ صاحبؒ تعالیٰ کو لحد میں اتارا گیا، لحد میں اتارنے والے خوش نصیب افراد کے نام درج ذیل ہیں۔

بھائی رضوان نفیس، بھائی محمد نعیم، بھائی احمد علی، مولانا سیف اللہ اختر صاحب، مولانا عبدالرحمٰن صاحب، مولانا خلیل الرحمٰن صاحب۔

اولا دو احفاد حضرت شاہ صاحبؒ نے اپنے پیچھے لاکھوں روحانی اولاد کے علاوہ دو پوتے اور پانچ پوتیاں چھوڑیں، یاد رہے کہ حضرت شاہ صاحب کے ایک ہی فرزند تھے جو ۱۹؍رجب المرجب ۱۴۲۲ھ/ ۸؍اکتوبر ۲۰۰۱ء بروز پیر قضائے الٰہی سے وفات پاگئے تھے، ان کی عمر پینتالیس سال تھی، قرآن کریم کے حافظ اور وفاق المدارس العربیہ پاکستان اور جامعہ مدینہ کریم پارک کے فاضل تھے، بہترین خطاط اور اپنے والد محترم حضرت

شاہ صاحبؒ کے انداز خطاطی کے امین ووارث تھے، اپنی والدہ محترمہ کی وفات کے صرف چار ماہ بعد قبرستان میانی صاحب میں احاطہ سادات گیسودرازؒ میں، اپنے بزرگ سید محمد اشرف علی صاحب کے پہلو میں مدفون ہوئے تھے۔

جانشین حضرت شاہ صاحبؒ کی وصیت کے مطابق آپ کے پوتے محترم زید الحسینی شاہ صاحب حفظہ اللہ کی دستار بندی کی گئی اور آپ کو حضرت شاہ صاحبؒ کا جانشین مقرر کردیا گیا۔

اوصاف وکمالات حضرت شاہ صاحبؒ کے اوصاف وکمالات کا تذکرہ میرے جیسا کم علم اور کوتاہ قلم کیا کرسکتا ہے کہ یہ تو سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہے، حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت شاہ صاحب کو بہت سی خوبیوں سے نوازا آپ کو ذات رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم سے اور آپ کے اصحاب رضوان اللہ اجمعین سے خاص لگاؤ تھا، اہل بیت عظام کے تو آپ عاشق تھے، اسی کا اثر تھا کہ ساری زندگی آپ اہل بیت کے فضائل ومحاسن بناتے رہے اور اہل بیت کا دفاع کرتے رہے۔ آپ میں استغناء کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا، تواضع اور عاجزی کا آپ کا شعار تھی، نام ونمود سے نفرت تھی، اپنے لئے کبھی بھی کوئی تعظیمی القاب پسند نہیں فرماتے تھے، خوش خلقی وضع داری اور ملنساری میں اپنی مثال آپ تھے، ہر طبقہ کے افراد آپ کی مجلس میں حاضر ہوتے تھے اور آپ کی مجلس میں آکر ہر شخص یہ سمجھتا تھا کہ حضرت کو سب سے زیادہ تعلق مجھ سے ہی ہے، خورد نوازی میں ممتاز تھے، چھوٹوں کو آگے بڑھاتے، حضرت سید احمد شہیدؒ تعالیٰ سے خاص قلبی وروحانی تعلق تھا، شیخ الاسلام حضرت مدنی اور حضرت مولانا علی میاں صاحبؒ کے خانوادہ سے خاص تعلق اور لگاؤ رکھتے تھے۔ الغرض حضرت کے بہت سارے کمالات ایسے تھے جن کا تعلق مشاہدہ سے تھا، صفحۂ قرطاس پر تحریر کے احاطہ میں لانا ممکن نہیں ہے۔

قلم بشکن، سیاہی ریز، کاغذ سوز، دم درکش
حسنؔ این قصہ عشق است در دفتر نمی گنجد

حضرت کے خادم خاص بھائی رضوان نفیس صاحب کی بے مثال خدمت

حضرت شاہ صاحبؒ فرماتے تھے کہ اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل کرنے کے لئے انتہائی قریب ترین، دوراستے ہیں، ایک راستہ محبت کا ہے اور دوسرا راستہ خدمت کا ہے۔ ان دونوں میں سے خدمت کا راستہ بلند ہے جس نے خدمت کا راستہ اپنایا وہ بہت جلد واصل ہوگیا۔

ہم سب حضرت شاہ صاحبؒ سے محبت اور عقیدت رکھتے تھے اور اپنے آپ کو حضرت کا خادم شمار کرتے ہیں، لیکن یہاں ایک بات قابل ذکر ہے کہ حضرت شاہ صاحبؒ کے خادم خاص، ہر وقت کے ساتھی، سفر وحضر کے رفیق، صبح وشام کے حاضر باش، بھائی محمد رضوان نفیس صاحب حفظہ اللہ نے جو خدمت کی ہے وہ قابل رشک حد تک لائق صد تحسین ہے۔ اس گئے گزرے دور میں اپنا تن من دھن اپنے شیخ مربی کے لئے، اپنی صحت وبیماری اپنے شیخ ومربی کی نذر، اپنی صبح وشام اپنے شیخ ومربی کی خدمت میں پیش کرنے کا جو انداز محترم بھائی محمد رضوان نفیس صاحب نے اپنایا وہ بے مثال ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت شاہ صاحبؒ کو بھی بہت زیادہ قلبی تعلق بھائی رضوان نفیس صاحب سے تھا اور بہت اعتماد ویقین تھا، اس سلسلے میں سب سے منفرد بات خانقاہ سید احمد شہید کے ایک رمضان میں پیش آئی حضرت شاہ صاحب محبت وسخاوت کا ایک بحر بیکراں تھے، حضرت شاہ صاحبؒ کا معمول رمضان کے اختتام پر اپنے ساتھیوں کو ہدایا دینے کا ہوتا تھا، اسی رمضان میں بھی جب آپ ہدایا تقسیم فرما رہے تھے تو آخر میں ایک صاحب نے آپ سے عرض کیا کہ حضرت نے بھائی رضوان کو کچھ نہیں دیا، تو حضرت نے بے ساختہ فرمایا کہ: "کہ وہ اہل خانہ میں سے ہیں" یہ بھائی رضوان نفیس صاحب کے لئے ایک بہت بڑی سعادت ہے۔

ایں سعادت بزرو بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

اللہ تعالیٰ ہم سب کو حضرت شاہ صاحبؒ کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے، حضرت شاہ صاحب کے ورثاء کو صبر جمیل عطا فرمائے اور حضرت شاہ صاحب کے درجات کو بلند فرما کر اعلیٰ علیین میں جگہ عطا فرمائے اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت سے سرفراز فرمائے۔ حضرت شاہ صاحبؒ کی زبان میں ہم یہ دعا کرتے ہیں:

ہو نصیب جام کوثر یہ نفیس کی دعا ہے
مگر اک حسین تمنا کہ حضور خود پلائیں

☆ ☆

ایک باغ و بہار شخصیت حضرت سید نفیس الحسینی صاحبؒ

ڈاکٹر سید عزیز الرحمٰن

حضرت نفیس شاہ صاحب بھی اللہ کو پیارے ہوئے، ظلمتوں کے دور میں چند شمعیں ٹمٹا رہی تھیں ان میں سے ایک شمع اور خاموش ہوگئی، اپنا کام پورا کر کے اپنے رب کے حضور پیش کی گئی۔ بے قراری نے آخر قرار پالیا اور جادۂ حق کا مسافر بالآخر شاد کام ہوگیا۔

آپ کا پورا نام سید انور حسین نفیس الحسینی تھا۔ آپ کے والد سید محمد اشرف علی سید القلم بھی بڑے خطاط تھے، سنہ ۱۹۹۵ء میں لاہور میں وفات پائی، نفیس شاہ صاحب ۱۱؍ مارچ ۱۹۳۳ء/۱۳؍ ذی قعدہ ۱۹۴۸ء میں اس وقت لائل پور اور آج کے فیصل آباد کے سٹی مسلم ہائی اسکول سے میٹرک کیا، اسی دوران والد گرامی کی زیر نگرانی کتابت وخطاطی کا آغاز کیا، سنہ ۱۹۵۰ء میں گورنمنٹ کالج لائل پور سے ایف اے کا امتحان پاس کیا، آپ کی پہلی کتاب جو آپ نے کتابت فرمائی، وہ معرف سیرت نگار قاضی محمد سلمان منصور پوری کی شہرۂ آفاق کتاب رحمۃ للعالمین [صلی اللہ علیہ وسلم] تھی۔

سنہ ۱۹۵۱ء میں آپ لاہور میں منتقل ہوگئے، اس وقت سے تادم آخر آپ کا قیام لاہور میں ہی رہا۔ آپ کی پوری زندگی کا سلسلہ رشد وہدایت سے وابستگی اور فن خطاطی کے فروغ کے جہد مسلسل سے عبارت ہے، آپ کے مریدین اور تلامذہ دونوں کی تعداد ہزاروں میں ہے، ایک محتاط اندازے کے مطابق گذشتہ پچاس ساٹھ برسوں کے دوران جس شخصیت سے فن خطاطی میں سب سے زیادہ اکتساب فیض کیا گیا، وہ آپ ہی ہیں۔

آپ کو برِاعظم پاک وہند کے عظیم صوفی وبزرگ اور سلسلہ قادریہ کے گل سر سبد حضرت مولانا شاہ عبدالقادر رائے پوریؒ سے نسبت تصوف اور اجازت وخلافت حاصل تھی اور آپ اسی سلسلہ رشید کے اس زمانہ میں سب سے اہم بلکہ آخری کڑی تھے۔(۱)

(۱)

اہل علم اور بزرگوں کو شمع سے تشبیہ دینے کی روایت ایک زمانے سے چلی آرہی ہے، مگر یہ صرف ایک روایت ہی نہیں، غور کیا جائے تو خاصی معنی خیز روایت ہے۔ شمع کی خوبی یہ ہیکہ اس سے اکتساب فیض ہر ایک شخص بقدر ذوق اور بقدر ہمت کرتا ہے، پھر جو جس قدر قریب ہوتا ہے اسی قدر فیض اٹھاتا ہے مگر شمع کی نظر اور عمل سب برابر ہوتے ہیں، وہ سب سے برابر کا سلوک کرتی ہے، سب کو برابر نوازتی ہے، کسی سے امتیازی برتاؤ اس کا شیوہ نہیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ خلوت اور انجمن کی بہترین مثال ہے کہ مجمع میں گھری ہوئی ہے، ایک زمانہ اس پر ہجوم کئے ہوئے ہے اور وہ سب کے ساتھ ہے، سب پر مہربان ہے مگر اس کی اپنی توجہ کسی اور جانب لگی ہوئی ہے، اس کا رخ سیدھا ہے بالکل واضح، حوادث کی آندھی، مسائل کے جھگڑ، اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ ذرا دیر کو اس کا رخ یہ حوادث پھرتے بھی ہیں تو پھر وہ کوشش کر کے یکسو ہو جاتی ہے اور بالآخر اس جدوجہد میں اپنی جان ہار جاتی ہے مگر اس وقت بھی اس کا رخ آسمان والے ہی کی طرف ہوتا ہے۔ بزرگوں کا بھی یہی قصہ ہے وہ سب کے ساتھ ہوتے ہیں سب کو بلا امتیاز واختصاص نوازتے ہیں مگر زیادہ فوائد وہی سمیٹتا ہے جو ان کے زیادہ قریب ہوتا ہے کہ صحبت کا اثر ایک تسلیم شدہ حقیقت ہے، پھر وہ نظر بہ نظر خلق خدا کی جانب متوجہ ہوتے ہیں مگر ان کا دل یک لحظہ بھی خالق کائنات کی یاد سے غافل نہیں ہوتا۔ بات دور نکل گئی، بہر کیف عرض یہ کرنا ہے کہ حضرت شاہ صاحبؒ کی ذات بھی ایک ایسی شمع تھی کہ جس کے مکتسبین کم نہیں، جس کسی کا بھی تعلق رہا وہ ان سے ضرور متاثر ہوا۔

حضرت شاہ صاحب کی کئی حیثیتیں تھیں، بلند پایہ خطاط تھے، وسیع حلقہ اثر رکھنے والے صوفی بزرگ تھے، عمدہ ذوق کے حامل ادیب تھے اور شاعر تھے، خصوصاً آپ کی بعض بلند پایہ نعتیں آج بھی قلوب اور اذہان کو بیک وقت متاثر کرتی ہیں اور انہیں پڑھنے اور سنتے ہوئے دل و دماغ پر ایک وجد آفریں کیفیت طاری ہو جاتی ہے، آپ کے خصوصاً خطاطی اور خطاطوں کے حوالے سے علمی و تحقیقی مضامین آج بھی حوالے کا کام دیتے ہیں، فن خطاطی میں آپ کے تلامذہ اپنے اپنے مقام پر استاد فن کا درجہ رکھتے ہیں، آپ اس سب کے باوجود بہت ذوق مطالعہ رکھتے تھے، آپ کی ذاتی لائبریری عمدہ ترین لائبریری شمار ہوتی ہے، ہمارے عہد قریب کے صوفیا میں ایسا عمدہ علمی ذوق خال خال حضرت کو ہی نصیب ہوا ہے، اس کے ساتھ قدیم وجدید کتب کے بھی شائق تھے، اس درجہ کتاب پسند آجاتی تو اسے زر کثیر سے صرف کر کے چھپواتے اور پھر اہل علم اور اہل ذوق میں مفت تقسیم کرتے۔

خواجہ گیسودرازؒ سے نسبتاً تعلق تھا، ان کی تفسیر الملتقط مخلوطے کی شکل میں عرصے سے لندن میں موجود تھی، غالبًا واحد نسخہ ہے جو دنیا میں موجود ہے۔ آپ کو علم ہوا تھا تو اسے منگوایا اور اس طویل تفسیر کو جو صوفیاء کے ذوق پر تحریر کی جانے والی نمائندہ تفسیر کہی جاسکتی ہے، اعلیٰ ترین طباعت اور انتہائی مضبوط جلد کے ساتھ شائع کرائی، راقم کو ایک سیٹ عندالملاقات عطا فرمایا، اس مخطوطے میں چونکہ قرآن کریم کا متن موجود نہیں، اس لئے اپنے والد گرامی کا کتابت شدہ ایک قرآن کریم کا عکس، مکمل طور پر آغاز مین شامل فرمایا۔ والد صاحب نے اسے ملاحظہ فرمایا تو خواہش ظاہر کی کہ ان کی تفسیر احسن البیان میں متن کے طور پر شامل کیا جائے، میں دوبارہ حاضر ہوا تو والد صاحب کی جانب سے اس خواہش کا اظہار کیا، بلاتامل اجازت فرمائی، چنانچہ احسن البیان کے آخری تین حصوں میں موجود کتابت وہی ہے۔

سیرت محمد بن اسحاق سیرت کی ابتدائی امہات الکتب میں شمار ہوتی ہے، یہ مکمل طور پر تاحال دستیاب نہیں ہوئی اور اس کے دو نسخے الگ الگ بیروت وغیرہ سے شائع ہوئے تو شاہ صاحبؒ نے پسند کئے اور انہیں شائع کرنے کا ارادہ کیا، چنانچہ بڑی تقطیع پر شائع کروائے۔ راقم کے پاس آپ کے عطا فرمودہ یہ دونوں تبرکات بھی موجود ہیں، جواب دارالعلم والتحقیق کی لائبریری کی زینت بنائے جارہے ہیں۔ ان شاءاللہ

حضرت شاہ صاحب چونکہ سادات سے تعلق رکھتے تھے اس لئے اہل بیت سے خصوصی تعلق تھا، جو لوگوں میں بعض اوقات شاید غلو کے درجہ میں پہنچ جاتا ہے مگر شاہ صاحبؒ "عقیدے" اور عقیدت کے فرق سے واقف تھے کہ صحیح معنی میں "عارف" تھے اور عارف عالم بھی ہوتا ہے، اسی رشتے سے معروف مصری عالم اور سیال قلم کے مالک ابوزہرہ کی کتاب امام زید آئی تو اسے بھی اپنے ذوق کے مطابق اعلیٰ معیار پر شائع کردیا۔ راقم کو حسب سابق عنایت کی اور خلاف معمول فرمایا کہ والد صاحب کو دکھانا اور ان سے اس پر رائے ضرور لینا کیونکہ یہ سوچنے کا زاویہ ہے۔

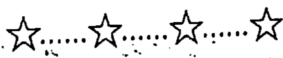
راقم کی حضرت شاہ صاحب سے پہلی ملاقات ۱۹۹۷ء میں والد صاحب کے ہمراہ ہوئی تھی، پھر یہ معمول رہا کہ ہر بار لاہور آمد پر حضرت شاہ صاحب کی خدمت میں حاضری اس سفر کا حصہ ہوتی تھی۔ آخری بار ملاقات چندہ ماہ قبل آپ کی قائم کردہ خانقاہ سید احمد شہیدؒ دسگیاں والا ایل لاہور میں ہوئی تھی، ڈیڑھ دو ماہ قبل جب دوبارہ لاہور جانا ہوا تو آپ علیل تھے، اس بنا پر ملاقات نہ ہوسکی، کسے خبر تھی کہ اب یہ موقع نہ مل سکے گا۔

بزرگوں کا دربار عوامی دربار ہوتا ہے، جہاں آنے جانے سے کسی کو تامل نہیں ہوتا، یہی وجہ ہے کہ مجھ جیسا شخص بھی جو عام طور پر رواجی اور روایتی ملاقاتوں سے پیچھے رہتا ہے وہاں بلا تکلف حاضر ہو جاتا۔ آج کے بعض مشائخ کے ہاں تو اب باقاعدہ حاضری کا نظم وضبط ہے، جس کی پیروی لازم قرار دی جاتی ہے، شاہ صاحب ان تکلفات سے ماوراء تھے، پھر خورد نوازی اور چھوٹوں پر شفقت میں بھی اپنی مثال آپ، وقار تھا، تمکنت تھی مگر رسمی شکوہ اور مصنوعی جاہ وجلال نام تک کو نہ تھا۔ بارہا ایسا ہوا کہ گھر پر حاضری ہوئی، کھانے کا وقت ہو گیا تو روک لیا، دستر خوان بچھایا گیا، سب کے ساتھ بیٹھے اپنا پرہیزی کھانا جو نہایت سادہ تھا سب کے ساتھ بیٹھ کر تناول فرمایا، بعض حضرات کی طرح عوام سے ہٹ کر حجرہ خاص پر اہتمام کے ساتھ بیٹھنے کا رواج نہ تھا، اب یہ باتیں یاد آئیں گی یا آج کا چلن ہمیں یاد دلائے گا، آخر میں تبرکاً آپ کی ایک مقبول عام نعت کے دو شعر درج کرتا ہوں:

تیرے انداز میں وسعتیں فرش کی
تیرے پرواز میں رفعتیں عرش کی
تیرے انفاس میں خلد کی یاسمیں
تجھ سا کوئی نہیں تجھ سا کوئی نہیں

اے سراپا نفیس، انفسِ دو جہاں
سرورِ دلبراں دلبر عاشقاں
ڈھونڈتی ہے تجھے مری جان حزیں
تجھ سا کوئی نہیں تجھ سا کوئی نہیں

آخر کار ۵ر فروری کو یہ شمع حق بھی اپنا فریضہ ادا کر کے اپنے رب کے حضور حاضر ہو گئی۔ اب اس کی یاد ہے جو تا دیر ہم کو روشنی بہم پہنچاتی رہے گی، رہے نام اللہ کا۔



سید شاہ نفیس الحسینیؒ

نفیس رقم، نفیس مزاج اور ایک نہایت نفیس شخصیت

نورالحسن راشد کاندھلوی

حضرت سید شاہ نفیس الحسینی صاحب اپنی ذات میں ایک انجمن اور ایک ادارہ تھے، ان میں ایسی شان محبوبیت اور مزاج میں ایسی جاذبیت وجامعیت تھی کہ ہر میدان ومزاج کے افراد ان کے رابطہ میں رہتے تھے اور شاہ صاحب ایک خاص ادائے دلنوازی کے ساتھ ان سے ایسا تعلق رکھتے تھے کہ وہ ہمیشہ ان کے دام محبت کے اسیر ہی رہتے تھے اور ذہنی فکری اختلاف کے باوجود، شاہ صاحب میں اپنے لئے ایک خاص کشش پاتے اور ان سے وابستہ رہنے اور دینی علمی، ادبی فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتے تھے۔

شاہ نفیس صاحب اگرچہ انگریزی اسکولوں کالجوں کے تعلیم یافتہ وپروردہ تھے، لیکن ان کی تمام تر تربیت، دینی روحانی، علمی اور خاص طور سے قرآن مجید کی خدمت کے ماحول میں ہوئی تھی۔ ان کے کئی بڑوں کا قرآن مجید کی خدمت وکتابت کا دائمی معمول تھا، اہل خاندان کے ذوق کتابت کی وجہ سے خطاطی سے طبعی انسیت ومناسبت تھی اور بعد میں وہی معاش کا ذریعہ اور شاہ صاحب کی عالمی آفاقی شہرت کا زینہ ثابت ہوئی۔

شاہ نفیس صاحب نسلاً حسینی سید اور برصغیر ہند میں سلسلہ چشتیہ کے ایک بہت ممتاز اور نامور مرشد، حضرت سید بندہ نواز گیسو دراز (جن کا نام محمد بن یوسف تھا، وفات ۸۲۵ھ) مدفون گل برگہ (دکن) کی اولاد میں سے تھے۔

سید بندہ نواز کے اخلاف میں سے شاہ حفیظ اللہ نامی ایک شخص، دکن سے پنجاب آ گئے تھے، وہ اور ان کی اولاد یہیں رہی، اسی خاندان میں سید اشرف علی زیدی، خطاط کے گھر میں ۱۲/ ذی قعدہ ۱۳۵۱ھ، گیارہ مارچ ۱۹۳۳ء کو شاہ نفیس صاحب تولد ہوئے۔

سید اشرف علی بہت اچھے ماہر خوشنویس تھے، انہوں نے اپنے فن کے اظہار کے لئے قرآن مجید کی خدمت و کتابت کو وسیلہ بنایا اور پوری زندگی اسی میں مشغول رہے(۱) سید اشرف علی صاحب کی ۳۰ر ربیع الاول ۱۴۱۶ھ/ ۲۸ر اگست ۱۹۹۵ء کو وفات ہوئی (۲)

شاہ صاحب کی تعلیم کی ابتداء سید اشرف علی صاحب سے، اور ان ہی سے خط اور تحریر کی مشق نیز عالیہ ہائی اسکول بھومان والا، ضلع سیالکوٹ میں تعلیم سے ہوئی، شاہ صاحب نے اس اسکول سے ۱۹۴۶ء میں مڈل پاس کیا۔ اس کے دو سال بعد شاہ صاحب کے والد پرانے وطن گھوڑیالہ سے لائل پور (جس کو اب فیصل آباد کہتے ہیں) آ گئے تھے، اس کے بعد شاہ صاحب کے تقریباً پانچ سال لائل پور میں گزرے، وہیں تعلیم کا سلسلہ بھی جاری رہا، سنی مسلم ہائی اسکول لائل پور سے فرسٹ ڈویژن میں میٹرک کیا، ۱۹۴۶ء میں گورنمنٹ کالج لائل پور سے ایم۔ اے کا امتحان دیا اور کامیاب ہوئے۔ ذی الحجہ ۱۳۷۰ھ (ستمبر ۱۹۵۱ء) میں شاہ صاحب لائل پور سے لاہور آ گئے تھے اور پھر تا حیات وہیں رہے۔ لاہور میں اورنٹیل کالج سے فاضل کا امتحان دیا، اس میں بھی کامیاب ہوئے۔

کتابت کی ابتدائی تعلیم نوعمری میں والد صاحب سے شروع کی تھی، جب تک ان کے ساتھ رہے فن کتابت میں استفادہ اور مشق تحریر جاری رہی، اس نسبت اور اہل خاندان کے خطاطی کے ذوق کی وجہ سے، یہ کہنا برمحل ہوگا کہ خطاطی اور نسخ و نستعلیق کی کتابت کا فن شاہ صاحب کی گویا گھٹی میں پڑا ہوا تھا، جس کو خاندان

---

(۱) خطاطی صرف سید اشرف علی زیدی کا ہی واحد ذوق نہیں تھا، بلکہ اس خاندان کے اور اصحاب بھی اس میں خاص دسترس رکھتے تھے۔ انہیں میں سے ایک، شاہ صاحب کے عم زاد سید نیک عالم شاہ صاحب تھے۔ جنہوں نے کہنا چاہئے کہ قرآن مجید کی خطاطی اور کتابت کا ایک ریکارڈ قائم کیا، بہت کم خطاط و کاتب ہوں گے، جنہوں نے اس بڑی تعداد میں اور اس تیز رفتاری سے فن کتابت کے جملہ معیارات کا اہتمام کرتے ہوئے، اتنی بڑی تعداد میں قرآن شریف کتابت کئے ہوں۔ شاہ نفیس صاحب نے لکھا ہے کہ سید نیک عالم شاہ صاحب نے انسٹھ قرآن شریف کتابت کئے، اور ایک حمائل شریف صرف ۲۳ر دن میں لکھی۔

(۲) سید اشرف علی کا شاہ نفیس نے اپنے خاندانی بزرگوں کے تذکرہ، شجرۃ الاشراف میں ذکر کیا ہے۔ ص: ۷۷/۴۷/۴۸ (لاہور: ۱۴۲۳ھ) سید اشرف علی صاحب کی وفات پر شاہ نفیس الحسینی نے جو اشعار کہے اور اظہار غم کیا، وہ شاہ صاحب کے مجموعۂ کلام "برگ گل" کے اوراق میں دیکھا جا سکتا ہے۔

سید شاہ اشرف کا مکتوبہ ایک مکمل قرآن شریف، شاہ صاحب نے خواجہ گیسودراز کی تفسیر "الملتقط" کے ساتھ شائع کر دیا ہے۔

کے ان بڑے خطاطوں کی وجہ سے خاص ترقی ہوئی اور شاہ صاحب کمال فن کی منزلیں چڑھتے چلے گئے۔ لاہور پہنچے تو اس وقت تک کتابت کی خاصی مشق کر چکے تھے، اس لئے خاندان کے معمول کے مطابق، کتابت کو ذریعۂ معاش بنایا اور روزنامہ ''احسان'' لاہور میں کاتب کی حیثیت سے ملازم ہو گئے، احسان میں کام کرتے رہے اور کتابت کے فن میں خوب سے خوب ترقی کی جستجو میں لگے رہے، احسان سے رابطہ کتابت منقطع ہوا تو روزنامہ ''نوائے وقت'' میں ملازم ہو گئے، ۱۹۵۶ء میں نوائے وقت کو بھی چھوڑا اور شورش کاشمیری کے ہفت روزہ ''چٹان'' کے شعبۂ کتابت سے منسلک ہو گئے۔ چٹان کے زمانہ ملازمت و کتابت میں شاہ صاحب کے قلم کے امتیازات اور کتابت میں خاص مہارت و دسترس کا اظہار ہونے لگا تھا، لیکن شاہ صاحب کتابت میں اعلیٰ ترین معیارات کی تلاش اور نئے میدانوں کی جستجو میں برابر جدوجہد کرتے رہے، جس کی وجہ سے ان کے نہ صرف قلم کو جلا ملی، فن کو ترقی ہوئی، بلکہ شاہ صاحب کا بحیثیت ممتاز اور صاحب فن خطاط کے تذکرہ آنے لگا۔

شاہ صاحب چٹان میں کام کر رہے تھے کہ مولانا سید حامد میاں صاحب نے (جو ہندوستان کے مشہور عالم، مصنف اور مورخ مولانا سید محمد میاں صاحب دیوبندی کے فرزند اور جامعہ مدنیہ لاہور کے بانی بھی تھے) شاہ صاحب کو دفتر چٹان سے جامعہ مدینہ میں آنے کی دعوت دی، مولانا کے اصرار پر شاہ صاحب جامعہ مدینہ منتقل ہو گئے، وہیں کتابت کا مشغلہ اور فن کتابت کی تعلیم کا سلسلہ شروع کیا، جو زندگی کے آخر تک کسی نہ کسی درجہ میں جاری رہا۔۔۔ بعد میں جامعہ مدینہ کے سامنے ہی مکان بنالیا تھا، آخری سال کے علاوہ تمام وقت وہیں گذرا، یہی گھر مرکز ارشاد و معرفت تھا، وہی خانقاہ تھی، وہی دار التصنیف والتربیت تھا، وہیں کتابت کے لعل و گہر لٹائے جاتے تھے، اسی گھر میں تمام اہل علم و ادبا و ارباب سلوک و معرفت شاہ صاحب سے ملتے اور استفادہ کرتے تھے۔

شاہ صاحب کی مہارت فن اور نقوش قلم نے صرف کاغذ اور سرورق پر ہی اپنا کمال نہیں دکھایا، بلکہ مختلف عمارتوں مسجدوں، عجائب گھروں اور یادگار عمارتوں کی دیواروں محرابوں پر بھی، شاہ صاحب کی برش قلم نے ایسے انمول خوبصورت اثرات اور مہارت فن کی منہ بولتی داستانیں ثبت کی ہیں کہ آدمی دیکھتا ہی رہ جائے۔ ایوان اقبال کے لئے حرف و رنگ کے جو پیکر تراشے ان کے عکس بلکہ عکس ہائے جمیل شائع ہو چکے ہیں، جو آنکھوں

کا نور و سرور بڑھاتے ہیں۔ اور کاملین فن سے اپنی دقّت فن اور نزاکت کا اعتراف کرا رہے ہیں اور کاتب کے قلم کے جماؤ اور معیار کی یکسانیت و بلندی کی داد پا رہے ہیں۔

شاہ صاحب کو قرآن مجید اور حمائل شریف کے اجزاء لکھنے کی بھی سعادت نصیب ہوئی، اقبال کا کلام اور غالب کا دیوان بھی لکھا اور ایسا لکھا کہ گویا حرف بولنے لگے، کمپیوٹر کے لئے بھی نستعلیق کا پورا پروگرام لکھا تھا مگر افسوس کہ ادھر آخر کچھ دنوں میں شاہ صاحب کے قلم کی روانی اور اس کی گہرباری رک گئی تھی، شاہ صاحب رعشہ کے بیماری اور صحت کی خرابی کی وجہ سے کتابت سے قاصر ہو گئے تھے، لیکن شاہ صاحب نے تقریباً چالیس برس تک کتابت کے فن اور خوش نویسی کو جو بلندی عطا کی اور کمال فن کے جو نمونے یادگار چھوڑے، وہ عرصہ تک شاہ صاحب کی خطاطی پر غیر معمولی دسترس اور مجتہدانہ بصیرت و نظر کی یاد دلاتے رہیں گے۔

خطاطی میں شاہ نفیس صاحب کے نقوش قلم اخبارات و رسائل سے گزرتے ہوئے، عالمی شہرت کی عمارتوں کی پیشانیوں پر، یہاں کہ حرم نبوی کی نئی توسیع و تعمیر کی ایک محراب پر بھی نصب ہوئے:——— یہ نصیب اللہ اکبر لوٹنے کی جائے ہے!

لاہور کی کئی مسجدوں پر شاہ صاحب کے نقوش کتابت کندہ ہیں، جس میں مسجد صلاح الدین، مسجد علی، چوک متی روڈ، مسجد فیض الاسلام، گپت روڈ اور مسجد چودھری ہسپتال، شیش محل روڈ قابل ذکر ہیں۔

شاہ صاحب کی رعنائی قلم نے فن کے بڑے بڑے ماہرین، اور باریک بیں نقادوں سے اپنے کمال فن کا لوہا منوایا اور ایسا خراج تحسین حاصل کیا جس کی ان کے معاصرین میں بہت کم نظیریں ہیں۔

شاہ صاحب کے تراوش قلم کے جو نمونے یادگار ہیں، وہ بہ زبان خود اپنی خوشنمائی کی شہادت دے رہے ہیں اور کہہ رہے ہیں کہ: ——— ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما!

ہمارے یہاں جو لوگ ایک دو خطوط خصوصاً نسخ اور نستعلیق میں کچھ مہارت و کمال اور قلم کی روانی و آرائش حاصل کر لیتے ہیں، ان کو بھی اچھا خاصا خطاط کہا اور سمجھا جاتا ہے، لیکن شاہ صاحب کا معاملہ اس سے بہت بلند اور وسیع تھا، نسخ و نستعلیق تو گویا ان کے گھر کی لونڈی اور ان کی برّش قلم کی زیر نگیں تھیں، مگر بات صرف اتنی ہی نہیں تھی بلکہ شاہ صاحب کو اور بھی متعدد اہم خطوط پر غیر معمولی گرفت اور خاص مہارت حاصل تھی، شاہ صاحب نسخ و نستعلیق کے علاوہ خط کوفی، خط دیوانی، خط رقاع، اور ثلث وغیرہ میں بھی ایسی مہارت و رعنائی قلم رکھتے تھے کہ باید و شاید۔

عام طور پر دیکھا جاتا ہے کہ کاتب صاحبان کو جب کوئی خاص تحریر لکھنی ہو، خصوصاً کوئی اہم ٹائٹل یا توجہ طلب تحریر کتابت کرنی ہو، تو اچھے خطاط و ماہر و تجربہ کار کاتب بھی اس کی پہلے سے منصوبہ بندی کرتے ہیں، کام کا رف نقشہ بناتے ہیں، خام مواد تیار کر لیتے ہیں، پھر اصل اور مکمل کام کے لئے قلم اٹھاتے ہیں، لیکن شاہ صاحب کو ایسا اعلیٰ ذوق، ایسا ذہن اور ایسا گل ریز قلم عطا ہوا تھا کہ ان کے یہاں ان سب تکلفات وزوائد کے لئے بہت کم موقع آتا تھا، ایک مرتبہ کاغذ کو جانچا، ذہن میں ایک نقشہ بٹھالیا، اور دو تین یا چار پانچ، جس قدر بھی خطوط میں وہ سرورق لکھنا ہے، اس کی ایک ترتیب بنا کر گویا قلم برداشتہ لکھ دیتے تھے اور یہ تحریر ایسی ہوتی تھی کہ اس کا حرف حرف کفِ باغبان اور دامن گل فروش کا نمونہ نظر آتا تھا تحریر کا ذوق اور فن کتابت سے مناسبت رکھنے والے اس کو دیکھ کر بے ساختہ سبحان اللہ، الحمد للہ کہنے پر مجبور ہوتے اور یہ تحریر ایک نمونہ اور مثال بن جاتی تھی۔

شاہ صاحب کو خطاطی میں غیر معمولی کمال کے علاوہ، رنگوں کے صحیح وعمدہ انتخاب میں بھی اختصاص حاصل تھا، شاہ صاحب اس کا قدرتی ذوق رکھتے تھے اور بہ خوبی جانتے تھے کہ کن رنگوں کے ساتھ کون کون سے رنگ موزوں رہیں گے، نکھار پیدا کریں گے اور کون کون سے بدنمائی۔ اس لئے اپنی لکھی ہوئی تحریروں خصوصاً سرورق (ٹائٹلوں) کی طباعت کے لئے رنگوں کا انتخاب بھی خود ہی کرتے تھے اور جب ان رنگوں سے مزین ہو کر وہ سرورق چھپ کر آتے تھے تو دیکھنے والوں کی تمام توجہ کھینچ لیتے تھے۔

شاہ صاحب پاکستان کے کاتب وخطاطوں کی انجمن کے سیکریٹری اور نائب صدر رہے، پھر برسوں تک پاکستان بھر کی تنظیموں اور انجمنوں کے صدر رہے، بعد میں عالمی خطاطی کونسل کے نائب صدر کے لئے منتخب ہوئے، اور اپنے کمالِ فن کی وجہ سے بڑے بڑے تمغوں اور اعزازات کے مستحق گردانے گئے۔

شاہ صاحب نے بیسیوں علمی تحقیقی کاموں کی سرپرستی کی، ان کو ہر طرح سے نوازا اور تکمیل تک پہنچایا۔ علمی تعاون ودلچسپی کے علاوہ طباعت کے مراحل میں بھی شاہ صاحب کا اپنا ایک انداز تھا، شاہ صاحب نے مختلف موضوعات کی کتابوں کی ادنیٰ واعلیٰ طباعت کے لئے متعدد ادارے قائم کئے، اور ان کے ذریعہ سے بڑی بڑی اہم کمیاب وبے مثال کتابیں شائع کر کے وقف عام کیں، شاہ صاحب نے جن موضوعات اور کتابوں کو اپنی توجہ کا مرکز بنایا، ان میں خصوصاً شاہ صاحب کے جدامجد اور برصغیر ہند میں سلسلۂ چشتہ نظامیہ کے نامور بزرگ، حضرت سید بندہ نواز گیسو درازؒ کی نادر وغیر مطبوعہ بلکہ ناپید تصانیف، سلسلۂ حضرت سید احمد شہیدؒ کی کتابیں، نیز ہندوستان کے علماء مشائخ کے احوال پر اہم وکمیاب ذخیرہ شامل ہے۔

خطاطی اگرچہ شاہ صاحب کا تاحیات مشغلہ رہی، لیکن ان کی زندگی کا یہی ایک نمایاں پہلو اور امتیازی وصف نہیں ہے، شاہ صاحب کی زندگی کے اور بھی کئی امتیازات و اوراق ایسے ہیں کہ جس میں ہم سب کے لئے بڑی تعلیم اور گہرا سبق ہے۔ شاہ صاحب نہایت شگفتہ مزاج، بااخلاق اور مرنجاں مرنج شخص تھے، پرانے بزرگوں اور اہل باطن کی طرح، ان کی مجلس میں ہر مکتبۂ فکر کے اور ہر ایک علمی ذوق کے اصحاب و اہل کمال تشریف فرما نظر آتے تھے اور اپنی اپنی لیاقت وضرورت کے مطابق، شاہ صاحب سے فائدہ اٹھاتے تھے۔ تصوف وسلوک کے مباحث ہوں، یا مشائخ اولیاء اللہ کے احوال وسوانح کے متعلقات، تذکرہ وتاریخ کی گفتگو ہو، یا شعر وادب کی، ہر ایک میں شاہ صاحب کی معلومات سے فائدہ اٹھایا جاتا، وہ اپنے ذوق لطیف، تنوع ذہن، معلومات اور وسعتِ نظر سے ہر ایک کی رہنمائی کرتے، ہر ایک کی مدد فرماتے۔ اہل علم اور صاحب فکر وفن کو ان کی صحبت سے جلا ملتی اور اپنے اپنے ذوق ومزاج کے بقدر علمی آبیاری بھی ہوتی تھی اور نئی اطلاعات سے بھی دامن بھرتا رہتا تھا۔

شاہ صاحب ہندوستان کے مشہور شیخ اور مرشد، شاہ عبدالقادر رائے پوری سے بیعت ہوئے اور ان ہی سے اجازت وخلافت پائی۔ حضرت شاہ عبدالقادر کا ۱۹۴۷ء سے پہلے خصوصاً مشرق پنجاب میں بہت وسیع اور گہرا اثر تھا، اکثر علاقوں میں شاہ عبدالقادر یا ان کے شیخ ومرشد حضرت شاہ عبدالرحیم رائے پوری کے فیض یافتہ اہل باطن اور متوسلین پھیلے ہوئے تھے، جو اپنے اپنے علاقوں میں اصلاح وتزکیہ اور ارشاد ومعرفت کے چراغ جلائے علم وارشاد کی روشنی عام فرما رہے تھے۔ جب سنہ ۱۹۴۷ء میں مشرقی پنجاب مسلمانوں سے ظلماً وجبراً خالی کرایا گیا، اس وقت سے شاہ صاحب کی توجہ مغربی پاکستان کی طرف بہت ہوگئی تھی، جہاں ان کے لوگ منتقل ہوگئے تھے، اسی وجہ سے ۱۹۴۷ء کے فوراً بعد سے، شاہ عبدالقادر کے پاکستان کے سفر شروع ہوگئے تھے۔ خانقاہ رائے پور کے وابستگان کی بہت بڑی تعداد شاہ عبدالقادر صاحب سے، پرانے روابط کی تجدید وتوثیق کرنا چاہتی تھی۔

شاہ عبدالقادر صاحب کا پاکستان کا سفر ہوتا، تو ہر اک موقع پر ایام سفر کا ایک حصہ لاہور کے متوسلین کے لئے خاص ہوتا تھا اور جیسے جیسے حضرت کا قیام لاہور میں بڑھتا چلا گیا، اسی قدر حضرت کے متوسلین اور نئے پرانے مستفیضین کی تعداد روز افزوں ہوتی گئی۔

شاہ نفیس صاحب جو شروع سے نیک طینت تھے، بزرگان دین اور اولیاء اللہ سے گہری محبت وعقیدت

رکھتے تھے، انہیں بھی شاہ صاحب کی خدمت میں حاضری کا شوق ہوا اور سنہ ۱۹۵۶ء میں پہلی مرتبہ حضرت رائے پوری کی خدمت میں حاضر ہوئے، اس کے بعد یہ رشتۂ مودت ایسا پر کشش بن گیا تھا کہ شاہ نفیس صاحب نے حضرت رائے پوری کی خدمت میں بلاناغہ حاضری کا معمول بنالیا۔ پہلی ملاقات کے تقریباً ایک سال بعد، جمادی الاول ۱۳۷۷ھ/ دسمبر ۱۹۵۷ء میں، حضرت رائے پوری سے بیعت ہوگئے۔ اس زمانہ میں حضرت رائے پوری جب پاکستان خصوصاً لاہور یا پاکستان کے اور مقامات پر قیام فرما ہوتے، تو شاہ نفیس صاحب وہاں حاضری کا اہتمام کرتے اور جب حضرت رائے پوری ہندوستان میں ہوتے تو، شاہ نفیس صاحب رائے پور آنے کی کوشش کرتے تھے، اسی ملاقات وزیارت میں اصلاح باطن اور مجاہدہ اور تربیت کا عمل بھی جاری رہتا تھا، کئی سال کے بعد حضرت رائے پوری نے خلافتِ سلسلہ اور اجازتِ بیعت سے نوازا، لیکن شاہ صاحب نے بہت عرصے تک کسی کو بیعت نہیں کیا تھا، خاموشی سے اپنے روحانی معمولات اور مجاہدہ وریاضت میں لگے رہے، بالآخر ارشاد وتعلیم کا سلسلہ شروع کرنا پڑا اور اپنے شیخ کے طریقہ کے مطابق، متوسلین کو سبق دینے اور ان کی نگرانی اور تربیت کرنے لگے۔ شیخ کا رنگ جس قدر گہرا ہوتا گیا، اصلاح تربیت کے عمل میں اسی قدر دلچسپی بڑھتی گئی۔

روحانی سلسلوں میں اکثر یہ ہوتا ہے کہ مشائخ کی نسبت کا اثر اور سلسلہ کی برکات آہستہ آہستہ نمودار ہوتی ہیں اور بڑھتے بڑھتے شعلۂ جوالہ اور آتش قلب وجگر بن جاتی ہیں، جوں جوں اس کی سوزش بڑھتی ہے اور جیسے جیسے خلافت کے بعد ملکات روحانی ترقی کرتے ہیں، اسی تناسب ورفتار سے اس کی مقبولیت میں اضافہ ہوتا رہتا ہے اور اس سے فائدہ اٹھانے والوں کی تعداد روز افزوں ہوتی رہتی ہے، شاہ صاحب میں بھی اسی معمول وروایت اور کیفیت وترتیب کا ظہور ہوا، آخری دور میں تو شاہ صاحب میں اپنے شیخ ومرشد کی گویا پوری تصویر اتر آئی تھی، وہی رنگ وآہنگ، ویسے ہی محبت کی چاشنی، وہی ہمدردی اور خلوص، ویسے ہی باہمہ وبے ہمہ رہنے کا انداز، وہی خوئے دلنوازی، ویسے ہی نرم گفتاری، اور اسی طرح کے انداز وآداب، یعنی شاہ نفیس صاحب میں خانقاہ رائے پور اور مشائخ کی سبھی خوبیوں کی واضح نمائندگی ہونے لگی تھی، اور آہستہ آہستہ شاہ صاحب کی جانب عوام وخواص کے رجوع کا دائرہ بھی بہت وسیع ہوگیا تھا۔

یہ شاہ نفیس صاحب کے اخلاص ہی کا کمال تھا کہ آخر دور میں ان کی ذات پاکستان میں گویا مرجع کل

ہوگئی تھی، جیسے جیسے اس روحانی کیفیت کا فیضان عام ہورہا تھا، اسی قدر شاہ صاحب کی مقبولیت و پذیرائی روز افزوں ہوتی رہی۔

اور پھر ایک وقت وہ آیا کہ شاہ صاحب کی خانقاہ پاکستان کی مشہور خانقاہوں میں شمار کی گئی اور لوگوں نے بڑی تعداد میں وہاں پہنچ کر غذائے روح اور اصلاح باطن کا سبق لیا۔ اس خانقاہ اور دائرے اصلاح کی وسعت کا اس سے کچھ اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ شاہ صاحب کی اجازت یافتہ خلفاء کی تعداد سو سے زائد ہے، جس میں ہندو پاک اور یورپ کے علماء اور مختلف طبقات کے اہل فضل وکمال اصحاب شامل ہیں۔

آخری دور میں شاہ صاحب کی سب سے بڑی پہچان، شاہ صاحب کی نسبت باطنی، ارشاد و تلقین کے ہنگامے، ذکر و فکر کی محفلیں، اصلاح و تربیت کا درس اور جلائے باطنی اور رذائل معنوی کے ازالہ کی وہ کوشش تھی جس کے لئے حضرت شاہ عبدالرحیم رائے پوری اور حضرت شاہ عبدالقادر رائے پوری ممتاز تھے، رحمہم اللہ تعالیٰ! اسی کے لئے شاہ نفیس صاحب کو شاہ عبدالقادر رائے پوری نے خلافت و اجازت عطا فرمائی تھی۔

راقم سطور کا شاہ صاحب سے رابطہ اور شاہ صاحب کی عنایات

راقم سطور کی حضرت شاہ صاحب سے واقفیت، روابط، اور نیاز مندی کی بات پرانی ہے جہاں تک یاد آتا ہے سب سے پہلے، شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کی قیام گاہ، کچے گھر کے برآمدہ میں ایک بڑے فریم میں شاہ نفیس صاحب کی پہلی تحریر دیکھی تھی، یہی شاہ نفیس صاحب کے نام کا پہلا تعارف بھی تھا۔ یہ تحریر حضرت شاہ عبدالقادر رائے پوری کی منقبت تھی، جو حضرت کے عاشق زار آزاد صاحب فتحپوری نے کہی تھی، اس کے کچھ دنوں کے بعد، پہلی مرتبہ شاہ نفیس صاحب کو اسی کچے گھر کے بیرونی حصے میں واقع، کتب خانہ یحیوی میں بیٹھے ہوئے دیکھا تھا۔ راقم اس وقت مظاہر علوم پڑھتا تھا، چھٹی کے بعد کھانے کے لئے حضرت شیخ کے یہاں آنے کا معمول تھا، اس لئے کتب خانہ یحیوی میں تھوڑی دیر کے لئے بیٹھنے کے بعد کچے گھر جایا کرتا تھا، وہیں شاہ صاحب کو پہلی مرتبہ دیکھا لوگ تذکرہ کررہے تھے کہ یہ نفیس الحسینی صاحب خطاط ہیں۔ اس کے بعد ایک ڈیڑھ سال کے وقفہ سے دو تین مرتبہ شیخ ہی کے یہاں دیکھا اور چونکہ میرے والد ماجد حضرت مولانا افتخار الحسن صاحب دامت برکاتہم بھی حضرت شاہ عبدالقادر رائے پوری کے خلیفہ ہیں اور شاہ نفیس سے بہت پہلے کے ہیں، اس نسبت کیوجہ سے شاہ صاحب کرم فرمانے لگے تھے اور کبھی کبھی خیر و عافیت پوچھ لیتے تھے۔ اس کے کئی

سال بعد، میری یادداشت میں شاہ صاحب پہلی مرتبہ کاندھلہ تشریف لائے، چونکہ راستہ سے گذرتے ہوئے اچانک بلا اطلاع آنا ہوا تھا، اس لئے میرے والد صاحب کو گھر پر موجود نہیں تھے، سفر پر تھے، تاہم راقم حاضر تھا، اس لئے شاہ صاحب سے اس وقت پہلی مرتبہ تفصیل نیاز حاصل ہوا۔ شاہ صاحب نے تین چار گھنٹہ قیام فرمایا اور بہت خوش ہوئے، اس کے بعد تو یہ معمول ہو گیا تھا کہ شاہ نفیس صاحب کا جب کبھی رائے پور یا سہارنپور کا سفر ہوتا اور اس راستہ سے گزرتے تو کاندھلہ ضرور آتے تھے۔ لیکن بس یہی ملاقات تھی، اس بیچ میں کوئی خط وکتابت ہوئی، نہ کوئی اور رابطہ۔

ان روابط میں استحکام اس وقت آیا جب راقم سطور نے دارالعلوم دیوبند کے اجلاس صد سالہ کے موقع پر دارالعلوم دیوبند کے ایک چھوٹے سے کمرے میں، اپنے یہاں موجود چند قلمی کتابوں اور ہندوستان کے مشاہیر علماء واکابر کی چند نو دریافت، نادر تحریرات کی ایک مختصر سی نمائش لگائی تھی، منجملہ اور بہت سے حضرات کے شاہ صاحب بھی اس کو دیکھنے کے لئے تشریف لائے اور دیکھ کر بس بیقرار ہو گئے، بہت ہی خوش ہوئے اور ہمارے رجسٹر میں اپنی مفصل رائے لکھی، اس وقت کی ملاقات اور تشریف آوری آئندہ کے روابط کا سنگ میل ثابت ہوئی۔ اس کے بعد کبھی کبھی گرامی ناموں سے یاد فرمانے لگے اور پھر جب راقم کا مارچ ۱۹۸۵ء میں لاہور کا سفر ہوا، اس وقت بہت ہی کرم فرمایا، اپنے دولت خانہ پر لاہور کے چند مشاہیر اہل علم کو راقم کی عزت افزائی کے لئے بطور خاص مدعو کیا، جس میں پروفیسر محمد اسلم اور مولانا سعید الرحمٰن علوی صاحبان سے پہلی ملاقات ہوئی اور یہی ملاقات ان حضرات سے تمام عمر کی روابط کی بنیاد بنی۔ پاکستان کی سفر کے بعد شاہ صاحب سے ہمیشہ اور کہنا چاہئے کہ بلا کسی وقفہ اور انقطاع کے خط وکتابت، روابط، معلومات وتحقیقات کی بات، نوادرات وکتب کی آمد ورفت، علمی موضوعات ومباحث کا تذکرہ اور نئی تلاش ودریافت کی باتیں جاری رہتی تھیں۔

راقم سطور کو پاکستان سے کسی خاص کتاب کی ضرورت ہوتی، خصوصاً کسی مخطوطے یا کمیاب مطبوعہ کتاب کی، تو شاہ صاحب سے درخواست کرتا، شاہ صاحب اس پر فوراً توجہ فرماتے، مطبوعہ ہوتی تو اصل نسخہ فراہم کرتے اور قلمی کا عکس روانہ فرما دیتے تھے۔ ادھر راقم سطور سے بھی کتابوں کے لئے اکثر فرمائش ہوتی رہتی تھیں کسی کی اصل کی، کسی کے عکس کی اور کسی کے اقتباس ومقابلہ کی، راقم ان سب فرمائشوں کی تعمیل کرنے کی

حتی الامکان مسرت حاصل کرتا۔ شاہ صاحب کے ذریعہ سے پاکستان کے بعض معروف اداروں اور متعدد اہل علم نے، متعدد نادر مطبوعات اور کئی مرتبہ مخطوطات کے عکس طلب کیے، ان فرمائشوں کی بھی تعمیل کی گئی۔ اس طرح شاہ صاحب سے ایک مستقل رابطہ رہتا تھا، شاہ صاحب کو پاکستان سے کوئی آنے والا مل جائے تو اس کے ذریعہ سے کوئی کتاب اور گرامی نامہ ضرور بھیجتے، آخر میں جب فون کی زیادہ سہولت ہوگئی تھی تو فون پر بھی گفتگو رہتی تھی، حضرت شاہ صاحب کے خادم خاص اور خلیفہ، بھائی رضوان صاحب کے الفاظ میں: ''جب تمہارا فون آتا ہے، تو شاہ صاحب خوش ہوجاتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ دیر تک باتیں کرتے رہیں۔ بہرحال عنایات وکرم کا سلسلہ آخر تک جاری رہا۔

شاہ صاحب نے راقم سطور کی کتاب قاسم العلوم (۱۴۲۰ھ/۲۰۰۰ء) شائع کی اور دارالعلوم دیوبند پر، پشاور میں منعقد عظیم الشان اجلاس میں اس کی رسم اجراء ادا کی گئی۔ شاہ صاحب کی آخری فرمائش جس کی بفضلہ تعالیٰ تعمیل بھی ہوگئی تھی، مرزا آفتاب بیگ کی صوفیائے کرام کے حالات پر مشہور کتاب ''مسالک السالکین'' کے دوسرے دفتر کے (جو ہمارے ذخیرہ میں موجود ہے) فوٹو اسٹیٹ کی فراہمی تھی، شاہ صاحب نے جو آخری کتاب ارسال فرمائی وہ وقائع سید احمد شہید یا وقائع احمدی کی اشاعت کا ایک نسخہ تھا۔ وقائع احمدی شاہ صاحب نے بہت اہتمام سے چھپوائی تھی، جو اس اہم کتاب کی پہلی اشاعت ہے۔

شاہ صاحب کی مرتبہ اور شائع کی ہوئی چند کتابیں

ایک وقت تھا کہ ہماری خانقاہیں حرکت وعمل کا مرکز، قومی ملی مقاصد کی حامل وآئینہ دار اور فکر ودانش کی تربیت گاہ ہوا کرتی تھیں، ان میں جمود وتعطل تھا، نہ انسانیت بیزاری کے مظاہر تھے، نہ مقاصد حیات سے بے تعلقی کی شکایت۔ اس وقت خانقاہوں سے اگر ایک جانب ایمان ویقین کی مایہ تقسیم ہوتی تھی، اتباع شریعت وسنت کا سبق ملتا تھا، محبت ورواداری کی تعلیم ہوتی تھی، تو دوسری جانب یہی خانقاہیں، ارشاد واصلاح کے قدم بہ قدم علوم اسلامیہ کے درس سے گونجا کرتی تھیں۔ قال اللّٰہ وقال الرسول صلی اللہ علیہ وسلم کا دلنواز نغمہ ہر اک حاضر خانقاہ کا گوش گیر ہوتا، جس سے ان کے قلبی اعتماد کی بنیادیں استوار ہوتیں اور زندگی کو ان تعلیمات اور لعل وگہر سے مزین وآراستہ کرنے کی طاقتور تحریک ملتی تھی اور اسی کے ساتھ یہاں ممتاز اہل علم، اصحاب قلم، ارباب فکر وشعور پیہم دامن فشاں رہتے تھے، جن کے سوز دروں سے دل کی دنیا میں خاص تاثیر اور حرارت وتپش کے علاوہ، علم کو اسوۂ راہ اور مشغلہ حیات

بنا لینے کی ایک ایسی وراثت نصیب ہوتی تھی، جس کے ذریعہ سے علم کے ایوانوں میں نئی قندیلیں روشن ہوجاتیں اور علم وتصنیف کے آسمان پر تازہ فکر اور تازہ و متنوع و گوناگوں فوائد سے لبریز بے شمار ئی کتابیں نئے افادات و مباحث سامنے آتے، جو پڑھنے والوں کے ہمیشہ کے لئے رفیق راہ ہوجاتے تھے، مگر اب نہ وہ خانقاہیں ہیں نہ ویسے طاقتور مؤثر افراد کہ جن کی انگلیاں زمانہ کی نبض پر ہوتی تھیں، جو دین کے تمام مقاصد وتعلیمات کے ترجمان، اپنے عہد بلکہ مستقبل کی بھی ضروریات وتقاضوں سے آشنا، ان کے بہترین رہنما اور دور س فوائد و منافع کا منبع و سر چشمہ ثابت ہوتے تھے۔

ہر چند کہ اس دور میں نہ وہ خانقاہیں ہیں، نہ ویسے جامع وفنون، جامع کمالات، مشائخ وافراد موجود ہیں نہ ویسے نبّاض عہد مربی اور مرشدین، تاہم ملت اور اصلاح وہدایت کا کارواں جاری ہے، مگر جیسے جیسے خیر القرون سے وقت کا فاصلہ بڑھتا جارہا ہے، ویسے ویسے پوری امت کے قویٰ اور امت کے مردان کار میں بھی کمزوری اور ناتوانی بڑھتی جارہی ہے، اسی لئے اب نہ ویسے قوی التاثیر صاحب باطن اہل معرفت موجود ہیں، نہ فکر عمل میں وہ تاب وتوانائی ہے۔ قافلۂ علم وفلاح گزر چکا ہے مگر اس کے مٹے مٹے سے نشانات اور گرد کارواں بہر حال موجود ہے۔ اسی میں کئی مرتبہ ایسا اجالا سا چمکتا ہے کہ پچھلے بزرگوں اور ان کے کاموں کی جھلک، ان کی خدمات کے پہلوؤں اور بیک متضاد گوشوں اور مصروفیات کو نبھانے کی ایک تصویر سی سامنے اتر آتی ہے۔ انہی کو دیکھ کر اندازہ بلکہ تصدیق ہوتی ہے کہ پچھلے علماء اور مشائخ کی زندگی کے اوراق کیسے صد رنگ اور صد جہت تھے اور کیوں کر ان میں سے، ہر اک جاذبیت کا ایک پیکر بن جاتا تھا اور کس طرح اس پر معنویت کی ایک افشاں سی چھڑکی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔

موجودہ دور کے مشائخ اور مرشدین میں سے شاہ نفیس الحسینی صاحب بھی، اسی جماعت کے ان مبارک اصحاب میں سے تھے، جنہوں نے بزرگوں کے طریقہ ارشاد وتربیت کے ساتھ، اخلاق وانسانیت، خلوص وانکساری، ہر طبقۂ کمال کے افراد کو نباہنے اور مخلوق سے عمدہ رشتہ رکھنے کی خاص کوشش کی۔ ارشاد وتلقین کی مصروفیات اور کتابت وتحریر کے آداب ومطالبات کی ادائیگی کے ساتھ ساتھ، مطالعہ تصنیف کے گلستاں کو بھی شاداب وآباد رکھا۔ خانقاہ بھی ہے، حلقۂ کتابت بھی ہے، مجلس درویشاں بھی اور محفل احباب بھی کتابت کے لئے قلم بھی رواں دواں ہے، مخطوطات ومطبوعات کی تلاش ودریافت کی جدوجہد بھی ہورہی

ہے، تصنیف کے لئے لوازمہ بھی تیار ہورہا ہے اور ان کتابوں کی عمدہ اشاعت کی فکر بھی ہورہی ہے۔ شعر وشاعری کی مجلس بھی برپا ہے اور تحقیق واہل علم کی رفاقت کا بھی حق ادا کیا جارہا ہے، غرض ایسی متضاد مشغولیات، ایسی گوناں گوں مصروفیات اور اس طرح ہر طبقہ کے افراد کے ساتھ روابط کو ایک خاص انداز میں برقرار رکھنا اور مشغولیات کے تمام گوشوں میں تنوع و ہفت رنگی کے ساتھ ساتھ ان میں توازن واعتدال برقرار رکھنا، آسان کام نہیں ہے۔ ہر ہوس تاناکے نہ داند جام وسندان باختن

شاہ صاحب نے بیسوں نہایت عمدہ اور قابل قدر کتابیں شائع کیں، جس میں موضوعات کا تنوع بھی ہے اور اپنے ذوق کے خاص عنوانات ومضامین کا اہتمام بھی۔ یہاں ایسی چند کتابوں کا تذکرہ مناسب ہوگا جو شاہ صاحب کی دلچسپی اور توجہ سے چھپیں اور شاہ صاحب کے علمی ذوق کی نمائندگی وترجمانی کرتی ہیں، اس میں اولیت حضرت سید گیسودرازؒ کی بعض تصانیف کو حاصل ہے، اس لئے پہلے انہی کا ذکر کیا جانا چاہئے:

شاہ صاحب کو ہندوستان میں سلسلہ چشتیہ نظامیہ کے بڑے اور نامور بزرگ، حضرت سید بندہ نواز گیسودراز (محمد بن یوسف۔ وفات سنہ ۸۲۵ھ) دفین گل برگہ، سے غیر معمولی محبت وانسیت تھی، شاہ صاحب پوری زندگی حضرت سید گیسودراز کی کتابوں اور ان کے احوال اور اثرات کا مطالعہ فرماتے رہے نیز حضرت سید گیسودراز کی نادر تصانیف تلاش کرکے ان کی اشاعت کا سروسامان کیا، ان میں سب سے اہم یادگار سید گیسودراز کی، قرآن کریم کی تفسیر الملتقط ہے۔

(۱) **التفسیر الملتقط** حضرت سید گیسودراز نے قرآن کریم کی دو تفسیریں رقم کی تھیں، ایک مفصل دوسری مختصر، مختصر تفسیر جو سراسر تصوف کے رنگ میں ڈوب کر لکھی ہے، اس کا نام الملتقط ہے، جو عربی میں ہے۔ اس کا واحد معلوم نسخہ انڈیا آفس لائبریری لندن میں تھا، شاہ نفیس صاحب لندن گئے تو اس کا عکس لائے اور اس کو بہت اعلی معیار، نفیس ترین کاغذ اور طباعت وآراستگی کے تمام لوازم سے مزین کرکے دو جلدوں میں شائع کیا جو پونے انیس سو صفحات پر مشتمل ہے۔ یہ طباعت اصل نسخہ کا عکس ہے، اس لئے کئی موقعوں سے ناتمام بریدہ اور موش خوردہ سا ہے، تاہم جو بھی ہے تبرک ہے۔ اس پر سنہ طباعت درج نہیں، غالباً سنہ ۱۴۲۵ھ کی اشاعت ہے، جو اوائل ۱۴۲۶ھ میں راقم کو ڈاک کے ذریعہ روانہ فرمائی تھی۔ **فجزاه الله تعالی**

(۲-۳) محمد ابن اسحاق کی کتاب سیرت، سیرت مبارکہ کی اولین اور ان بنیادی کتابوں میں سے ہے

جن کو سیرت شریفہ کی اصل اصول اور امہات کتب میں شمار کیا جاتا ہے، لیکن اس کتاب کا مکمل نسخہ صدیوں سے مفقود ہے، اگر چہ ابن ہشام کی کتاب سیرت نے جو ابن اسحاق کی تہذیب و ترتیب ہے، محمد ابن اسحاق کی کتاب کی ہمیشہ پورے طور پر نمائندگی کی مگر اصل کی ضرورت اور تلاش ہمیشہ جاری رہی۔ جوئندہ یابندہ کے مصداق، دنیائے اسلام کی ناپید و مفقود کتابوں کے ایک بڑے غواص اور فراہم کنندہ، علامہ ڈاکٹر محمد حمید اللہ حیدر آبادی نے اور متعدد کتابوں کی طرح سیرت ابن اسحاق کے بھی متفرق اجزاء چند کتب خانوں میں تلاش کر لئے اور اس کو اپنے مذاق و معمول کے مطابق، علم و تحقیق کے جملہ لوازم و متعلقات سے آراستہ کر کے شائع کرایا۔ یہ نسخہ فاس مراکش سے سنہ ۱۳۹۶ھ/۱۹۷۶ء میں پہلی مرتبہ شائع ہوا تھا، مگر مراکش سے شائع ہونے کی وجہ سے برصغیر ہند کے قارئین اور علماء کے لئے عنقاء سے کم نہیں تھا، شاہ نفیس الحسینی صاحب کو اس کی طباعت کا خیال آیا، شاہ صاحب نے نسخۂ فاس کا بہت عمدہ اور خوبصورت عکس اپنے ادارہ دار النفائس لاہور سے سنہ ۱۴۲۲ھ/ ۲۰۰۵ء میں شائع کر دیا۔ یہ اشاعت ہندو پاکستان میں سیرت پاک کے شائقین کے لئے ایک تحفہ و سوغات ثابت ہوئی۔

اس کی اشاعت کے بعد شاہ صاحب کے بعض نیاز مندوں نے شاہ صاحب کو لکھا کہ یہ اشاعت بہت خوب اور مبارک ہے، لیکن ڈاکٹر حمید اللہ کی تحقیق سے شائع نسخہ کی طباعت کے بعد اس کا ایک اور مزید جامع بہتر اور محقق نسخہ شائع ہوا ہے، جو "احمد فرید المزیدی" کا مرتبہ ہے۔ شاہ نفیس صاحب نے اس نسخہ کو بھی فراہم کر کے، اپنے اسی ادارہ دار النفائس سے ۱۴۲۶ھ/ ۲۰۰۵ء میں شائع کر کے اس کو مکمل فرما دیا۔

شاہ صاحب کو اہل بیت کرامؓ کے احوال و متعلقات سے گہری عقیدت و وابستگی تھی، شاہ صاحب نے اہل بیت کرام کے احوال و مرویات پر، عربی اردو کی متعدد کم یاب کتابوں کی تازہ اشاعت کرا کر، ان کو اہل ذوق تک پہنچایا۔ ان کتابوں میں جن مؤلفات و کتب کا مجھے علم ہے، وہ یہ ہیں:

(۴) صحیفہ علی بن ابی طالبؓ عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ...... یہ مجموعہ ڈاکٹر رفعت فوزی عبد المطلب نے قاہرہ میں سنہ ۱۴۰۶ھ میں مرتب کیا تھا، مطبوعہ نسخہ شاہ نفیس صاحب کے علم میں آیا تو شاہ صاحب نے اس کو مکتبہ العربیہ لاہور کے تعاون سے شائع کر دیا۔

(۵) الامام الحسین فی محراب الکتاب والسنہ　　عبد الواحد خیاری

(٦) ترجمہ اردو مسند زید بن علی — اردو ترجمہ مولانا اشرف (گوجراں والا)

(٧) سیدنا علی وحسین — تالیف

(٨) الافادہ فی تاریخ الائمۃ السادۃ — یحییٰ بن حسین بن ہارون الہاردن

(٩) اللطائف المحمدیہ فی مناقب الفاطمیہ — مولانا احمد حسن سنبھلی

شاہ صاحب نے حضرت امام ابوحنیفہ کے احوال پر بھی ایک کتاب شائع کی تھی۔شاہ صاحب کو حضرت سید بندہ نواز گیسودراز کے احوال تصانیف ومؤلفات اوران کے اخلاف کے تذکروں سے ہمیشہ بڑی مناسبت وانسیت رہی۔خواجہ سید گیسودراز پر ایک کتاب (١٠) نفائس القلوب کے نام سے مرتب کی، جس میں سید گیسودراز کے تین رسالوں کے اقتباسات شامل کئے گئے ہیں، ایک اور اشاعت (١١) شمائم گیسودراز کے نام سے ہے، نیز (١٢) شمائم گل برگہ اور خواجہ صاحب کے احوال پر (١٣) تاریخ حبیبی وتذکرۂ مرشدی بھی اسی سلسلہ کی کڑیاں ہیں۔

(١٤) شاہ صاحب نے اپنے خاندان کے اجداد کا، سید گیسودراز اوران کے اسلاف کرام تک مختصر تذکرہ (جو متفرق تحریرات ومضامین کا مجموعہ خلاصہ، یا ترجمہ ہے) شجرۃ الاشراف کے نام سے شائع کیا، جو تقریباً پانچ سو صفحات پر مشتمل ہے۔

حضرت سید احمد شہید، حاجی امداداللہ تھانوی مہاجر مکی اوراکابر سلسلہ دیوبند وسہارنپور کے احوال وکمالات اور آثار وتحریرات بھی، شاہ نفیس کی توجہ کا محور تھے، ان موضوعات وشخصیات پر بھی شاہ صاحب نے کئی کتابیں مرتب کیں، نیز اپنی تالیفات کے علاوہ بھی اس موضوع کی چند کتابیں اہتمام سے شائع کرائیں۔

حضرت سید احمد شہید اوران کے کاروان علم وعمل پر شاہ صاحب کا سب سے بڑا کارنامہ وقائع احمدی کی اشاعت ہے۔

(١٥) وقائع احمدی، سید صاحب کے حالات پر اہم ترین مآخذ میں شامل ہے مگر اس کے کل تین چار نسخے ہی معلوم ہیں، اوران میں سے کوئی نسخہ بھی مکمل نہیں ہے، شاہ صاحب نے ندوۃ العلماء لکھنؤ کے کتب خانہ میں موجود نسخہ کو، کسی اور نسخہ سے ایک حد تک مکمل کرکے، اس کا عمدہ عکس ڈھائی ہزار صفحات میں شائع کردیا۔اس نسخہ کی بعض فروگذاشتوں اور سقطات کے باوجود، یہ ایک بہت اہم خدمت ہے، اس کے ذریعہ سے تحریک سید احمد شہید

کی چند نامعلوم کڑیاں اور نئے پہلو سامنے آتے ہیں، لیکن اگر اس کو اور تمام قلمی نسخوں سے مقابلہ کے بعد، بعض توضیحات وحواشی نیز مکمل فہرستوں اور اشاریہ کے ساتھ شائع کیا جاتا تو اس کی افادیت اور مطالعہ کا دائرہ کئی گنا وسیع ہو جاتا۔

شاہ صاحب نے سیرت احمد شہید مولانا ابوالحسن علی ندوی کی بھی عمدہ کتابت کی، نیز اس کو اور سیرت احمد شہید کی تیسری جلد یا ضمیمہ "کاروان ایمان وعزیمت" کو خاصے اہتمام سے شائع کیا، جو اس حصہ کی پہلی اشاعت تھی، کاروان ایمان وعزیمت اس کے برسوں بعد ہندوستان میں چھپا۔

(۱۶) اسی سلسلہ کی ایک اشاعت یا تالیف، "سید احمد شہید سے حضرت امداد اللہ کے روحانی رشتے" کے نام سے شائع ہوئی (۱۷) "احوال وآثار حضرت حاجی امداد اللہ" کے عنوان سے حاجی صاحب کا مختصر سا تذکرہ یا تعارف شائع کیا (۱۷) حکایت مہر وفا (حضرت گنگوہی پر مختصر افادات کا مجموعہ ہے)، (۱۸) "حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اپنے معاصرین کی نظر میں" (۱۹) اس سلسلہ کی ایک نسبتاً مفصل تالیف "شعر الفراق" ہے، جس میں مرتب نے حضرت مولانا گنگوہی، مولانا شاہ عبدالرحیم رائے پوری اور مولانا شاہ عبدالقادر رائے پوری کے مختصر حالات اور خصوصاً ان کی وفیات پر شعراء کے تاثرات اور مرثیے جمع کئے ہیں۔ یہ اس سلسلہ کے بزرگوں پر اس قسم کی غالباً پہلی تالیف ہے۔

تالیف وتذکرہ کے موضوع پر شاہ صاحب کی چند تالیفات اور بھی ہیں، قطب سوات، ریحان عترت وغیرہ وغیرہ۔

تذکرہ آچکا ہے کہ خطاطی اور اس کی تاریخ شاہ صاحب کا خاص موضوع تھا، اس موضوع پر (۲۰) مقالات خطاطی اور (۲۱) نستعلیق نامہ شاہ صاحب کی یادگار ہیں۔ شاہ صاحب کی ایک قیمتی یادگار (۲۲) نفائس اقبال کو بھی اسی کی ایک کڑی سمجھنا چاہئے، شاہ صاحب نے اسمائے حسنیٰ کی جو خطاطی کی ہے اور ایوان اقبال لاہور میں جو اشعار وکلمات کندہ کئے ہیں، نفائس اقبال میں ان سب کو جمع کر لیا گیا ہے۔

اس کے علاوہ بھی شاہ صاحب کی متعدد مؤلفات اور تحریری باقیات یادگار ہیں، ان میں سے الاسماء الحسنیٰ اور اربعین صلوٰۃ وسلام کا بطور خاص ذکر کیا جانا چاہئے، اس کے علاوہ ہزارہا سرورق لکھے، دیوان غالب، کلیات میر تقی میر اور بلھے شاہ کے کلام کے مجموعوں کی کتابت کی۔

بزرگوں کے احوال وخدمات کو تازہ کر کے جو متعدد خدمات شاہ صاحب نے سرانجام دیں، ان کی وجہ

سے یہ آثار ضائع اور گم نام ہو جانے سے محفوظ رہے۔ ان خدمات میں سے ایک بڑی خدمت بلکہ کارنامہ، قادیانیوں کے سلسلہ میں (۲۳) ''بھاول پور کے مشہور تاریخی مقدمہ کی روداد'' کی کتابی صورت میں اشاعت ہے۔ یہ عالمی شہرت کا مقدمہ، جس میں علامہ انور شاہ کشمیری جیسے جلیل القدر علماء اور محدثین وکیل اور گواہ کی حیثیت سے حاضر ہوئے تھے، اپنے علمی مباحث کی وجہ سے ہمیشہ علماء کی جستجو کا مرکز بنا رہا، مگر یہ نعمت شاہ نفیس صاحب کے حصہ میں تھی کہ وہ اس کی بازیافت میں کامیاب ہوں۔ شاہ صاحب نے بڑی جدوجہد اور کئی سال کی جستجو کے بعد اس کی اصل فائل دریافت کی، جس کا پڑھنا بھی آسان نہیں تھا، پھر بڑی محنت سے بمشکل تمام اس کی نقل اور کتابت کرائی اور اس کو تین بڑی ضخیم جلدوں میں شائع کرا کر، ہمیشہ کے لئے محفوظ کر دیا۔

شاہ صاحب خوش کلام شاعر بھی تھے، شاہ صاحب کے کلام کے دو، نہایت عمدہ خوبصورت مجموعے چھپے ہیں۔ نفائس النبی صلی اللہ علیہ وسلم جس میں نعتیں اور منقبتیں ہیں اور برگ گل جو شاہ صاحب کے عام کلام کا مجموعہ ہے اور رفعت کلام کے علاوہ زیبائش و آرائش اور حسن طباعت کی بھی ایک قابل ذکر مثال ہے۔

شاہ نفیس الحسینی نے مولانا شاہ عبدالقادر رائے پوری کے احوال و متعلقات کی حفاظت و طباعت کے لئے متواتر جدوجہد کی، جس میں متعدد کتابوں کی ترتیب و تالیف میں معاونت، ان کی اشاعت کے لئے پر جوش مالی تعاون اور خود بھی مزید کئی مجموعوں کی تالیف و طباعت کا اہتمام شامل ہے۔ ان کتابوں میں سے دو کا تذکرہ ضروری معلوم ہوتا ہے۔

(۲۴) مجالس حضرت رائے پوری۔ حضرت مولانا رائے پوری کی خدمت کے حاضر باش، ایک خاص خادم، مولانا حبیب الرحمٰن (نومسلم) نے حضرت کے ملفوظات ایک عرصہ تک قلم بند کئے، یہ ایک بڑا مجموعہ تھا، جس کی نظر ثانی اور طباعت کے لئے محنت توجہ اور خاصی رقم کی ضرورت تھی، شاہ نفیس صاحب نے اس خدمت کو اپنا فریضہ سمجھ کر اپنے ذمہ لیا اور ان ملفوظات کو مرتب کر کے ۱۴۱۶ھ/۱۹۹۶ء میں شائع کر دیا۔ یہ مجموعہ ساڑھے سات سو صفحات پر مشتمل ہے۔

(۲۵) مکاتیب شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا، بنام مولانا شاہ عبدالقادر رائے پوری۔ شیخ الحدیث صاحب حضرت مولانا رائے پوری سے جو گہرا ارتباط تھا، وہ دونوں کے جاننے والوں کو معلوم ہے۔ شیخ، مولانا رائے پوری کو کثرت سے خطوط لکھتے تھے، جو مولانا کے برادر زادہ، مولانا عبدالجلیل صاحب کے نام ہوتے تھے، شاہ نفیس صاحب نے ان مکتوبات کو بھی بڑی جدوجہد سے حاصل کیا اور کئی مرحلوں مخالفتوں سے گزر کر، اس کی طباعت

کا انصرام کیا، اس کی طباعت ۱۹۹۸ء میں عمل آئی، یہ مجموعہ جو پونے آٹھ سو صفحات پر مشتمل ہے۔

علمی کتابوں میں شاہ صاحب صدق ودیانت کا خیال واہتمام فرماتے تھے، جن باتوں کی علمی ذرائع سے تصدیق نہ ہوتی ہو یا جس اطلاع کی کوئی واقف احوال تردید کر دیتا، اس میں ترمیم اور نظر ثانی کر لیتے تھے۔ دو واقعے جن کا راقم سطور سے تعلق ہے، یاد آ رہے ہیں۔

حضرت شاہ صاحب نے مولانا احمد حسن سنبھلی [جو ہندوستان کے ایک معروف سیاسی رہنما، مولانا اسحاق سنبھلی صاحب کے والد تھے] کی مناقب سادات پر تالیف، المناقب الفاطمیہ کا عکس شائع کیا، جس کی جلد پر مصنف کے نام کیساتھ یہ الفاظ بھی چھپے ہوئے تھے:

''خلیفہ حضرت حکیم الامت، مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ''

راقم نے دیکھا پڑھا تو شاہ صاحب کو لکھا کہ مولانا احمد حسن کو حضرت تھانوی کا خلیفہ لکھنا صحیح نہیں، اگرچہ حضرت نے ان کو خلافت دی تھی مگر مولانا احمد حسن بعد میں حضرت مولانا کے سخت مخالف اور جانی دشمن ہو گئے تھے، اس سلسلہ میں مولانا سنبھلی نے حضرت تھانوی کو جو نازیبا خطوط کثرت سے لکھے، یہ خط حضرت نے ''موذی مرید'' کے نام سے شائع کر دئے تھے، نیز حضرت نے ان کی خلافت واپس لینے اور ان سے ہر طرح کے روابط ختم کر لینے کا اعلان بھی کر دیا تھا، لہٰذا ان کو حضرت کا خلیفہ سمجھنا اور لکھنا صحیح نہیں۔ شاہ صاحب کو میرا خط ملا تو شاہ صاحب نے المناقب الفاطمیہ کی جلد پر سے خلیفہ حضرت ـــــ الفاظ سیاہی کے ذریعہ ختم کرادئے اور مجھے اس محو شدہ تحریر کے ساتھ بھی ایک نسخہ بھیجا۔

اسی طرح شاہ صاحب نے معلوم نہیں کس کے مشورہ پر، یحییٰ بن حسن بن ہارون کی عربی تالیف ''الافادہ فی تاریخ الائمۃ السادہ'' چھپوائی اور معمول کے مطابق راقم کو بھی ایک نسخہ ارسال کیا، راقم نے لکھا کہ اچھا ہوتا کہ یہ تالیف آنجناب کی نسبت اور ادارہ سے نہ چھپتی، اس کا مصنف اسماعیلی شیعوں کا قائد اور ان کے بقول امام تھا، جس کے متعدد مندرجات مصنف کی کٹر شیعی ذہنیت کو واضح کر رہے ہیں، اس لئے اس اشاعت مناسب نہیں تھی۔ شاہ صاحب نے اس کے جواب میں تو کچھ تحریر نہیں کیا مگر میں نے سنا ہے کہ شاہ صاحب کی ہدایت پر اس کی فروخت اور تقسیم بند ہوگئی تھی۔ اس طرح کے اور بھی بعض واقعات ہیں جس سے شاہ صاحب کی حق جوئی اور منصفانہ مزاج کا اندازہ ہوتا ہے۔

مرض الوفات شاہ صاحب کی صحت عموماً ٹھیک رہتی تھی، کوئی ایسا مرض جس کو خطرناک یا زندگی کے لئے خطرہ سمجھا جائے لاحق نہیں تھا، لیکن: اِنَّ اجلَ اللّٰہِ اِذَاجَاءَ لایُؤَخَّرُ بعض مرتبہ سفر آخرت کا آغاز کچھ ایسے امراض سے ہوتا ہے جن کی طرف کسی کا دھیان بھی نہیں جاتا کہ یہ مرض دنیا کو خیر آباد کہنے کا آغاز ہے، اس کا انجام مریض کی رخصت پر ہوگا۔ شاہ نفیس صاحب کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا، کہ وہ سنہ ۲۰۰۷ء میں آذربائی جان گئے تھے، وہاں کان میں کچھ تکلیف ہوئی، جو پاکستان واپسی کے بعد خاصی بڑھ گئی تھی، علاج ہوا تو افاقہ کی صورت نظر آئی لیکن کچھ دنوں کے بعد مرض نے پھر غلبہ کیا، پھر یہی صورت ہوئی۔

آخر میں مرض اس قدر بڑھ گیا تھا کہ کان سے بڑھ کر دماغ کو متاثر کر رہا تھا، اگر چہ ہمیشہ اور خصوصاً اخیر میں علاج کا بہت زیادہ اہتمام ہوا، نہایت قیمتی دوائیں استعمال میں آئیں، لیکن مقدر یہی تھا کہ یہی مرض شاہ صاحب کے لئے مرض وفات ہو اور وہ اسی میں مبتلا دنیا سے رخصت ہوں۔ چنانچہ یہ مرض جان لیوا ثابت ہوا، اور ہزار کوششوں اور لاکھوں کی قیمتی دواؤں کے باوجود افاقہ نہ ہوا، اور شاہ صاحب کی روح اسی میں پرواز ہوگئی۔ اِنَّالِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیۡہِ رَاجِعُوۡن۔

وفات کی خبر تھوڑی دیر میں ساری دنیا خصوصاً پاکستان کے کونہ کونہ میں پہنچ گئی، شاہ صاحب کے متوسلین اور اہل تعلق بہت بڑی تعداد میں لاہور پہنچنا شروع ہو گئے اور اتنا بڑا مجمع ہو گیا کہ جو جگہ نماز جنازہ کے لئے تجویز کی گئی تھی وہ ناکافی سمجھی گئی، اس لئے نماز جنازہ کے لئے دوسری وسیع اور بڑی جگہ کا اعلان ہوا، مگر آنے والوں کے بڑھتے سیلاب کی وجہ سے اس کو بھی نظر انداز کیا گیا، بالآخر تیسری جگہ عتیق اسٹیڈیم میں نماز جنازہ ہوئی، شرکاء کا سوا ڈیڑھ لاکھ کا اندازہ کیا گیا ہے، نماز کے بعد جنازہ شاہ صاحب کی خانقاہ میں لایا گیا اور وہیں دفن کیا گیا۔

کتب موصولہ

تحفہ علمیہ مرسلہ مولانا عبدالقیوم حقانی صاحب

احوال و آثار کے اجرا کے وقت، بلکہ اس سے بھی برسوں پہلے سے، تبصرہ، مطالعہ اور ہماری لائبریری کے لئے تحفہ کے طور پر بفضلہٖ تعالیٰ کتابیں موصول ہوتی رہتی ہیں۔ ادارہ اور راقم سطور ان تمام اہل علم، اہل قلم مصنفین و ناشرین صاحبان کا ممنون ہے، جو ازراہ کرم سوغات علمیہ سے نوازتے رہے ہیں۔

ان کتابوں میں خاصی کتابیں وہ ہوتی ہیں جو تبصرہ بلکہ مفصل تبصرہ کے خیال سے بھیجی جاتی ہیں، مگر افسوس کہ مفصل تبصرہ تو کہاں، مختصر بھی مشکل ہو جاتا ہے۔ اس لئے میں ان تمام مصنفین مترجمین اور ناشرین سے معذرت خواہ ہوں، جن کی نگارشات و مطبوعات تبصرہ و تعارف کے لئے موصول ہوئیں، لیکن ان صفحات میں ان کا تذکرہ نہیں آسکا اور اب بھی اس کا موقع نہیں، کہ پچھلے ڈیڑھ دو سال میں موصول تمام کتابوں کا مختصر تذکرہ بھی کیا جاسکے، کیوں کہ اس کے لئے ایک شمارہ کے تمام صفحات بھی کافی نہیں ہوں گے، اس لئے معذرت کے علاوہ کوئی صورت ہی نہیں۔ تاہم احوال و آثار کی حالیہ اشاعتوں کے بعد بھی متعدد علمائے کرام اور ارباب فضل و دانش نے گراں قدر مصنفات و مطبوعات سے نوازا ہے۔ ان میں سے چند عطیات و کتب کا دلی شکریہ کے ساتھ مختصر تعارف پیش کیا جارہا ہے۔

عالمانہ مؤقر کتابوں کی ایک قسط، پاکستان کے معروف عالم دین اور مصنف و مؤلف، مولانا عبدالقیوم حقانی صاحب (مدیر ماہنامہ القاسم۔ جامعہ ابوہریرہؓ خالق آباد۔ نوشہرہ) کی جانب سے موصول ہوئی، جس میں درج ذیل کتابیں ہیں:

(۱) **توضیح السنن (شرح آثار السنن علامہ شوق نیمویؒ)** علامہ شوق نیموی کی آثار السنن فقہ حنفی کے مستدلات میں، جس بلند درجہ کی کتاب ہے وہ محتاج وضاحت نہیں، اس کتاب کو زمانۂ تصنیف سے اہل علم میں مقام حاصل ہے۔ یہ اپنے آثار و دلائل کی پختگی اور حسن ترتیب کی وجہ سے علمائے کرام خصوصاً حضرات

محدثین اور ممتاز فقہاء کی آنکھوں کا تارا اور دل کا سرور بنی ہوئی ہے، آثار السنن اگرچہ ایک عرصہ تک کم یاب رہی، مگر حالیہ برسوں میں اس کی عمدہ طباعت اور اس کی شرح و تحقیق وغیرہ پر توجہ ہوئی ہے۔ جس میں ایک مقبول و معروف شرح، مولانا عبدالقیوم صاحب حقانی مدفیوضھم کی تالیف، توضیح السنن ہے۔ اس شرح میں مولانا نے سادہ زبان میں آثار کے مندرجات کی توضیح کی ہے، اور اس کے عالمانہ مباحث کو اس طرح حل کیا ہے کہ مولانا شوق نیموی کے جملہ اشارات وحوالوں کی تحقیق ونشاندہی بھی ہوجاتی ہے اور زیر بحث مسئلہ کا صاف اور واضح نقش پڑھنے کے ذہن ودماغ پر مرتسم ہوجاتا ہے، یہی ان دونوں کتابوں کا ایک بڑا مقصد ہے۔ مولانا حقانی صاحب مولانا نیموی کی طرح، اپنے مقصد اور احناف کے مسائل فقہ کے دلائل کی عالمانہ نشاندہی میں پوری طرح کامیاب ہیں۔

مولانا نے اس گرامی قدر اور مفید ترین تصنیف کی پہلی دونوں جلدیں ارسال فرمائی ہیں، جلد اول ساڑھے چھ سو اور دوسری جلد تقریباً سات سو صفحات پر مشتمل ہے۔

تیسری جلد میں مولانا حقانی نے آثار السنن پر مولانا عبدالرحمٰن مبارک پوری (مصنف تحفۃ الاحوذی) کی ابکار المنن فی تنقید آثار السنن کا جواب بھی شائع کرنے کا خیال ظاہر کیا ہے، [ص:۶۹ جلد اول۔ توضیح السنن] مگر یہ جلد غالباً شائع نہیں ہوئی۔ مولانا حقانی کی اس کتاب کی مقبولیت اور نافعیت کا اس سے بھی اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ یہ اس ضخیم کتاب کا ساتواں ایڈیشن ہے، جو وسط ۱۴۲۸ھ میں چھپا ہے۔

کتابت طباعت مناسب ہے مگر کاغذ نسبۃً ہلکا اور جلد پاکستانی مطبوعات کے معمول کے مطابق خوبصورت ہے۔

(۲) المصنفات فی الحدیث (مولانا محمد زماں کلاچوی) اردو میں حدیث شریف کی بنیادی کتابوں اور متون کے ترجموں شرحوں وغیرہ اور عمدہ بلکہ اعلیٰ درجہ کی تصانیف کی کمی نہیں، لیکن ایسی کتابوں کی تعداد نہ ہونے کے برابر ہے، جس میں حدیث کی مصنفات و کتب کا جامع تذکرہ وتعارف ہو۔ حضرت شاہ عبدالعزیز کی بستان المحدثین کے اردو ترجمہ اور حضرت شاہ صاحب کی ایک اور مختصر مگر نہایت جامع،

دریا بکوزہ کی مثال تالیف ''عجالۂ نافعہ'' کی مفصل شرح فوائد جامعہ، تالیف مولانا عبدالحلیم چشتی کے علاوہ، بہت کم کتابیں ایسی ہیں جو اس موضوع کے طلباء کی عمدہ رہنمائی کرسکیں اور اس سلسلہ کی اچھی تصانیف میں شمار کی جائیں۔ المصنفات فی الحدیث اس ضرورت کو احسن طریقہ پر پورا کرتی ہے۔

یہ کتاب پاکستان کے ممتاز عالم مولانا محمد زماں صاحب کلاچوی جامعہ بنوریہ کراچی کے شعبۂ تخصص فی الحدیث میں اس وقت کے لکھے ہوئے مقالہ کا ترجمہ ہے، جب اس شعبہ کی نگرانی وسرپرستی حضرت مولانا محمد یوسف بنوری صاحب فرماتے تھے، یہ مقالہ حضرت مولانا بنوری کے حدیث شریف میں بلند مقام کا گویا ایک اثر اور ثبوت ہے، اردو میں کتب حدیث کے تعارف پر غالباً اس قدر جامع تالیف یا ترجمہ شائع نہیں ہوا، یہ کتاب طلبائے حدیث کے لئے ایک تحفہ اور کام کرنے کے لئے ایک نمونہ کی حیثیت رکھتی ہے۔

المصنفات فی الحدیث بڑے سائز کے تقریباً پانچ سو صفحات پر مشتمل ہے، یہ غالباً اس کتاب کی پہلی طباعت ہے جو سنہ ۲۰۰۷ء میں اشاعت سے آراستہ ہوئی۔

(۳) تذکرۃ المصنفین المعروف بہ تراجم العلماء | تالیف مولانا مفتی ابوالقاسم عثمانی قاسمی (شاگرد مولانا عبدالرحمٰن امروہوی تلمیذ حضرت مولانا نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ) ہمارے مدارس میں جو نصاب تعلیم درس نظامی کے نام سے مشہور ہے، اس کی کتابوں کے مصنفین کے احوال کی جستجو اور ان کی تصانیف کے تعارف کی ضرورت وضاحت کی محتاج نہیں، مگر اس موضوع پر جس گہرائی اور وسعت نظر سے کام ہونا چاہئے تھا اس کا ہنوز انتظار ہے، تاہم اس موضوع پر جو چند مفید کتابیں چھپی ہیں تذکرۃ المصنفین بھی اسی کی نسبۃً جامع کڑی ہے۔ یہ کتاب بھی القاسم اکیڈمی نے اپنے معیار ونظام کے مطابق شائع کی ہے، جو پانچ سو سے زائد صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کا دوسرا ایڈیشن ذی الحجہ ۱۴۲۶ھ مین چھپا ہے۔

(۴) الحق اکوڑہ خٹک کا شیخ الحدیث مولانا عبدالحق حقانی نمبر | حضرت مولانا عبدالحق حقانی، دارالعلوم دیوبند کے مایۂ ناز فاضل اور برصغیر کے اپنے عہد کے عالی مرتبت علماء میں سے تھے۔ مولانا حقانی کی ایک بہت بڑی یادگار دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک صوبہ سرحد پاکستان ہے، اس دارالعلوم کا علمی ترجمان ماہنامہ الحق، برصغیر کے علمی حلقوں میں متعارف ہے۔ ماہ نامہ الحق نے ادارہ کے محسن ومربی اور جلیل القدر

بانی کی یاد میں یہ خاص نمبر شائع کیا ہے، نمبر کیا ہے [بابائے اردو مولوی عبدالحق کے الفاظ میں] چبوتر کا چبوتر ہے۔

یہ نمبر اگرچہ اشاعت کے لحاظ سے کسی قدر پرانا ہے کیوں کہ رمضان المبارک ۱۴۱۳ھ (مارچ ۱۹۹۳ء) میں چھپا تھا، لیکن مضامین وافادیت کے پہلو سے اب بھی تازہ ہے اور اس کی دیرپا افادیت محسوس کی جاسکتی ہے۔ یہ نمبر بہت بڑی پیمائش (۲۸ سینٹی میٹر لمبائی اور ۱۹ سینٹی میٹر کی چوڑائی) کے بارہ سو صفحات پر مشتمل ہے۔ برصغیر میں کسی اور بڑی دینی علمی شخصیت پر اس طرح کے باثروت علمی اور شاندار نمبر گنتی ہی کے چھپے ہیں۔ راقم کو کئی سال سے اس کی جستجو تھی بالآخر مولانا عبدالقیوم صاحب حقانی کے توسط سے دستیاب ہوا۔

(۵) تذکرہ وسوانح علامہ شبیر احمد عثمانیؒ اساطین علم کا جو ایک نہایت بلند قامت، بلند سیرت، بلند مرتبت کارواں نصف صدی پہلے تک برصغیر ہندوپاک میں ملت کی دینی علمی سیاسی قیادت ورہنمائی فرمارہا تھا، اس میں ایک ممتاز نام، علامہ شبیر احمد عثمانی کا بھی ہے، جن کے فیوض علم سے برصغیر ہند آج تک نفع اٹھارہا ہے۔ افسوس کہ علامہ کے احوال پر کوئی شایان شان کتاب سامنے نہیں آئی، اگرچہ چھوٹی بڑی دوتین کتابیں چھپی ہیں مگر ان کو تعارف نامہ ہی کہا جاسکتا ہے، عمدہ سوانح اور حیات شبیر کا آئینہ قرار دینا شاید درست نہ ہو۔

مولانا عبدالقیوم حقانی صاحب نے برصغیر کے مشاہیر علمائے کرام کی یاد میں خاص شمارے شائع کرنے کا ایک مفید سلسلہ شروع کررکھا ہے، اسی میں یہ ایک شمارہ علامہ شبیر احمد عثمانی کے لئے بھی مختص ہے۔ یہ مجلّہ یا اشاعت خاص علامہ کے متعلق مضامین کا مجموعہ اور تقریباً ساڑھے چار سو صفحات پر مشتمل ہے۔ یہ مجلّہ ذی الحجہ ۱۴۲۶ھ جنوری میں چھپا ہے۔

(۶) تذکرہ وسوانح مولانا محمد احمد صاحب برصغیر ہند میں قرآن مجید کے ترجمہ وتفسیر سے دلچسپی رکھنے والے اصحاب، مولانا محمد احمد صاحب کے افادات تفسیر کے بڑے مجموعہ درس قران سے ناواقف نہیں (جو گیارہ جلدوں اور آٹھ ہزار سے زیادہ صفحات پر مشتمل ہے) لیکن مولانا محمد احمد صاحب کے حالات سے کم لوگ واقف تھے، مولانا حقانی صاحب نے اس تذکرہ میں مولانا کے حالات پیش کئے ہیں۔ یہ تالیف وتذکرہ ایک سو اٹھاسی صفحات پر مشتمل ہے، دوسری اشاعت محرم ۱۴۲۵ھ کی ہے جو پیش نظر ہے۔

(۷) حقانی تبصرے یہ کتاب پاکستان میں گذشتہ چند سال میں شائع ایسی دوسو کتابوں پر تبصروں کا مجموعہ ہے، جو مولانا عبدالقیوم حقانی نے ماہنامہ القاسم میں حالیہ دنوں کئے تھے۔ اس تالیف یا تبصروں کے مجموعہ سے پاکستان کی مطبوعات کے عمومی دینی علمی رجحانات اور تحریر و تالیف کے ذوق اور معیار کا کسی قدر اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

(۸) شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا کاندھلوی کے معمولات رمضان اس موضوع پر راقم سطور نے سب سے پہلے ایک کتاب لکھی تھی، بعد میں اور اصحاب نے بھی اس پر قلم اٹھایا اور شیخ الحدیث صاحب کے بعد کے رمضانوں کے کسی قدر احوال کا اضافہ کیا۔ راقم کی اس تالیف اور ان تحریرات کا مجموعہ، اس سے پہلے بھی پاکستان میں کئی مرتبہ شائع ہو چکا ہے۔ القاسم اکیڈمی نے بھی ذی قعدہ ۱۴۲۷ھ میں اس کا ایک ایڈیشن چھاپا ہے، جو ایک سو اکتیس صفحات پر مشتمل ہے۔

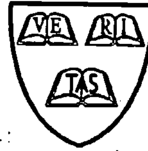
گرامی نامے

جناب شہاب احمد صاحب
ہارورڈ یونیورسٹی
امریکہ

HARVARD UNIVERSITY
COMMITTEE ON THE STUDY OF RELIGION
Barker Center 12 Quincy Street Cambridge, Massachusetts 02138-3879

E-Mail:csrel@fas.harvard.edu
Website: www.fas.harvard.edu/~csrel

Tel:617.495.5781
Fax:617.496.5798



مورخہ یکم ستمبر ۲۰۰۸ء

محترم جناب مولانا نور الحسن راشد مد ظلہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

امید ہے کہ آنجناب بخیر وعافیت ہوں گے۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اپنا مدعا پیش کرنے سے پہلے مختصراً اپنا تعارف کروادوں، مجھے ڈاکٹر شہاب احمد کہتے ہیں۔ میں ہارڈورڈ یونیورسٹی امریکہ میں اسلامک اسٹڈیز کے اسسٹنٹ پروفیسر کے طور پر کام کرتا ہوں۔ آپ کا تعارف مجھے جناب ڈاکٹر پروفیسر عارف نوشاہی (صاحب، اسلام آباد۔ پاکستان) اور سہ ماہی مجلّہ احوال وآثار کے وساطت سے ہوا۔ آپ کو خط لکھنے کا مدعا یہ ہے کہ تصوف میری دلچسپی کا موضوع ہے، آج کل میں شروحات مثنوی رومی پر کچھ کام کررہا ہوں۔ اس سلسلے میں مجھے ہندوستان سے شائع ہونے والی چند شروحات مثنوی درکار ہیں، لیکن کوشش بسیار کے باوجود مجھے ان تک رسائی حاصل نہ ہوسکی۔ سہ ماہی مجلّہ احوال وآثار کے شمارہ اکتوبر تا دسمبر ۲۰۰۷ء کا اداریہ نظر سے گزرا، جس سے اندازہ ہوا کہ آپ کو شروحات مثنوی سے خصوصی دلچسپی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اس سلسلے میں آپ میری مدد کرسکیں گے۔ اور اسلاف کی علمی روایت کو قائم رکھتے ہوئے میرے ساتھ ہر ممکن تعاون فرمائیں گے۔

مجھے درج ذیل شروحات مثنوی درکار ہیں:

۱-فتوحات معنوی شرح مثنوی	نظام الدین سہاموی	بمبئی ۱۲۹۳ھ
۲-حاشیہ مثنوی	حاجی امداد اللہ مہاجر مکی	کانپور ۱۲۷۰ھ
۳-شرح مثنوی	عبد العزیز	مکتبہ شہاب الدین ۱۲۷۰ھ
۴-شرح مثنوی	مولانا محمد الٰہی بخش	نول کشور لکھنؤ ۱۲۹۰ھ
۵-حاشیہ مثنوی	محمد عمر ناصر الملت	مطبع حیدری۔ بمبئی ۱۲۹۳ھ
۶-حاشیہ مثنوی رومی	مفتی ابن قطب الدین	کانپور ۱۲۱۹ھ
۷-شرح مثنوی	میر ولی اللہ ایبٹ آبادی	لاہور ۱۲۳۷ھ
۸-لطائف معنوی فی حقائق مثنوی	عبد اللطیف عباسی	کانپور ۱۲۹۲ھ

ان میں سے پہلی دو شرحات میرے لئے دیگر شروحات کی بہ نسبت زیادہ اہمیت کے حامل ہیں۔ میری آپ سے التماس ہے کہ اگر آپ کے پاس مذکورہ بالا تمام شروحات یا ان میں سے بعض دستیاب ہوں اور ان کا عکس لینا بھی ممکن ہو تو آپ مجھے اس کے طریق کار سے مطلع فرمائیں۔ اس سلسلے میں اٹھنے والے تمام اخراجات کی ادائیگی میرے ذمہ ہوگی۔ امید ہے کہ آپ پہلی فرصت میں اس خط کا جواب ارسال کرنے کی کوشش فرمائیں گے۔ میں تہہ دل سے آپ کا ممنون ہوں گا۔

والسلام

دعا گو و دعا جو

شہاب احمد

اسسٹنٹ پروفیسر اسلامک اسٹڈیز

ہارورڈ یونیورسٹی۔ امریکہ

وقت است کہ بکشایم میخانۂ رومی باز　　پیران حرم دیدم در صحنِ گلستاں مست

پیر رومی مرشد روشن ضمیر　　کاروان عشق و مستی را امیر

مولانائے رومؒ اور ان کی مثنوی معنوی

ہندوستان میں اس کا فیضان و پیغام، شرح و تحقیق اور تعلیم واشاعت

نیز

تکملہ یا اختتام مثنوی، از حضرت مفتی الٰہی بخش کاندھلویؒ

چند پہلو اور معلومات

حضرت مولانا جلال الدین (محمد بن محمد) قونوی رومی اور ان کی مثنوی معنوی، اس کا پیغام، اس کی افادیت و معنویت، اس کی بے پناہ تاثیر اور عالم اسلام کے سفر معرفت میں اس کا حصہ، کسی تعارف کا محتاج نہیں۔

برصغیر ہند کے مختلف روحانی حلقوں نقشبندیہ چشتیہ کے عالی مرتبت مشائخ کا اس سے گہرا شغف، اس کے درس کا اہتمام، اس کے نکات اور اس کے مباحث کی وضاحت و توجیہ کی کوششیں، خصوصاً آخری دور میں حضرت شاہ ولی اللہؒ اور ان کے صاحبزادگان گرامیؒ کی مثنوی سے وابستگی حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ کی محفل میں اس کے درس و تعلیم کا غیر معمولی اہتمام، حضرت حاجی صاحب کا مفتی الٰہی بخش سے سلسلہ اجازت، حضرت حاجی صاحب کے مثنوی پر فاضلانہ حاشیے اور مثنوی مولانا روم کو اس کے شایان شان چھپوانے کی تمنا، اور حاجی صاحب کی ہدایات کی روشنی میں مثنوی کی مولانا احمد حسن پنجابی کانپوری، کے اہتمام سے کان پور سے بے نظیر اشاعت، اور ان سب کے علاوہ دلدادگان مثنوی اور اور اہل قلب و معرفت کے لئے ہندوستان کا خاص تحفہ

تکملہ یا اختتام مثنوی　تالیف: عارف کامل، حضرت مفتی الٰہی بخش کاندھلویؒ

اس تکملہ کی اہل علم وعرفان کی محفلوں میں پذیرائی، اس کے قلمی مطبوعہ نسخے، ترجمے، حاشیے اور متعلقات پر مقالات و مضامین اور ضروری اطلاعات۔ یعنی مثنوی مولانا روم اور اس کے تکملہ کے لئے علمی معنوی تاریخی ادبی گوشوں اور متعلقات پر اہل علم و نظر اور ارباب فکر و تحقیق کے تاثرات و تحقیقات کا خلاصہ تصانیف و مقالات کا مجموعہ۔

یہ خاص اشاعت تقریباً چار سو صفحات پر مشتمل ہوگی تفصیلات کا انتظار فرمائیے۔

ان خوفناک لمحوں کی روداد، جب تاریخ ایک کروٹ لے رہی تھی

معرکۂ شاملی و تھانہ بھون، سنہ ۱۸۵۷ء

تالیف

نورالحسن راشد کاندھلوی

سنہ ۱۸۵۷ء میں تھانہ بھون اور شاملی میں کیا ہوا تھا، اس کی حقیقت کیا ہے اس کا دائرہ کس قدر وسیع تھا، اس میں کون کون اصحاب شریک تھے، کون ذمہ دار اور سربراہ تھا، کب اور کہاں معرکہ آرائی ہوئی، کس جگہ کون کامیاب ہوا، کس نے کہاں پسپائی اختیار کی، اور بعد میں اس کی کیا قیمت ادا کرنی پڑی۔ بعض تذکرہ نگاروں نے حالات کے جبر سے، بعض ناواقفیت سے اور کچھ نے فرط جذبات میں واقعات کو کچھ سے کچھ بنادیا، جس کی وجہ سے تاریخ کے اس عنوان کے متعلق طرح طرح کے اعتراضات وسوالات پیدا ہوگئے۔ اس تالیف میں اس کی امکانی حد تک معتبر مستند روداد، خصوصاً اہل علاقہ اور اہل معاملہ کی تحریرات، انگریزوں کے اندراجات واعترافات پیش کیے جارہے ہیں۔

حضرت حافظ محمد ضامن شہید اور حضرت حاجی امداداللہ [امداد حسین] کی شہادت وشرکت کی، انگریز افسران اور سرکاری دستاویزات کے حوالہ سے تصدیق، اور ان تشنگان راہ خدا کا تذکرہ:

جو کوئے یار سے نکلے تو سوئے دار چلے

نیز پچاسوں اشخاص کے نام ولدیت کی صراحت کے ساتھ، جنہوں نے اس معرکہ میں حصہ لیا اور اس کی پاداش میں سزائے موت پائی، مفرور اور لائق گردن زدنی، یا سخت سزاؤں کے مستحق قرار دیے گئے۔

امید ہے کہ انشاء اللہ تعالیٰ اس میں اس سلسلہ کی وہ تمام معلومات وتفصیلات ہوں گی جن کی اس موضوع کے شائقین کو ہمیشہ تلاش رہی اور جن کے بغیر اس عنوان کو مکمل اور لائق اعتماد نہیں کہا جاسکتا۔

ایک مستند تاریخ، ایک معتبر دستاویز ایک لائق مطالعہ تحریر

ڈیمائی سائز کے تین سو سے زائد صفحات۔ اللہ نے چاہا تو جلد ہی اشاعت متوقع ہے۔

ناشر

[حضرت] مفتی الٰہی بخش اکیڈمی کاندھلہ، ضلع مظفرنگر، یوپی ہند

لائق مطالعہ چند نئی مطبوعات

العرف الوردی فی اخبار المہدی — تالیف: امام جلال الدین سیوطیؒ

حضرت مہدی کے ظاہر ہونے اور متعلقہ پیشین گوئیوں پر مبنی احادیث شریفہ کا ایک بڑا مجموعہ اور انتخاب عربی کے خوبصورت قلمی نسخہ کا اعلیٰ درجہ کا فوٹو عمدہ کاغذ و طباعت، دیدہ زیب خوش رنگ ٹائٹل، قیمت صرف ۴۵ روپے

سیرت خیر البشر صلی اللہ علیہ وسلم — تالیف: علامہ محبّ الدین طبری مکیؒ

ترجمہ از مفتی اعظم، مولانا مفتی محمود حسن گنگوہیؒ — تکمیل ترجمہ مولانا اظہار الحسن صاحب کاندھلویؒ

ساتویں صدی کے ممتاز مصنف محدث، اور مؤرخ علامہ محب الدین طبری مکی کی سیرت پاک پر مشہور تالیف "خلاصۃ فی سیرت خیر البشر علیہ السلام" کا اردو ترجمہ جس میں سیرت پاک کے متعلق ایسی متعدد معلومات میں جو اکثر کتابوں میں بھی آسانی سے نہیں ملتی۔ یہ کتاب بڑے بچوں عورتوں اور کم پڑھے لکھوں سب کے لئے مفید ہے۔ عمدہ طباعت، اٹھانوے صفحات۔ قیمت صرف چالیس روپئے

فضیلت قرآن ترجمہ فضل القرآن فارسی

تالیف: حضرت مفتی الٰہی بخش کاندھلویؒ — ترجمہ وحواشی: نورالحسن راشد کاندھلوی

قرآن پاک کے فضائل اور مختلف سورتوں کے متعلق احادیث شریفہ اور تلاوت قرآن شریف کے ضروری آداب اپنے موضوع کی بہت جامع اور مختصر تالیف ہے۔ جو ہر ایک کے مطالعہ کے لائق اور نہایت مفید و مؤثر ہے۔

قیمت صرف پچیس روپئے

رسائل اصول حدیث (عربی فارسی مع اردو ترجمہ)

تالیف: حضرت مفتی الٰہی بخش کاندھلویؒ — ترجمہ: نورالحسن راشد کاندھلوی

اصول حدیث کا جامع منتخب اور واضح تذکرہ، جو ایک عرصہ تک متعدد دینی مدرسوں کے نصاب میں شامل رہا۔ حضرت مولانا تھانویؒ اور مولانا خیر محمد جالندھریؒ نے بھی شائع کرایا تھا۔ خوبصورت ٹائٹل۔ عمدہ طباعت۔

قیمت صرف پچیس روپئے

مختصر تذکرہ حضرت مفتی الٰہی بخش نشاط کاندھلوی — تالیف نورالحسن راشد کاندھلوی

حضرت مفتی الٰہی بخش حضرت شاہ عبدالعزیز کے سب سے پہلے اور منتخب ترین شاگردوں اور اپنے عہد کے ممتاز علماء اور اہل درس و افادہ بزرگوں میں سے ہیں اور کاندھلہ کے مشہور و ممتاز علماء کے جد امجد ہیں۔ کاندھلہ کے علماء کے خاندانی پس منظر اور حضرت مفتی صاحب کی خدمات و تصانیف سے واقفیت کے لئے اس کتاب کا مطالعہ لازمی ہے۔ صفحات قیمت صرف چالیس روپئے